ایک علمی، دینی اور ادبی ماہنامہ
ذکر و فکر
(دہلی)
مرتبہ
خواجہ احمد فاروقی

ناشر

سید طٰہٰ عبداللہ

قیمت: ۵۰ روپیہ سالانہ —— فی پرچہ ۵/ روپے

غیر ممالک سے: ۲۰ ڈالر یا اس کے بالمقابل ہندوستانی روپیہ (ہوائی ڈاک سے)

۱۰ ڈالر یا اس کے بالمقابل سکہ " " (بحری ڈاک سے)

خط وکتابت کا پتہ

ZIKR-O-FIKR Monthly

G-1/27B OKHLA, JAMIA NAGAR,
NEW DELHI-110025

نوٹ: رقم، ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں اگر چیک سے رقم بھیجنا چاہیں تو مزید آٹھ روپے مصارف بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں یا بینک ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک مندرجہ بالا پتہ پر بھیجیں۔

ماھنامہ

ذکر و فکر

دھلی

جلد نمبر: (۶) ـــــ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۹ھ

شمارہ نمبر: (۱) ـــــ ماہ مئی سنہ ۱۹۸۹ء

ترتیب

افتتاحیہ	۱۔ مذاکرات	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲
مقالات	۲۔ ایک مختصر لیکن یادگار سفر	" " "	۷
جائزے	۳۔ قادیان سے واپسی	ترجمہ: سید غلام محی الدین	۱۸
تحقیقات	۴۔ غزالی اور مزار غزالی	پروفیسر حبیب الحق ندوی	۲۴
	۵۔ نواب صدر یار جنگ کا سفرنامۂ حج	تلخیص: شمس تبریز خاں	۳۰
اور	۶۔ تسخیر فطرت	ریاض الدین احمد	۴۹
ادبیات	۷۔ عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں	ترتیب: مولانا شفیق الرحمن ندوی	۵۲

مولانا عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

بمبئی کے ایک بدنام ناول نگار کو برطانیہ کی حمایت اور سرپرستی نے خاصی اہمیت دے دی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے کہ کسی کور دیدہ و کور باطن نے کذب و افترا کا طوفان کھڑا کیا ہو، تاریخ کے ہر دور میں ایسے فتنہ پرور پیدا ہوتے رہے ہیں، یہاں تک کہ عہدِ رسالتؐ اور عین نزول قرآن کے زمانہ میں ایسے معاند تھے جو قرآن کریم کو عہدِ ماضی کے افسانے "اساطیر الاولین" کہتے تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدسؐ پر نار وا حملے کرنے، کوئی ساحر کہتا، اور کوئی جنون و افترا، کی تہمت لگاتا تھا۔ عہدِ رسالتؐ کے بعد بھی ایسے منافق ہوتے رہے ہیں جن کے نام بظاہر مسلمانوں جیسے تھے اور انھوں نے بدترین دشمنوں کے کردار پیش کیے، ایسے لوگ برساتی کیڑوں کی طرح جنم لیتے رہے اور فنا ہوتے رہے، کوئی ان کے نام بھی نہیں جانتا، اور کوئی بہت مشہور بھی ہوا تو اسی حوالے سے کہ اس نے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اصغر گونڈویؒ کا یہ شعر بہت معنی خیز اور حقیقت حال کے مطابق ہے،

فروغِ حُسن سے تیرے چمک اٹھی ہر شے
ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بولہبی

بمبئی کا یہ ناول نگار کوئی مشہور صاحبِ قلم نہیں ہے، اور نہ اس کا کوئی مطالعہ ہے، ایک عامیانہ اور بازاری انداز کا ناول نویس ہے، چوں کہ اس کا نام سلمان رُشدی، مسلمانوں جیسا ہے اس لیے مسلمانوں کو اس کی بدزبانی زیادہ بُری لگی، یہودیوں کو ایسے عالم آزما لوگوں کی تلاش ہی رہتی ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کے آہنی قلعہ پر خشت باری کریں، قسمت سے ان کو رُشدی مل گیا، انھوں نے اس کو انعام و اکرام سے نوازا، تاکہ پبلک میں اس کی وقعت بڑھے اور لوگ اس کے ناول پڑھیں۔ کمیونسٹوں ہی کی نہیں بلکہ یہودیوں کی عام سیاست

ہے کہ اگر ان کے گروپ میں کوئی شامل ہوجائے تو اس کو وہ انٹلکچویل (Intellectual) بتاتے ہیں خواہ وہ متوسط معیار سے بھی کم درجہ کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو یہ لوگ اس کو کوئی بڑا انعام دیتے ہیں، یا کسی شہرت کے مرکز پر بٹھا دیتے ہیں کہ لوگ اس کی بات توجہ سے سنیں۔ بلکہ یوں کہیے تاکہ عوام ان انعام دہندہ لوگوں کے دل کی بات اس شخص کی زبانی سُنیں۔

شیخ الازہر علامہ جاد الحق نے اس حقیقت کو محسوس کیا تھا اور مزید یہ کہ مسلمانوں نے مظاہرات کر کے اس کی اہمیت بڑھا دی، ورنہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ چند ہزار کی تعداد میں چھپتی۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کر کے اس کو وقت کا اہم مسئلہ بنا دیا، کوئی صاحب قلم اُٹھ کر اس کی علمی و تاریخی حیثیت واضح کر دیتا، اور کوئی صاحب ضمیر و غیرت مند شخص مصنف کو جہنم واصل کر چکا ہوتا، مگر ایک طرف مسلمانوں نے اپنی برہمی کا اظہار کیا، دوسری طرف خمینی صاحب نے اپنا فرمان جاری کر کے دشمنوں کے کان کھڑے کر دیے۔

ایران کے امام حاضر شیخ آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب کی عالم اسلامی میں سیاسی ساکھ ختم ہو چکی تھی، شروع میں جب انھوں نے شاہ ایران کو معزول کیا اور امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنا کر رکھا تو عام طور پر نوجوانوں کے وہ ہیرو بن گئے تھے، ان کے برپا کیے ہوئے انقلاب کو اسلامی انقلاب سمجھا جانے لگا تھا، مگر عراق سے جنگ کو طول دے کر انھوں نے اپنے ہمدردوں اور خیرخواہوں کو بھی مایوس کر دیا تھا، حرمین شریفین کو سیاسی تنازعہ کا مرکز بنانے کی کوشش سے ان کا پلّہ بہت ہلکا ہو گیا تھا، اور بہت سے ان کے طرف دار بھی ان کی تائید سے منھ چھپانے لگے تھے، عراق و ایران جنگ بندی پر مائل کرنے کے لیے دنیا نے ان کی خوشامدیں کیں، مسلم سربراہوں کے متعدد وفود جا کر ان سے ملے، مسلم وزراء خارجہ کانفرنس نے اپنی تجویزوں کے ذریعہ ان سے التماس کی مگر ان کی طرف سے ہمیشہ تحقیر و انکار کا رد یہ رہا، مگر خود مجبور ہو کر جب انھوں نے جنگ بندی قبول فرمالی تو بجائے اس کے کہ مسلم عوام میں ان کی عزت بڑھتی اور گر گئی، چنانچہ مسلم سیاست میں ان کی حیثیت ایک کنارہ کش۔ یا چھوٹے موٹے کارتوس

کی رہ گئی تھی۔ قسمت سے اس رشدی کا قضیہ سامنے آگیا اور انھوں نے اس کو جہنم رسید کرنے کا حکم دے کر اپنی سیاست کی بازی میں جان پیدا کرلی ہے، اور وہ ایک بار پھر عالم اسلام کی سیاست میں ہیرو بن کر سامنے آگئے ہیں!

اس معاملہ میں سب سے زیادہ کھل کر جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ برطانیہ آج بھی وہی برطانیہ ہے جس کا تجربہ مسلمانانِ عالم کو گزشتہ صدیوں میں رہا ہے، اس کی اصل دشمنی اسلام سے ہے۔

برطانیہ کے رواج و روایت پر مبنی قوانین کے لحاظ سے جو ایشیائی ترک وطن کرکے وہاں آباد ہوتے ہیں ان کی حیثیت تیسرے درجے کے شہری کی ہوتی ہے، دوسرے درجہ کے شہری ان تارکینِ وطن کی اولاد ہے جو برطانیہ کی سرزمین میں پیدا ہوتی ہے، یا تاجِ برطانیہ کے ماتحت کسی نوآبادی میں برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے رہ چکے ہوں۔

برطانیہ کا برتاؤ دوسرے اور تیسرے درجوں کے شہریوں کے ساتھ ایسا ہے جو آقاؤں کا خدام اور زیادہ سے زیادہ مددگار عملہ (Helping hands) کے ساتھ ہوتا ہے، ان کو روزگار اور علاج کی سہولت دینا بھی کوئی خاص بات نہیں ہے، آدمی اپنے پالتو اور سواری کے جانوروں کو بھی غذا و دوا مہیا کرتا ہے، مشینوں کو بھی تیل دیا جاتا ہے، اس کی صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے، اس لیے اگر کچھ سہولتیں ان تارکینِ وطن کو حاصل ہیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ ان کی عزت کرتے ہیں یا ان کو پسند کرتے ہیں، بلکہ اس لیے یہ سہولتیں دی جاتی ہیں کہ وہ زیادہ خدمت کرنے کے اہل ثابت ہوں۔

کینیا کے باشندے تو دوسرے درجہ کے شہری تھے مگر ان کے ساتھ بے مروتی بلکہ جس طوطا چشمی کا مظاہرہ انھوں کیا اس سے ثابت ہوگیا کہ ان کے یہاں اصول و نظریہ وغیرہ کی بات اسی وقت تک قابلِ تسلیم ہے جب تک ان کے مقاصد کی راہ میں حائل نہ ہو، ورنہ کہاں کا اصول اور کیسی منطق؟! سلمان رشدی کے معاملہ میں ان کے سارے اصول زندہ ہوگئے، بہت ہی اصول پرست، بین الاقوامی قوانین اور حقوق کے محافظ بھی بن گئے۔

سچ پوچھیے تو قانون، اصول اور منطق کی بات صرف فیشن کی بات ہے، حکمراں اور طاقت ور ملک کی سب سے بڑی منطق اس کی قوت ہوتی ہے۔ جب کینیا سے برطانوی پاسپورٹ رکھنے والے اپنے "مادر وطن" میں واپس آنا چاہتے تھے، ان کو کس قاعدہ یا کس بین الاقوامی اصول کے ماتحت روکا گیا تھا؟ کیا اس طرح وہ یوروپ کے باشندوں کو روک سکتے تھے؟ بات صرف یہ تھی کہ وہ دوسرے درجہ کے شہری تھے۔

اس قضیہ نامرضیہ کے سلسلہ میں یہ کہا جا رہا ہے کہ خمینی صاحب نے کیوں دوسرے ملک کے شہری کے خلاف اپنا فرمان جاری کیا، آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحریر پر ہر ایک کا حق ہے۔ ان سے بتایا گیا کہ آزادیٔ تحریر کا حق تسلیم، مگر یہ حق تسلیم نہیں کہ ایک شوریدہ سر اٹھ کر کروڑہا کروڑ انسانوں کے احساسات کو مجروح کرے۔

برطانیہ کے نزدیک سلمان رشدی کی ذاتی حیثیت ایک مُردہ کیڑے سے زیادہ نہیں ہے، اگر نہ صرف وہ بلکہ اس کا پورا کنبہ بھی ہلاک ہو جائے تو ان کو پرواہ نہ ہوگی۔ آئے دن اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کسی گورے (اصلی برطانوی باشندہ۔ درجہ اول کا شہری) نے ایک ایشیائی کو اس کے گھر جا کر گولی مار دی، یا ٹرین سے زبردستی نکال دیا، مگر قانون اس کے خلاف کارروائی کرنے سے عاجز رہتا ہے، اگر برطانیہ کی اسلام دشمنی اور صلیبی جنگوں کے فاتحین کی قوم سے انتقام لینے کا جذبہ نہ ہوتا تو آسان راستہ تھا کہ اس نابکار کو ایران کے حوالہ کر دیا جاتا، یا اس ملک کو واپس کر دیا جاتا جہاں سے وہ آیا تھا، جہاں کی لعنت ہے وہیں جا کر اپنا انجام دیکھے، اس کو اس درجہ سر چڑھانے اور پبلسٹی دینے کا کیا جواز تھا؟ یہی نہیں بلکہ ایران سے اظہار رنج کے طور پر اپنے سفیر بلا لیے اور اپنے ساتھ یوروپین برادری کے دس ملکوں کو ابھارا کہ وہ بھی اپنے سفیر بلا لیں۔ کناڈا اور سویڈن نے بھی اس میں برطانیہ کا ساتھ دیا۔ امریکہ کے صدر بوش صاحب نے بھی دھمکی دی، ان کے پاس سفیر بلا نے یا تجارتی تعلقات ختم کرنے کا مہرہ نہیں تھا کیونکہ امریکہ ایران کے سفارتی تعلقات ابھی تک قائم ہی نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے صرف کڑک گرج پر اکتفا کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صدیوں سے اصلی امریکی باشندوں (کالوں) پر اُس ظلم کا تماشہ دیکھ رہے ہیں جو اگر انسان اس طرح کا ظلم جانوروں پر بھی کرے تو اس کو شرم آئے، مگر ایران کا یہ اقدام بوش صاحب کے

الفاظ میں: "متمدن دنیا کے تسلیم شدہ معیار پر حملہ ہے" لیکن امریکہ کا رویہ نیگروز کے معاملہ میں تہذیب کے معیار پر قائم ہے ؟!!

پاکستان کے مرحوم صدر ایوب خاں صاحب نے بات پتے کی کہی تھی کہ سیاست میں نہ کوئی کسی کا دوست ہے اور نہ دشمن۔ دوستی، دشمنی کے معیار مصلحت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ سلمان رشدی کے معاملہ میں توقع تھی کہ اس کی بڑی حمایت روس کی طرف سے ہوگی، مذہب کے خلاف متوازی تنظیم کمیونسٹ ہی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں اگر کوئی خاموش ہے تو وہ صرف روس ہے، حالانکہ ابھی ابھی افغانستان سے اس کے فوجی خون میں نہا کر واپس آئے ہیں۔ ہزارہا ہزار فوجی ہلاک ہوئے، لاکھوں لاکھ کے اسلحے ضائع ہوئے، اور یہ سب افغانستان کی سخت مذہب پرستی کی بنا پر ہوا۔ ایسے مذہب کے خلاف کوئی سنگ باری کرے تو توقع یہی تھی کہ سب سے پہلے روس بڑھ کر اس کے ہاتھ مضبوط کرے گا۔ لیکن اس چرخ نیلی فام نے یہ تماشہ بھی دیکھ لیا کہ صرف یہی ملک ہے جو خاموش رہا، اور برطانیہ اس سے درخواست کر رہا ہے کہ "بڑے میاں (خمینی صاحب) کو سمجھاؤ کہ اتنے سنجیدہ نہ ہوجائیں کہ بالکل سے سفارتی تعلقات ہی منقطع کرلیں اور تجارتی تعلقات بھی ختم کردیں۔

عراق سے جنگ کے بعد ایران کو نئے سرے سے اپنے ملک کی تعمیر کرنا ہے، اس کے لیے سب سے بڑے سوداگر یہی ہو سکتے تھے، لیکن قیاس یہی ہے کہ روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا ہے۔ چین، جاپان بجاطور پر مغربی یوروپ کی مارکیٹ سے بے نیاز کردیں گے، برطانیہ کو اسلام دشمنی کی سخت قیمت ادا کرنا پڑے گی اور اس کے ساتھ یوروپین (مغربی بلاک) بھی اپنی ہمنوائی کی سزا پائیں گے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی

ایک مختصر ـــــ لیکن یادگار سفر

عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر، پروفیسر سید ابراہیم ندوی، بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے صحیح النسب ندوی ہیں، ان کے والد ماجد مولانا سید ہاشم ندوی کا تعلق دائرۃ المعارف حیدر آباد سے تھا، بسلسلۂ ملازمت طویل عرصہ تک وہاں رہے اور بالآخر وہیں کے ہو کر رہ گئے، لیکن ندوہ سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا، اور اب پروفیسر ابراہیم کے صاحبزادے مولوی راشد نسیم ندوہ میں اپنی تعلیم کے آخری مرحلہ میں ہیں۔ دینداری اور اخلاق و شرافت ان سب کو خاندانی ورثہ میں ملی ہے اور ندوہ میں تعلیم کا اثر بھی ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیزوں میں ہیں، "وغرس طاب غارسه فطابا" کا ان میں ہر ایک مصداق ہے۔

سفرِ حیدر آباد کے محرک یہی سید ابراہیم صاحب تھے۔ دعوت یونی ورسٹی کی طرف سے توسیعی خطبات کے لیے تھی، نیز رابطہ عالم اسلامی کی ایک رضا کارانہ خدمت بھی اپنے ذمہ لے رکھی ہے کہ اگر وقت ملے اور کسی شہر سے گزر ہو تو وہاں کے دینی اداروں کے چشم دید حالات قلم بند کر لیے جائیں، کیونکہ وفود کے دورے جب ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی تقریب کے ماتحت ہوتے ہیں اور اس وقت کا ماحول مصنوعی ہوتا ہے، لہذا نیت میں یہ کام بھی داخل تھا اگرچہ اس کے مواقع کم میسّر آئے، یونی ورسٹی میں دو محاضروں کے بجائے تین محاضرے ہوئے، "عربی میں جدیدیت کا مفہوم اور اس کا ارتقاء"، "مغرب کی ادبی تحریکات کا عربی پر اثر" اور "زبان کا صحیح طریق تدریس" یہ عنوانات تھے، مجمع پڑھے لکھے اور اساتذہ کا زیادہ تھا، ان کی دلچسپی نے محاضر کی بھی ہمت افزائی کی۔ سفر سے پہلے وہاں جن واقف کار اصحاب کو اطلاع تھی ان کے خطوط اور تار آنے لگے تھے کہ اس موقع پر ہمارے ادارے میں بھی ایک پروگرام رکھیں، لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے نیز اپنی خود خواہش کے باوجود صرف چند ہی اداروں کی زیارت کا موقع ملا۔

پہلے روز یونیورسٹی میں محاضرہ ہوا، خوش قسمتی سے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا بھی اسی زمانہ میں حیدرآباد کا سفر تھا، وہ میرے رہنمائے سفر بن گئے، سید ابراہیم ندوی (بجائے پروفیسر، ڈاکٹر صدر شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی کے یہ مختصر نام جو زبان پر ہمیشہ سے چڑھا ہوا ہے زیادہ یگانگت اور آپس کے خلوص کا آئینہ دار ہے) نے مقالہ نگار کا خاندانی، علمی تعارف اخلاص کے اسلوب میں کرایا۔ صدر جلسہ جناب خواجہ اردو تھے انھوں نے مولوی ابراہیم ندوی کے متن پر جو حاشیہ چڑھایا تو غریب محاضر نے محسوس کیا کہ اسوقت سارے کیمروں کا فوکس اسی پر پڑ رہا ہے دل ہی دل میں "یا ساتر، یا ستار[1]" کا ورد کرنے لگا، محاضرہ جوں توں ختم ہوا، شام کو اسلامک سروس کی طرف سے استقبالیہ تھا جو مغرب بعد شروع ہوا، موضوع تھا عالم اسلام کے مسائل، یا اسلام اور عصر حاضر، جناب وحیدالدین سلیم صاحب اس کے داعی تھے، انھوں نے اپنی وسعت اور گنجائش سے کہیں زیادہ کام کیے ہیں اور مستقبل کے منصوبوں میں ایک لسانیاتی مرکز کا قیام بھی ہے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے بہت برمحل اور مناسب مشورہ دیا کہ یورپین زبانوں کے بجائے ایشیائی زبانوں میں کام کی ضرورت ہے، ہم انڈونیشی، ملیزی اور ترکی زبانوں کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں جب کہ اسلامیات کا بڑا لٹریچر ان زبانوں میں ہے، انگریزی اور فرنچ کے تو بہت سے مرکز قائم ہیں، مسلمانوں کی زبانوں کے سکھانے کا کوئی مرکز نہیں ہے، راقم الحروف نے اس کی تائید کی، اور ان زبانوں کے سیکھنے کی ضرورت اور ان کے ذریعہ دعوت و اصلاح کے کام کی وسعت پر روشنی ڈالی۔ وحیدالدین سلیم صاحب نے بھی اس کو تسلیم کیا، جلسہ میں مختلف سوالات کیے گئے، جن کا تعلق عالم اسلام کے مشاکل سے تھا۔ اس مجلس میں پروفیسر معین الدین صاحب سے ملاقات اور تعارف کی مسرت حاصل ہوئی، پورے حیدرآباد میں ایک ہی وضعدار بزرگ نظر آئے جن کے سر پر قدیم سرخ ترکی ٹوپی اونچی دیوار کی تھی اور بات بات پر ان کا روایتی انداز کا سلام اور کف دست کو پیشانی کی طرف

---

[1] عرب میں یہ محاورہ ہے کہ جس طرح کسی موت کی خبر سن کر انا للہ پڑھتے ہیں، بیماری کا ذکر سن کر لاحول ولا قوۃ کہتے ہیں اسی طرح اگر ان کی تعریف کی جائے تو یا ستار یا ساتر اور کبھی استغفر اللہ کہتے ہیں، مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے پردہ پوش مالک! میرے عیوب و نقائص کی پردہ پوشی فرما، لوگ میرے متعلق کیا سمجھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں، حقیقت صرف تجھ کو معلوم ہے۔

اٹھانا اور اس کا ارتعاش ماضی کا ایک عکس جمیل پیش کر رہا تھا، اگلی شرافت کے یہ نمونے ختم ہو چکے ہیں جو باقی ہیں غنیمت ہیں۔

دوسرے روز کا محاضرہ یونی ورسٹی کے آرٹس کالج میں تھا اور فرمائش یہ تھی کہ محاضرہ عربی میں ہو، میزبان کی خواہش کی تعمیل کی گئی، البتہ ایسے مجموں میں جہاں سننے والے اور بولنے والے دونوں کی زبان اردو ہو وہاں کسی اور زبان میں گفتگو سے ہچکچاہٹ ہوتی ہے، اس لیے پہلے تو کچھ تأمل ہوا مگر ہمارے میزبان یہ طے کر چکے تھے، سید ابراہیم ندوی نے افتتاحی تقریر عربی میں کی، ان کو ندوہ سے فارغ ہوئے عرصہ ہو گیا مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طلاقت کے ساتھ صحیح اور فصیح عربی میں انھوں نے محاضر اور محاضرہ کے عنوان کا تعارف کرایا، میرا مقالہ اردو میں لکھا ہوا تھا اس لیے اس کو پڑھنے کے بجائے اس کے مفہوم پر ایک گھنٹہ سے زیادہ گفتگو کرتا رہا، طالبات اور طلبہ کافی جمع تھے، اساتذہ بھی تھے، اس جلسہ میں چند سوالات بھی ہوئے، سوال کرنے والوں کی عربی میں ترجمانی مولوی راشد نسیم ندوی سلمہٗ کر رہے تھے۔

یہاں سے نکل کر شہر کے متعدد پروگرام تھے، حیدرآباد کے خاص خاص مقامات میوزیم اور گولکنڈہ دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا، اگرچہ ہمارے خواجہ صاحب محترم کی ہدایت تھی کہ ان مقامات کو ضرور دیکھو مگر پروگرام ایسا کسا ہوا اور سارا وقت ایسا بندھا تھا کہ کہیں آتے جاتے کسی عمارت کو دور سے دیکھ لیا اسی کو کافی سمجھا، پھر بھی سالار جنگ میوزیم کے لیے آج شام کو ایک گھنٹہ نکال ہی لیا گیا، نواب سالار جنگ کا یہ میوزیم ایک عظمت رفتہ کی خاموش داستان ہے، "کم ترکوا من جنات وعیون" کی تفسیر، دنیا کی بے ثباتی کی تصویر، کچھ ایسے آثار بھی نظر آئے کہ پلک میں نمی آ گئی اور دماغ میں یہ رباعی گونجنے لگی:

مطرب فانی و بزم ساقی فانی
با ہر کہ شدیم۔ آہ۔ ملاقی فانی
بردار دل از کثرت اسباب جہاں
اللہ بود باقی و باقی فانی

میوزیم سے نکل کر عصر کی نماز اور مولانا ہاشم القاسمی کے ادارہ میں استقبالیہ تھا، وہاں وقت

پر پہنچے، بہت اچھا اور ستھرا مجمع تھا، کوئی تقریر کا پروگرام نہ تھا، عصرانہ پُرتکلف تھا، چند احباب نے مختلف مسائل پر مسافر کی رائے معلوم کی، سوالات برمحل اور عالم اسلام کے موجودہ مسائل و مشکلات سے تعلق رکھتے تھے، یہاں سے ایک ماہنامہ "الفیصل" نکلتا ہے جس کے شمارے 'ذکر و فکر' کے دفتر میں دیکھ چکا تھا، خلوص اور ذوق کے ساتھ کس طرح کام کیا جائے یہ ادارہ اس کا اچھا نمونہ ہے یہاں سے مغرب سے پہلے ہی نکلنے کا پروگرام تھا مگر دیر ہو گئی۔

بعد مغرب ارم کورٹ کے اجتماع میں شرکت کی، جہاں راقم کی تقریر کا اعلان کیا گیا تھا، یہ ایک بہت منظم مرکز ہے جس میں ندوہ ایجنسی، ندوہ دار المطالعہ قائم ہے، ہفتہ وار مجلس تفسیر ہوتی ہے، مہینہ میں دو بار فقہی مسائل پر سوالات اور اس کے جوابات فراہم کرنے کا نظام بڑے ضابطہ اور اصول کی رعایتوں کے ساتھ قائم ہے، اس کے روح رواں، بلکہ روح و جسم، فکر و عمل سب کچھ سید جمیل الدین صاحب ہیں، ان کا نام تو پہلے سُن چکا تھا مگر ان کے کام اور کارنامہ کا حجم اور حدود اربعہ ایسا ہے کہ میرے ذہن میں ان کا تصور ایک تجربہ کار، جہاں دیدہ اور پیر دانا کا قائم تھا مگر دیکھا تو وہ عمر کے لحاظ سے جوان اور سرگرمی عمل کے لحاظ سے نوجوان نظر آئے، میرا تصور ناقص تھا، میں نے ان کو پیر دانا سمجھا تھا مگر وہ صرف دانا نکلے، مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے وابستگی ہم دونوں کے درمیان مشترک ہے مگر اس میں بھی ان کا پایہ بلند ہے:

نہ بھولو فرق جو ہے کرنے والے کہنے والے میں[1]

سید جمیل الدین صاحب کے مرکز دعوت و اصلاح و مطالعہ میں راقم نے عشائیہ سے پہلے کچھ عرض کیا، عنوان دیا گیا تھا، "قرآن کریم کا اسلوب دعوت"، مجمع اچھا تھا، اور حاضرین میں دینی باتوں کے سننے کا ذوق بھی نظر آیا۔

تیسرا روز جمعہ کا دن تھا، ابتدا دار العلوم سبل السلام کی زیارت سے ہوئی، شہر سے

---

[1] سرسید کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

میری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کرنے والے کہنے والے میں

خاصے فاصلہ پر ایک وسیع احاطہ میں دارالعلوم کی عمارتیں بنی ہیں، سردست پانچ سو طالب علم دینیات کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اساتذہ اپنے فن میں مستعد اور طلبہ ہونہار نظر آئے، اس قافلہ کی سربراہی مولانا رضوان القاسمی کر رہے ہیں، مستعد، سرگرم، مخلص عالم دین ہیں، دوسرے اساتذہ اور مولانا بدرالحسن قاسمی سے ملاقات ہوئی، موصوف پہلے دارالعلوم دیوبند کے عربی ماہنامہ کے ایڈیٹر تھے اب کویت میں کسی علمی منصب پر فائز ہیں، یہاں بھی ایک عنوان دیا گیا تھا: "اسلام اور عربیت"۔ اس موضوع پر اعتماد کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی گنجائش تھی، مگر جمعہ کی وجہ سے وقت تنگ تھا اور طلبہ ابتدائی درجوں کے تھے اس لیے طبیعت کھلی نہیں، البتہ اساتذہ سے مل کر خوشی ہوئی، سب اخلاص و محنت سے کام کر رہے ہیں اور ان کی جدوجہد سے ایک بڑی درس گاہ تیار ہو رہی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ قاسمی نے فقہی مصطلحات کی ایک قاموس مرتب کی ہے جس کا پہلا حصہ نکل چکا ہے اور اردو میں منفرد کام ہے[1] ایک عربی رسالہ بھی یہاں سے جاری ہوا ہے۔

چوتھے روز آخری محاضرہ یونیورسٹی کے عربی اساتذہ اور ریسرچ کے طلبہ کی ایک الوداعی تقریب کے طور پر ہوا، عنوان کوئی نہ تھا مگر میرے اپنے اندازہ میں یہ گفتگو اچھی رہی، عربی کی تعلیم ابتدائی، ثانوی مراحل سے لے کر کالج اور پوسٹ گریجویشن کے مراحل تک کیونکر ہو، اور کیا دشواریاں پیش آتی ہیں اور ان کا کیا حل ممکن ہے اس کی تشریح کا موقعہ ملا، اور سوالات نے گفتگو کو وسعت دی، اس سلسلہ میں زبان سے متعلق ایک حقیقت کی وضاحت کی گئی کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان بے رنگ و بو چیز ہے اگر خیر کے لیے استعمال کی جائے تو خیر ہے اور اگر شر کے لیے استعمال کی جائے تو شر ہوگی، یہ ایک طرح کا سادہ ورق ہے جس پر جیسی روشنائی سے، جس خط میں جو چیز لکھی جائے گی ویسی ہی سامنے آئے گی۔ راقم نے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے فلسفۂ لسانیات کے متعدد علماء کی شہادتیں پیش کیں اور مثالوں سے واضح کیا کہ ہر زبان اپنے پیچھے ایک معاشرت، ایک تہذیب، دینی تصور، مادی تعلق اور رسوم و رواج کی وراثت رکھتی ہے جس سے اس کو جدا نہیں کیا جا سکتا، مثال کے طور پر عربی زبان میں روحانی اور قلبی احساسات

---

[1] "ذکر و فکر" میں آئندہ کسی ماہ کے شمارہ میں اس پر تبصرہ شائع ہوگا۔ ان شاء اللہ

اور خیر کے مثبت پہلو کی نمائندگی اس درجہ ہے کہ اس سے زبان کو علیحدہ کیا جائے تو ما فی الضمیر کا اظہار مشکل ہو جائے گا، عطف و رحم، لطف و توفیق، رأفت کے درمیان باریک فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی زبان میں پورے مفہوم پر حاوی ترجمہ کا لفظ نہیں پیش کیا جا سکتا، انگریزی میں مثبت معانی کے لیے سلبی معانی کی نفی سے کام لیا جاتا ہے، آزادی کے لیے غیر پابند (INDEPENDANT) معصوم کے لیے غیر مجرم (INNOCCNT) شرافت کے لیے تو خیر عربی ہی کا لفظ نُبل (NOBLE) لے لیا ہے کیونکہ ان کی ڈکشنری میں اس کے لیے کوئی لفظ ہی نہ تھا، یوں بھی حروف سلب و نفی جس قدر انگریزی میں ہیں اس کے سوابق (PREFIXES) کو دیکھ لیجئے اَن، اِن، اِم، نون، نو، ڈِس، اور لواحق (SUFFIXES) LESS بھی کے قسم کے ہیں، عربی میں ایجابیت ہے، اس میں احساسات کی نزاکت، قلب کی کیفیات، ہمدردی، محبت، امن و سلامتی، انسان دوستی کے اظہار کے لیے بہترین الفاظ ہیں، انگریزی میں تجارتی مقاصد، لین دین، تھیٹر، ناچ، تاش کے ماحول و معاشرت کی نمائندگی ہے، ہندی اور سنسکرت میں قدیم دیومالا اور منتروں کی تشریح کرنے کے لیے جو الفاظ و تراکیب ہیں وہ کسی اور زبان میں میسر نہیں ہیں، اسی طرح کسی زبان کا بھی جائزہ لیجیے اس کی پُشت پر ایک معاشرت کارفرما نظر آئے گی، مصر و لبنان کے عیسائی ادیبوں نے عربی کے حلیہ کو بگاڑنے کی بہتیری کوششیں کیں جن کا تذکرہ دو روز سے آپ کے سامنے کر رہا ہوں اور اس کی مثالیں دی ہیں مگر وہ اب تک کامیاب نہ ہو سکے باوجود اس کے کہ کروڑوں ڈالر خرچ کرنے والی مشنریاں ان کی پُشت پناہ تھیں، سبب یہ ہے کہ وہ عربی کو نیا پیراہن مہیا کر سکتے ہیں مگر اس کی روح پر حملہ آور نہیں ہو سکتے، وہ یورپین زبانوں کے محاورے اور نظم رمزیت اور وجودیت کی تحریکوں کی تبلیغ کر سکتے ہیں مگر اس سے قرآنی روح کو سلب کر لیں یہ محال تھا اور محال ہے۔

۱۰ر فروری جمعہ کے روز ہمارا سفر حیدرآباد ختم ہوا، چار دن اچھے گزرے، حیدرآباد کو جس قدر نگاہِ تصور سے دیکھا اس سے کم ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کا موقعہ ملا، میرے عزیز مولوی راشد نسیم میرے دورہ کو کامیاب بنانے کے جذبہ سے پہلے ہی آ گئے تھے، ان کو اخبارات میں جلسوں کی رپورٹ اور تصویروں کے شائع کرانے کی فکر رہی جو محض راقم سے ذاتی تعلق اور اخلاص

کی دلیل تھی۔ راستے چلتے انھوں نے بہت سی عمارتوں کی نشان دہی کی، یہ فلاں دواخانہ ہے اور یہ وہ کالج ہے، یہاں پر وہ پارک تھا اور یہاں وہ بلڈنگ تھی۔ "کنگ کوٹھی" کے سامنے سے گزر ہوا اور اس کا نام انھوں نے بتایا تو کان کھڑے ہوئے، یہ نام نہ جانے کتنی بار اور کن کن لوگوں سے سُنا تھا، اس کے صدر دروازہ پر ایک میلی پھٹی سی چادر لٹکتی دیکھی، معلوم ہوا کہ قصرِ شاہی کے درِ دولت کا یہ کسی زمانہ میں پردہ تھا، نگاہ تصور نے اس پھٹے پرانے پردہ پر وہ نقوش دیکھ لیے جو نئی نسل کے لیے تاریخ کے افسانے ہوں گے اور عمر رسیدہ لوگوں کے قلب و نگاہ پر پڑنے والے تازیانے، ایک دن یہی پردہ پرشکوہ و پُرجلال رہا ہوگا، چوب دار، چمک دار اور زرق برق وردیوں میں اس کے دونوں جانب دست بستہ کھڑے ہوں گے، کسی دن یہ خبر ہوگی کہ آج حضور نظام کی سواری نکلنے والی ہے، گھنٹوں پہلے سے ہٹو بچو ہو رہا ہوگا، سڑکیں صاف کی جا رہی ہوں گی، ٹرافک پولیس چوکنا ہوگی، گھوڑ سوار الگ، پیدل دستے الگ اور آگے پیچھے حفاظتی پولیس کی سواریاں ہوں گی۔ خداوند نعمت، سایۂ رحمت، وارثِ سلطنت آصف جاہی یا صد شوکت عالم پناہی کا مرکب اس راستے سے نکلتا ہوگا، ہزاروں لوگ اس پردۂ در کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوں گے۔

پھر وہ صبح تاریک بھی اسی چشم فلک نے دیکھی ہوگی جب یہ سرا پردۂ شاہی کی آبرو لٹ چکی تھی، حرم سرا کی حفاظت کے لیے جو تیغ تھی وہ ٹوٹ چکی تھی، چلمن کی تیلیاں رہ گئی تھیں جس کو قانون عروج و زوال خاکستر کر چکا تھا۔

حیدرآباد میں جناب سید بہاء الدین صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ خود کرم فرما کر قیامگاہ پر تشریف لائے، ان کے صاحبزادے سید شعیب اسلم ندوہ کے فارغ ہیں قاہرہ میں ایم فل کر کے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، سید بہاء الدین صاحب صدق جدید کے محب صادق اور مولانا دریا بادی کے دیرینہ معتقد بلکہ عاشق ہیں، دریا باد جا چکے ہیں اور مولانا مرحوم کے ساتھ سفر میں رفاقت بھی کر چکے تھے۔ مولانا نے ان کا تذکرہ بعض جگہ 'بے بہا' کے لفظ سے بھی کیا ہے، صدق و اخلاص کی دولت بلاشبہ بے بہا ہی ہوتی ہے۔

جن احباب کی تلاش تھی ان میں انجینیر غلام محمد صاحب بھی تھے، موصوف مدینہ منورہ میں بارہ سال تک ایک سول انجینیر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ اختتام ملازمت کے بعد اپنے وطن واپس آ گئے ہیں۔

یاد رہے کہ جب ان سے پہلی بار مدینہ منورہ میں ملاقات ہوئی تھی تو میں نے پوچھا آپ کیا کرتے ہیں؟ خیال تھا کہ جامعہ اسلامیہ کے طالب علم ہوں گے یا کسی مدرسہ یا مسجد کی خدمت ان کے ذمہ ہوگی، جب انھوں نے بتایا کہ وہ انجینیر ہیں تو تصور میں ان حضرات کی بھی جھلکیاں آ گئیں جو صورت شکل سے بالکل "جنٹلمین" نظر آتے ہیں، حالانکہ ان کا تعلیمی پس منظر کسی دینی مدرسہ سے وابستہ ہے۔ بہر حال بھائی غلام محمد صاحب سے بھی سید جمیل الدین صاحب کے ارم کوٹج میں ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ وہ تبلیغی دورے پر گئے ہوئے تھے، گزشتہ تین روز نہ ملنے کی تلافی اس درجہ معذرت، محبت سے کر دی کہ شکوہ کی جگہ شرم دامن گیر ہو گئی۔

حیدر آباد کا نام کسی زمانہ میں ہر مسلمان کی زبان پر تھا، اس شہر کو دیکھنے کی خواہش بھی تھی کیونکہ ہندوستان میں تو کم حجاز میں حیدر آبادی احباب، حیدر آبادی پڑوسی، حیدر آباد کی پسندیدہ غذائیں سب ہی میسر تھے، ان کے خاص خاص محاورے اور بعض صوتی فرق بھی معلوم تھے، یہاں کی سڑکوں کے نام تک سنے ہوئے تھے، ایسے شہر کو چار روز میں کیا دیکھا جا سکتا تھا۔ اور وہ بھی جب چار دنوں میں ہر دن کے چوبیس گھنٹے بندھے ہوئے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی ماضی میں کیا تھی، اس کا رمزیہ شعار جس پر تاج بنا ہوا تھا ختم کیا جا چکا ہے کیونکہ جب تاج تاراج ہو چکا تو اسناد کے سرنامہ پر کیوں رہے، کسی وائس چانسلر نے اپنے زمانہ میں ایک میوزیم میں ان کو جمع کر دیا ہے، اس میں قد آدم بلکہ اس سے بھی وسیع و عریض چوکھٹے میں فرمان شاہی ہے جس کے رو سے اس یونیورسٹی کو قائم کرنے کی اجازت ملی تھی، حضور نظام کے آباء و اجداد کی قد آدم تصویریں ہیں، ان ٹوٹی ہوئی تلواروں اور زنگ خوردہ زرہوں، اور خستہ حال مجسموں میں دنیائے فانی کی ایک خاموش کہانی پوشیدہ ہے۔

حافظ بشیر احمد مصری　　　　ترجمہ: سید غلام محی الدین صاحب

قادیان سے واپسی

اس مضمون کے مصنف شاہجہاں مسجد، ووکنگ، انگلینڈ کے امام اور ماہنامہ اسلامک ریویو کے جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور اس وقت جنوبی افریقہ میں متوطن ہیں۔

میرے بہت سے احباب نے مجھ سے متعدد بار خواہش کی کہ میں اپنی وہ کہانی سناؤں جو قادیان سے متعلق ہے اور اس سلسلہ میں اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں اظہار خیال کروں۔ مفصّل طور پر کچھ کہنے کے لیے ایک پوری ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اس مختصر مضمون میں صرف اُن واقعات کا ذکر اجمالی طور پر کیا گیا ہے جس نے مجھے اس مسلّمہ عقائد کی مخالفت اور منافقانہ مذہب کی ملامت کرنے پر مجبور کر دیا۔

میں ۱۹۱۴ء میں قادیان میں پیدا ہوا۔ یہ میری بدقسمتی تھی جو پچھلے ۳۷ برسوں سے میرے گلے میں طوق لعنت کی طرح حائل ہے۔ بچپن میں ہی میرے دل میں یہ بات بٹھلا دی گئی تھی کہ تمام مسلمان کافر ہیں۔ اللہ اور اسلام پر ایمان اس کے ساتھ مشروط ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب کو اللہ کا رسول تسلیم کیا جائے اور ان کے بعد اُن کے جانشینوں کو خلیفہ مانا جائے۔

میں جیسے جیسے سن شعور کو پہنچتا گیا میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ایک ایسے معاشرہ کا فرد ہوں جو دجل و فریب پر مبنی ہے۔ کچھ ایسے بزرگ یقیناً موجود تھے جنھوں نے اس مذہب کو اسلام کی ایک اصلاحی تحریک سمجھ کر اس کے ابتدائی دور میں قبول کر لیا تھا۔ ان مخلص اور سادہ لوح لوگوں میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ سمجھ سکتے کہ ان کے اردگرد اب کیا ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنے آپ کو اس سے صلح کرنے پر مجبور پاتے تھے۔

کم عمری کے باعث میرے لیے اس وقت یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس تحریک سے اسلام

کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں اس تحریک کے قائدین کے اطوار و اخلاق کے بارے میں میرے دل میں شبہات پیدا ہوئے۔ اس ناپختہ شعور کی کیفیت میں قدرت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ میرا امتحان لینے کے لیے مجھے جہنم کی اس بھٹی میں ڈھکیل دے۔

میں ۱۸ سال کا ایک تندرست و توانا نوجوان تھا جب مجھے یہ پیغام ملا کہ اُس وقت تحریک کے سربراہ (خلیفہ) نے کچھ خفیہ امور پر تبادلۂ خیال کے لیے مجھے مدعو کیا ہے۔ اُس زمانے میں میں ان کو ظل اللہ سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس دعوت نامہ کو پاکر بے حد مسرت اور عزت محسوس ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ مجھے مذہبی امور سے متعلق کوئی خفیہ کام سپرد کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی ملاقات محض سرسری تھی۔ خلیفہ مرزا غلام احمد کے بیٹے بشیر احمد آنجہانی تھے انھوں نے مجھ سے کچھ ذاتی سوالات کیے جن کے جوابات میں نے بہت مؤدب ہو کر دیے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کروں اور دوسری ملاقات کے لیے وقت بتلا کر رخصت کر دیا۔ بعد کی ملاقاتیں بے تکلفانہ رنگ اختیار کرتی گئیں یہاں تک کہ مجھے "اندرونی حلقہ" میں داخل کرنے کی پیشکش کی گئی۔

عیش پرستی کا مرکز:

"ظل اللہ" نے دراصل جنسی عیش کوشی اور مختلف طریقوں سے عیش پرستی کے لیے ایک اندرونی حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے دلالوں اور کٹنیوں کا ایک گروہ اکٹھا کر رکھا تھا۔ غریب خاندانوں یا ایسے لوگ جن کے ذہنوں پر مرزائیت پوری طرح سوار ہو چکی تھی یا پھر دوسرے مجبور اشخاص جو کسی طرح مدافعت کے قابل نہیں تھے، اُن کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو یہاں لایا جاتا۔ ان میں سے کبھی کوئی شخص صدائے احتجاج بلند کرتا تو اسے بائیکاٹ، مُرتد قرار دے کر یا دوسرے طریقوں سے بدنام کر کے خاموش کر دیا جاتا۔

مرزا صاحب کا خاندان اپنے فرقہ میں روحانی اقتدار کا حامل ہی نہیں بلکہ قادیان اور اُس کے اطراف میں کثیر زرعی زمینوں کا مالک بھی تھا۔ ان زمینوں پر کاشتکاری کرنے والے ان کے متبعین ہونے کے علاوہ معاشی طور پر ان کے دست نگر تھے کیوں کہ یہاں انھیں بہ حیثیت کاشتکار کسی قسم

کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ ان حالات میں کسی شخص کی جانب سے اُن کی مخالفت ممکن نہ تھی۔ کچھ لوگوں نے اگر کبھی اس کی جرأت کی تو وہ کسی حادثہ کا شکار ہوجاتے یا پھر اس طرح غائب کردیے جاتے کہ اُن کا کوئی سُراغ ہی نہیں ملتا تھا۔ جس زمانہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا مسلمان اپنی سادہ لوحی کی بنا پر مرزائیت کے خلاف کلامی بحثوں اور مناظرانہ جنگ میں مصروف تھے اور انھیں اس کی اس گندگی کا کوئی علم نہیں تھا۔

ایسا بھی وقت آیا جب میرے ذہن میں خیال آیا کہ تقدس کے پردہ میں اس بے ایمان گروہ کے سربراہ کو قتل کرکے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کم عمری میں بھی عقل نے ساتھ دیا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ کسی دشمن نے مذہبی تعصب کے تحت یہ جرم کیا ہے اور اس طرح تاریخ اُسے شہیدوں کی صف میں جگہ دے دیگی۔ اس کے علاوہ ایسے شخص کی اچانک موت اس کے جرائم کی سزا کے بجائے اس کی نجات دہندہ ثابت ہوگی اور لوگ یہ خیال کریں گے کہ اس نے مذہب اور خدا کے لیے اپنی جان دے دی۔ بعد کے حالات سے بھی یہ ثابت ہوا کہ میرا خیال صحیح تھا۔ وہ تھوڑے دنوں کے بعد فالج کا شکار ہوگئے، اور طویل عرصہ تک سخت تکلیفیں اُٹھا کر راہیِ فنا ہوگئے۔ ان کی علالت کے زمانہ میں جو ڈاکٹر ان کا علاج کیا کرتا تھا اس نے مجھے بتلایا آخری مرحلہ پر وہ ذہنی طور پر ماؤف ہوچکے تھے اور ہر وقت انتہائی فحش باتیں کہا کرتے تھے اور جب تک گویائی نے ساتھ دیا فحش الفاظ ہی زبان پر رہے اور اسی پر خاتمہ بالشر ہوا۔

مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ ایک اور وجہ تھی جس نے راست اقدام سے باز رکھا تھا۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ ایک شخص واحد کی موت سے یہ بُرائی دور ہونے والی نہیں ہے یہ صرف اکیلا یہ شخص جنسی بے راہ روی کا شکار نہیں تھا۔ ان کے بھائی اور مرزا صاحب کے خاندان کے افراد کی اکثریت کی اخلاقی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اس نام نہاد تقدس مآب گھرانے کے بزرگوں نے بھی اپنی لمبی داڑھیوں کے باوجود فسق و فجور کے حلقے بنا رکھے تھے گویا کہ ان کے درمیان ایک سمجھوتہ سا ہوگیا تھا کہ کوئی ایک دوسرے پر انگشت نمائی نہ کرے۔ دراصل اس حلقۂ اقتدار میں صرف اُنھیں لوگوں کو ذمّہ داری سونپی جاتی تھی جو اس خاندان کے اس

طرزِ زندگی لکھ پوری طرح اپنا چکے تھے۔ یہ وہ خاندان تھا جسے یہ لوگ بے شرمی سے پیغمبر کا خاندان کہتے تھے۔ ان حالات میں یہ تعجب خیز امر نہیں تھا کہ کانا پھوسی کے ذریعہ اُن کے کارناموں کا ذکر ہونے لگا تھا اور امیر خاندانوں کے بگڑے ہوئے بہت سے نوجوان اس "اصلاحی تحریک" میں اس لیے شامل ہو گئے تھے کہ انھیں مشرقی اخلاق کی ان حد بندیوں سے نجات مل جائے جس پر اس وقت معاشرہ عمل کر رہا تھا۔

تائب ہونے والوں پر مظالم:

خلیفہ کے "اندرونی حلقہ" سے اخراج کے بعد میری زندگی مسلسل خطرہ میں تھی۔ اس کے جرائم پیشہ لوگوں نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اس وقت میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اُس سے سیدھا مقابلہ کروں۔ میں خلیفہ کے پاس گیا اور اُن کو میں نے ایک طویل خط دکھایا۔ جس میں مَیں نے اس کے سیاہ نامۂ اعمال کا پورا ریکارڈ، لوگوں کے نام جرائم کے اوقات کے ساتھ لکھ رکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس خط کی نقلیں میں نے مختلف اشخاص کے پاس اس ہدایت کے ساتھ جمع کر دی ہیں کہ میرے مرنے یا غائب کر دیے جانے پر وہ اسے کھول کر پڑھ لیں۔ اُس کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ آزادی سے قادیان کی سڑکوں پر چل پھر سکوں۔

ان لوگوں کی بد اخلاقیوں کے بارے میں جس قدر میری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اسی قدر میں مذہب سے، برگشتہ ہوتا گیا حتیٰ کہ میں ملحد ہو گیا۔ الحاد نے میرے اندر ایک ایسا خلا پیدا کر دیا جسے میرے لیے از خود بھرنا مشکل تھا لہٰذا میں نے اپنے والد صاحب سے رجوع کیا۔ انھیں میری روداد سُن کر سخت دھچکہ لگا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک کم عمر نوجوان کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے طور سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں اور بہت جلد ہی انھیں میری صداقت کا یقین ہو گیا۔

میرے والد صاحب نے نام نہاد خلیفہ کو ایک طویل مراسلہ لکھا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ خلیفہ کے عہدہ سے دست بردار ہو جائے۔ دو بار یاد دہانی کرانے پر بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا بلکہ میرے والد شیخ عبدالرحمٰن صاحب مصری اور اُن کے خاندان کے تمام لوگوں

کو مرتد قرار دے دیا گیا۔ میرے والد صاحب کے تینوں خطوط بعد میں ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوئے۔

مرتد ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا سماجی بائیکاٹ شروع ہوگیا۔ ہماری زندگی خطرہ میں پڑ گئی یہاں تک کہ حکومت کو ہمارے گھر کے ارد گرد چوبیس گھنٹہ کا پہرہ لگانا پڑا اور ہمارے گھر کا کوئی فرد پولیس کو ساتھ لیے بغیر باہر نہیں جاسکتا تھا۔ اس تمام احتیاط کے باوجود میرے اور میرے دو ساتھیوں پر بازار میں دن کے وقت حملہ کیا گیا۔ میرے ایک ساتھی کے سینہ میں چھرا مارا گیا اور وہ مرگیا۔ دوسرے کی گردن اور کندھے پر زخم آئے اور اُسے بہت دنوں تک اسپتال میں رہنا پڑا۔ میں نے مقابلہ کیا اور اپنے حملہ آور کو زخمی کر دیا۔ یہ زخمی شخص غائب کر دیا گیا اور پولیس نے بعد میں اُسے تلاش کر کے گرفتار کیا۔ اُسے بعد میں قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ قادیان میں اُس کی موت کے بعد بہت ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا اور خلیفہ نے خود اُس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اس واقعہ کے بعد مجلس احرار اسلام نے اپنے والنٹیرس بھیج کر ہماری حفاظت کا انتظام کیا۔ یہ والنٹیر ملٹری پولیس کے علاوہ ہمارے گھر کا پہرہ دیتے تھے۔ ان سب لوگوں کے خیموں سے جو ہمارے بنگلہ کے میدان میں نصب تھے ہمارا گھر مورچہ بند قلعہ معلوم ہوتا تھا۔

مرزا کے کارکنوں نے میرے والد کو جھوٹے مقدموں میں پھانسنا شروع کر دیا۔ ان کا مقصد انھیں بدنام کرنا اور مالی طور پر کمزور بنانا تھا۔ اس کے لیے اس درجہ گندی اور گری ہوئی ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا کہ ہمارے لیے زندگی دوبھر ہوگئی۔ میرے والد کو گیارہ افراد پر مشتمل اپنے خاندان کے گزارہ کے لیے زیورات اور جانور بیچ دینا پڑے۔ سب سے افسوسناک امر یہ تھا کہ ہمارے خاندان کے بچوں کو تعلیم منقطع کرنا پڑی، میرے خاندان پر ان مظالم اور ایذا رسانی کی تفصیلات اُس زمانہ کے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔

نقلِ وطن:

حکومت اور دوسرے لوگوں کی جانب سے ہمارے خاندان پر بہت دباؤ پڑ رہا تھا

کہ ہم قادیان سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ ہم لوگ لاہور چلے گئے۔ میرے والد صاحب لاہوری جماعتِ احمدیہ میں شریک ہو گئے، حالانکہ اس میں اور قادیانوں کے عقائد میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ یہ جماعت بھی بداخلاقیوں میں اسی طرح ملوث تھی۔ میں نے اس جماعت سے بھی اپنے آپ کو الگ رکھا کیونکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میرا عقیدہ تو مذہب پر سے ہی اٹھ چکا تھا۔ بہرحال اُس زمانہ میں مجلس احرار کے قائدین سے میرا ربط ضبط بڑھنے لگا جس نے میرے اوپر بہت اثر ڈالا۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر شامل تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ مخلص دوست اور اچھے مسلمان ہیں۔

میرے والد صاحب نے میرے الحاد کو مجبوراً نظرانداز کر دیا تھا۔ حالانکہ انھیں اس پر دلی قلق تھا۔ انھوں نے مجھے بتلایا کہ وہ میرے لیے اللہ سے برابر دعا کرتے رہتے ہیں اور مجھے بھی خدا سے ہدایت طلب کرنے کی تلقین کی۔ میرا جواب یہ تھا کہ وہ مجھ سے ایک ایسی ہستی کی عبادت کرنے کے طلبگار ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ آخرکار بہت مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ میں خدا سے مشروط طور پر دعا مانگوں۔ چنانچہ میں کچھ اس طرح دعا مانگنے لگا: "خداوندا! اگر تیرا وجود ہے تو مجھے کچھ اس کا عرفان عطا کر اور اگر تیرا کوئی وجود نہیں تو پھر تجھ پر ایمان نہ لانے کا کوئی الزام میرے اوپر نہیں ہے۔"

اس قسم کی دعا گستاخانہ بلکہ کافرانہ معلوم ہوتی ہے لیکن ایک سال کے عرصہ ہی میں میرے اوپر اس کے پُراسرار نتائج پڑنے لگے۔ میں نے دو خواب دیکھے۔ ان میں سے ایک تو ذاتی نوعیت کا تھا جسے بیان کرنا مناسب نہیں۔ دوسرا خواب کافی طویل اور واضح تھا۔ میرے جیسے گنہگار کو بھی اس کا یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ اس خواب کے آخری حصہ میں مَیں نے دیکھا کہ مرزائی خلیفہ صاحب کا چہرہ ہیبت ناک طریقہ پر مسخ شدہ ہے۔

ان خوابوں کے بعد مجھے بہت تسکین محسوس ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے روحانی کرب میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ مجھے اب باقاعدہ طور پر اسلام قبول کر لینا چاہیے۔ مرحوم مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مجھے مولانا محمد الیاسؒ (بانی تبلیغ جماعت) کے پاس دہلی سے چند

میل کے فاصلہ پر موضع مہردلی لے گئے اور وہاں ۱۹۴۲ء میں ان کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شیخ الحدیث جناب محمد زکریاؒ بھی وہاں موجود تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد مولانا محمد الیاسؒ کے ساتھ جماعت میں موجود تقریباً چالیس اشخاص نے میرے لیے دعا کی۔

۱۹۴۲ء میں میں احساسِ ندامت و قدرے سکون کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جنوبی افریقہ چلا گیا۔ بمبئی میں جہاز کے عرشہ پر کھڑے ہو کر میں قرآن شریف کی اس آیت کی تلاوت کرنے لگا:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ٥ (سورۂ نساء آیت ۵، پ ۴)

"اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لیے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجیے اور ہمارے لیے غیب سے کسی حامی کو بھیجیے۔"

جنوبی افریقہ میں بیس سال رہنے کے بعد میں ۱۹۶۱ء میں انگلینڈ چلا گیا۔

ووکنگ کی مسجد کی امامت:

۱۹۶۴ء میں ووکنگ شاہ جہاں مسجد کا امام مقرر کیا گیا۔ اس تقرری کی وجہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس مسجد کو ایک مستشرق ڈاکٹر لیٹنر (Dr. LEITNER) نے ۱۸۸۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے رقم فراہم کی تھی اور ایک ٹرسٹ بنا دیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرزائیت نے بال و پر نہیں نکالے تھے۔ لہٰذا ٹرسٹ نے اس کا انتظام لاہوری جماعت کے مرزائیوں کے سپرد کر دیا تھا۔

۱۹۶۰ء کے بعد مسلمانوں کی مختلف انجمنیں انگلینڈ میں قائم ہو چکی تھیں اور وہ اس پر مُصر تھیں

کہ مسجد کا انتظام ٹرسٹ کی منشا کے مطابق مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اسے اسلامی مرکز میں تبدیل کر دیا جائے۔ مجھے ٹرسٹ کے سکریٹری اور منیجر نے بہ حیثیت امام کام کرنے کے لیے درخواست کی۔ میں نے اُن سے صاف بتلا دیا کہ میں سُنّی مسلمان ہوں اور میں نے مرزائیوں کے خلاف اپنے تحریر کردہ کچھ مضامین کی نقلیں بھی ارسال کر دیں۔ انھوں نے مجھے بتلایا کہ وہ میرے خیالات سے واقف ہیں اور مجھے اطمینان دلایا کہ پاکستان کے ہائی کمشنر جو کہ ٹرسٹ کے سرکاری صدر ہیں مجھ سے متفق ہیں۔

مسجد کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اکثر مسلمان مجھے مرزائی سمجھتے ہیں۔ پچھلے پچیس برسوں سے اس مسجد میں مرزائی امام ہی مقرر ہوتے رہتے تھے لہٰذا عام مسلمانوں کے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا کہ یکایک کوئی مسلمان بھی امام ہو سکتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں دو گھوڑوں پر سوار ہوں مرزائیوں اور لاہوریوں سے میرے اختلافات ناقابلِ عبور تھے اور تمام مسلمان مجھے مرزائی سمجھتے تھے۔ مجھے انگلینڈ کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کافی وقت لگا۔

میری یہ تمنا تھی کہ میں مسلم ممالک کا دورہ کر کے اُن کی مذہبی حالت کا مشاہدہ کروں (اس دورہ میں میں نے تین سال صرف کیے اور تقریباً چالیس ملکوں میں ۵۰ ہزار میل کا سفر کیا)۔ مسجد سے مستعفی ہونے سے پہلے میں یہ چاہتا تھا کہ مسجد اور اسلامک سینٹر مستقل طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہی رہے۔ بورڈ آف ٹرسٹیز میں صرف دو یا تین مرزائی ممبر تھے لیکن وہ بہت سرگرم اور بااثر لوگ تھے۔ وہ برابر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ میرے بعد مرزائی امام ہی مقرر کیا جائے۔

مسلمان ممبروں سے طویل گفتگو اور مشورہ کے بعد میں نے انگلینڈ اور آئرلینڈ کی تمام مسلم انجمنوں کا ایک جلسہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو شرقی لندن کی مسجد میں طلب کیا جس میں ایک سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی۔ میں نے انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں سال کے آخر میں دورہ پر جانے والا ہوں اور مرزائی اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اُن کا اپنا امام مقرر کر دیا جائے۔

اس رسّہ کشی میں ایک قانونی نکتہ بہت اہم تھا جس سے ہمیں بہت مدد ملی۔ ٹرسٹ کی رو سے مرزائی شروع سے اس مسجد کے کرایہ دار کی حیثیت رکھتے تھے جسے کسی وقت ختم کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تک یہ بات عام طور پر لوگوں کی معلوم نہیں تھی اور میں نے اُن کی توجہ اس کی طرف دلائی۔

اس جلسہ میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ "ووکنگ مسجد کی ایک تشکیل نو کمیٹی" قائم کی جائے جو مسجد کا چارج علانیہ اور مجمع کے سامنے لے لے اور میرے جانے کے بعد عارضی طور پر ایک مسلمان کو امام مقرر کر دے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ٹرسٹ سے کہا جائے کہ وہ اپنے مرزائی ممبروں کی رکنیت ختم کر دے اور آئندہ کسی مرزائی کو ممبر نہ بنائے۔ اس طرح نومبر ۱۹۶۸ء میں میں نے مسجد کا چارج دیا اور اپنے دورہ کے لیے انگلینڈ سے روانہ ہوا۔

میں یہاں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہ ہوتا اگر میرے کچھ مسلمان دوستوں نے میری مدد نہ کی ہوتی۔ ان سب کے نام گنانا تو ممکن نہیں ہے لیکن تین اشخاص کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں مرحوم مولانا لعل حسین اختر ختم نبوت کی ایک بین الاقوامی انجمن کے صدر تھے۔ میری طرح انھیں بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مرزائیت کا ذاتی تجربہ تھا۔ دوسرے حاجی محمد اشرف گوندل، صدر بین الاقوامی تبلیغی مشن تھے اور تیسرے جناب این۔ ایم۔ لودھی تھے جنھوں نے ووکنگ کی تشکیل نو کمیٹی قائم کرنے کے لیے اَن تھک محنت کی تھی۔

آخر میں، میں اپنے مسلمان بھائیوں سے قادیانیوں کے خلاف زندگی بھر کی جدوجہد کی روشنی میں چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا تاکہ مسلمان زعماء اور حکومتیں اس پر گہرائی سے غور کر سکیں۔ مرزائی مذہب اب اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بدنما چہرہ سے نقاب الگ کی جا چکی ہے۔ اسلام اس قسم کے ارتدادانہ تحریکوں کا مقابلہ کرنے کی پوری سکت رکھتا ہے لیکن ایک نیا خطرہ یہ ہے کہ قادیانی لیڈروں نے بین الاقوامی سیاست میں مسلم دشمن طاقتوں کو اپنی خدمات سپرد کرنا شروع کر دی ہیں۔ سازش اور تخریبی کارروائی اس وقت بہت منفعت بخش پیشہ بن چکا ہے اور مختلف ممالک میں تبلیغ اسلام کے پردہ میں اپنے آدمی مقرر کرنا بہت آسان بات ہے۔

غیر مسلم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مرزائیت سے محض مذہبی تعصب کی بنا پر اختلاف رکھتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ تحریک اسلام دشمن طاقتوں کی حلیف اور مسلم ممالک میں ان طاقتوں کی سیاسی اور اقتصادی مفاد کی نگہبان بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے اور جس کا علم اب مسلمانوں کو ہوتا جا رہا ہے کہ قادیانیوں کی اخلاقی بے راہ روی سے مسلم نوجوانوں کے اخلاق پر بھی بڑا اثر پڑ رہا ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی

غزالی اور مزارِ غزالی

یونسکو (UNESCO) پیرس اور دانشگاہ تہران کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے امام غزالی (۴۵۰/۵۰۵) متوفی کی نوصد سالہ یادگار وفات اواخر ماہ فروری ۱۹۸۶ء میں تہران یونیورسٹی میں منائی گئی۔ غزالی کے آثار اور تنویر افکار کی علمی کاوشوں سے متعلق تحقیقی مقالے پیش کیے گئے۔ چونکہ یہ ایک بین الاقوامی کانگرس تھی اس لیے علماء اور دانشوروں نے غزالی کے علم الٰہیات، علم کلام و فلسفہ و تصوف اور علمی اور سیاسی نظریات پر روشنی ڈالی۔ تالیفات غزالی کے علمی اور موضوعی تجزیے کے بعد غزالی کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔

راقم الحروف بھی اس کانگرس میں مدعو تھا، اس نے اپنے مقالہ میں غزالی کے افکار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تھی نیز ان کی تعلیمی، فلسفیانہ اور منطقی عبقریت کے اکتشافات کے بعد اس بات کی اہمیت ظاہر کرنے کی سعی کی کہ دورِ حاضر میں جب کہ انکار خدا کی تحریک نے پھر قوت اختیار کر لی ہے اور سائنس دانوں نے ماوراء کا انکار کرتے ہوئے انسان کو خدائی کا مقام دے دیا ہے، غزالی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ جدید سائنسدان کم و بیش قدیم فلاسفہ یونان کی طرح بھٹکے ہوئے ہیں۔ غزالی قدیم یونانی فلسفہ کی آفات سے نسل انسانی کو محفوظ کر کے اسے خالق کائنات کی طرف واپس لایا، ان کے ایمان کی بجھی ہوئی چنگاریوں کو شمع فروزاں بنا دیا اور فلسفیوں کے دلائل کی "تہافت الفلاسفہ" اور "المنقذ من الضلال" وغیرہ میں بیخ کنی کر ڈالی۔ فلاسفہ کی طرح آج کے سائنس دان بھی مذہب کو عقل کا تابع تصور کرتے ہیں، بلکہ مذہب اور مابعد الطبعیات کا سرے سے انکار کرتے ہیں، مرئیات ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے اور غیر مرئیات شے مجہول ہے۔ غزالی نے باطنیوں کا جس طرح صفایا کیا وہ بھی لائق صد ستائش ہے، باطنی عقائد کے مبلغین نے ظاہر اور باطن کی تفریق سے قرآن و سنت کی شکل ہی بدل ڈالی تھی، ان کے خیال میں قرآن و سنت کے احکام محض (ALLEGORICAL) ہیں۔ چونکہ آج یہ فتنے پھر زور و شور سے اُبھر رہے

ہیں اس لیے غزالی کی ضرورت آج اسی طرح محسوس کی جارہی ہے جس طرح پانچویں صدی ہجری میں تھی۔ ہزار برسوں کے بعد بھی افکارِ غزالی تابندہ و پائندہ ہیں۔

کانگرس کے اختتام پر مزارِ غزالی کی زیارت کی مجھے آرزو تھی۔ راقم الحروف کی درخواست پر منتظمین کانگرس نے اس کا نظم کیا۔ خاکسار وزارت ملی ارشاد کے زیر ہدایت و اہتمام ۲۷ فروری ۱۹۸۶ء کو خراسان کے دارالخلافہ مشہد پہنچا، جہاں سے روسی سرحد محض پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مشہد کی شہرت محتاجِ تعارف نہیں، یہ شیعہ حضرات کی مذہبی زیارت گاہ ہے۔ امامِ ہشتم یعنی امام علی بن موسیٰ الرضاؒ کی خواب گاہ، جو مرجوعۂ خلائق ہے، یہیں واقع ہے۔ یہ وہی امام ہیں جن کو عباسی خلیفہ مامون نے زہر دے کر اس لیے ہلاک کر دیا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کہ امام کی شہرت و مقبولیت سے مامون کو سیاسی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ موسیٰ خسروی نے اپنی فارسی تالیف میں اسی واقعہ پر سارا زور صرف کیا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اس افسانہ کی شدّت کے ساتھ تردید کی ہے۔ امام ہشتم کی خواہر معصومہ شہر قُم میں مدفون ہیں۔ خاکسار کو ان دونوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کا موقع ملا۔

وزارت ارشاد ملی کے عہدہ داروں نے محبت و اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے پہلے نیشاپور کا پروگرام بنایا جو مشہد سے ۱۱۷ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ جہاں عمر خیّام اور عطّار کی آرام گاہیں واقع ہیں۔ ۲۸ فروری کو ہم لوگ بذریعہ ٹیکسی نیشاپور پہنچے۔ نیشاپور کے نام سے ہی اسلامی تاریخ کی گونجیں سنائی دینے لگیں کیونکہ نیشاپور علوم اسلامیہ کا مرکز و منبع رہ چکا تھا۔ پہلے عمر خیام کی تربت پر گئے، جو ایک مثلث کی شکل میں خیّام کی ریاضی دانی کی شہادت دے رہا تھا۔ باغ، روش اور سرو قد درختوں سے گھرا ہوا وسیع علاقہ کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا۔ باغ میں داخل ہوتے ہی اس شعر پر نظر پڑی ؎

شکوہ خواہد کرد بلبل گر گل پُر پَر شود

(بلبل شکوہ سنج ہوگا اگر پھول کے بھی پَر نکل آئیں)۔

ہر جگہ خیّام کے اشعار کندہ نظر آئے۔ خیام کی علالت و شفایابی کا مشہور واقعہ بھی یاد آیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں شوخی کے جرم میں فالج کا شکار ہوا تھا۔ اس نے

یہ اشعار کہے تھے ؎

ابریق مےٴ مرا شکستی ربّی — بر من در عیش را بہ بستی ربّی

من می خورم، تو می کنی بد مستی — خاکم بہ دہن مگر تو مستی ربّی

ذرا ہوش میں آیا تو اسے اپنی گستاخی کا احساس ہوا۔ فوراً بطور مجادلہ محبت حسب ذیل اشعار منظوم کر ڈالے ؎

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگوی — آں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگوی

من بدکنم و تو بد مکافات کنی — پس فرق میان من و تو چیست بگوی

اس مجادلہ محبت پر رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور خیام صحت مند ہوگیا۔

عمر خیام کی تربت و اطرافِ تربت کو خوب سجایا گیا ہے۔ ایک میوزیم میں اس کے آثار محفوظ ہیں اور قد آدم مجسّے بھی آویزاں ہیں۔ اس میوزیم میں خیام کے انگریزی مترجم فٹز جرالڈ کا پورٹ ریٹ بھی آویزاں ہے۔ اس نے خیام کے ترجمہ میں شعری آرٹ اور پیغام دونوں کو صدمہ پہنچایا ہے۔ تربت کا نمونہ تقریباً نصف صدی قبل خوب صورت سنگ مرمر سے تیار کیا گیا تھا۔ شاہ کے دَور میں اس کی تکمیل ہوئی۔

اسی شہر میں امام محروق کا مزار ہے جو امام زین العابدینؓ کے پسر تھے۔ محروق اس لیے کہے جاتے ہیں کہ عام روایات کے مطابق یہ بھی عباسی خلفاء کے ہاتھوں نذر آتش کیے گئے تھے۔

معروف صوفی شاعر عطّار کی تربت بھی اسی شہر میں ہے۔ لیکن خستہ حالی اور بے توجہی کا شکار ہے۔ عطّار حملہ منگول کے دوران شہید ہوئے تھے۔ احاطہ تربت باغ و روش سے مرغزار ہے۔ اسی احاطہ میں دورِ صفوی کے معروف نقّاش اور پینٹر محمد غفاری کمال الملک کا مزار بھی واقع ہے۔ روایات کے مطابق صفوی دور کی عمارات سازی اور نقاشی کے موجد یہی ہیں۔

پہلی مارچ ۸۶ء کو ہم مشہد سے طوس پہنچے، جو شہر مشہد سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں حضرت امام غزالیؒ کا مزار واقع ہے۔ اسی شہر میں معروف شاعر فردوسی کی

تربت بھی ہے۔ طوس میں ایک بوسیدہ، خستہ حال عمارت نظر آئی جو غزالی کا لکچر ہال تھا یا اکیڈمی تھی جہاں امام غزالی درس و تدریس، تحقیق و ریسرچ کے علاوہ لکچر بھی دیا کرتے تھے۔ اسی عمارت کے سامنے تربت نما ڈھانچہ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ غزالی کی اصل تربت نہیں ہے، اکیڈمی یا لکچر ہال بھی مجہول الحال تھا۔ دروازہ پر محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے جو کتبہ یا بورڈ لگا ہوا تھا اس پر حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی:

"از آثار طوس است کہ تاریخ دقیق ساختمان و مورد استفادہ آن بدرستی معلوم نیست۔ بہ روایت خانقاہ و محل تدریس امام غزالی بودہ کہ قبل از حملہ مغول ساختہ شدہ است۔ قسمت ہائے ملحقات آن از بین رفتہ و تعمیراتی صورت گرفتہ است۔ از آثار دیگر برجائے ماندہ از شہر طوس قسمتہائے از حصار گلی و خشبی از آثار تخریب شد (ارگ) شہری می باشد۔"

اس کا مطلب یہی ہوا کہ اس عمارت کی محقق تاریخ معلوم نہیں ہے۔ روایۃً اس کو غزالی کی درس گاہ سے منسوب کیا جاتا ہے جو منگول کے حملہ سے قبل بنائی گئی تھی۔ ان تفصیلات کو معلوم کر کے خاکسار پر افسردگی طاری رہی اور محکمہ آثار قدیمہ کی مجرمانہ غفلت پر صدمہ ہوا۔ بار بار خاکسار نے سوال کیا کہ ایک عالمی اسکالر، شہرۂ آفاق مفکر کے مزار کا مجہول ہونا، عقل و دانش کی گرفت سے بالا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کے افسران نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ شہر طوس ایک زمانہ میں ہارون رشید کا علاقائی پایۂ تخت (ارگ) تھا، جس کے اردگرد دیواروں کا حصار تھا اور اس شہر میں سونے اور جواہرات کے دفینے تھے، شاہ ایران نے عرصہ تک اس علاقہ کی کھدائی کرائی اور دولت کے گنج ہائے گراں مایہ کو یہاں سے تہران لے گیا۔ اب بھی وہاں خزینے مدفون ہیں۔ اس کھدائی میں قدیم ترین قبرستان شہر طوس بھی مسطح ہو گیا۔ لیکن اسی تاریخی قبرستان میں ایک ملبہ پڑا ہوا ہے جسے لوگ غزالی کے مزار سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے اردگرد تمام کھیت ہیں، محکمہ آثار قدیمہ کے حکام ہنوز غزالی کی قبر کو مشخص کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ خاکسار نے ملبہ کے اس ڈھیر کے پاس جانے پر اصرار کیا۔ آخر گندم کے کھیت سے ہوتے ہوئے ہم اس ڈھیر کے پاس پہنچے اور محکمہ ارشاد و آثار قدیمہ کے حکام نے دلجوئی کی اور یقین دلایا کہ وہ غزالی کے مزار کی تعیین و تشخیص

میں سرگرداں ہیں۔ خاکسار نے ان حکام سے درخواست کی کہ اس ملبہ کو جو روایتی طور پر غزالی کا مزعومہ مزار ہے، چہار دیواری سے گھیر دیا جائے تاکہ یہ ٹیلہ بھی نیست ونابود نہ ہو جائے۔ خاکسار نے اس سلسلہ میں ایک تحریری محضر نامہ بھی افسران کی خدمت میں پیش کیا۔

اسی تاریخی قبرستان سے کچھ کتبے برآمد ہوئے ہیں جن پر غزالی کا نام کندہ ہے اس وقت وہ غزالی کی مزعومہ درسگاہ میں موجود ہیں۔ اس کے حروف مرور زمانہ نیز نمک وسیپ کی بوسیدگی کی وجہ سے گھل گئے ہیں۔ عام قاری اس کی قراءت پر قادر نہیں۔ غزالی اور مزار غزالی کی طرف اس مجرمانہ غفلت کی داستان قدیم ہے۔

امام غزالی نے باطنیوں کے خلاف جو حملے کیے وہ اثنا عشری فرقہ کے لیے ناقابل برداشت تھے، اس کی پاداش میں ان کی نشانیوں کو مجہول بنا دینا کچھ بڑی بات نہ تھی، یہ عمل صفوی دور سے جاری رہا۔ پہلوی دور میں بھی یہ عمل بالواسطہ یا بلاواسطہ جاری رہا۔ ایک طرف خیام وفردوسی کی تابناک تربتیں ہیں اور دوسری طرف عطّار اور غزالی کی خستہ حال اور مجہول خوابگاہیں۔ دونوں میں مقارنہ وموازنہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

یہ بھی ایک المیہ سے کم نہیں کہ ۱۹۸۶ میں خیام اور فردوسی کے قاری کم نہیں جب کہ غزالی کے قارئین کی تعداد میں اضافہ در اضافہ ہو رہا ہے۔ مغربی ومشرقی جامعات کے نصاب میں غزالی کی تالیفات شریک درس ہیں، دینیات والٰہیات کے شعبوں میں خصوصاً اس کا درس ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

ایک طرف غزالی کی خواب گاہ کی مجہولیت ہے اور دوسری طرف فردوسی کی خوابگاہ کی خسروی اور سروری۔ داریوش کے تخت جمشید کے نمونہ پر بنا ہوا سنگ مرمر کا یہ تاج محل جو فردوسی کے مزار پر افتخار قومی کا نشان بنا ہوا ہے، کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ احاطہ، روشنی، باغات اور سرو قد درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ نصف صدی قبل قومی نشان کا یہ تاج محل شاہ ایران نے بنوایا تھا مگر شاہ پہلوی کے نام ونشانات بھی اب مٹا دیے گئے ہیں۔

مقبرہ فردوسی کے اندرونی دیواروں پر اساطیر شاہنامہ فردوسی اور داستان رستم وسہراب مصوّر ومجسّم سنگ مرمر کی دیواروں پر کندہ ہیں، فردوسی کے اشعار بھی منقش مکتوب ہیں فردوسی

کے سرہانے ایک میوزیم ہے، جس میں آثار قدیمہ اور اساطیر شاہنامہ کے نشانات و علامات محفوظ ہیں۔ رستم کی کہانی، تصویروں کی زبانی دیواروں پر منقش ہے۔ پہلوی شاہ نے ان نشانات کو اپنی کبریائی و سروری کا علامتی نشان قرار دیا تھا۔ داریوش اور سائرس ہی پہلوی شاہ کی شوکت کے علامات میں تھے۔ شیراز میں تخت جمشید سے نسبت رکھنے والا شاہ ایک دن گدا ہو کر نکل گیا۔ تخت جمشید کے دروازے پر تین منہ کے شیر جو کشور کے سرحدی سرحدوں کی محافظت کے لیے کھڑے کیے گئے تھے، سب ناچار و بے بس کھڑے رہے اور اپنے شاہ کو بچا نہ سکے۔ فردوسی کا شاہنامہ اور اساطیر سہراب و رستم کی جھنکاریں بھی دیواروں سے چمٹ کر گونجتی رہیں۔ لیکن غزالی کے مزار سے جو پیام و پیغام پھیلا وہ صدائے بازگشت ہو کر آواز سروش بن گئی۔ اس آفاقیت کے باوجود اس کا مزار مجہول الحال ہے۔ ایں چہ بوالعجبیست — بریں عقل و دانش بباید گریست۔

محاسبۂ نفس

"اے نفس ذرا انصاف کر! اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ کھانا تیرے لیے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے۔ کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمانِ الٰہی اور صحف سماوی کا مضمون تیرے لیے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا قیاس و اندازہ، عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی پر تعجب ہے، اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے، تو بغیر دلیل طلب کیے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے۔ کیا انبیاء، علماء، اولیاء اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ، اس کی بیڑیاں، اس کے گرز، اس کا عذاب، اس کا زقوم اور اس کے آنکڑے، اس کے سانپ بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لیے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں۔ یہ عقلمندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں۔"

(احیاء علوم الدین)

نواب صدر یار جنگ کا سفرنامۂ حج

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب علیہ الرحمۃ ایک طرف اگر حیدرآباد میں امورِ مذہبی کے صدر الصدور اور بھیکم پور کے رئیس تھے تو دوسری طرف حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے دست گرفتہ تھے، دنیاوی وجاہت و ثروت کے ساتھ ان کی شان عالمانہ اور دل کا گداز درویشانہ تھا، ان کا سفرنامۂ حج ذوق و تقویٰ کا آئینہ ہے۔ یہ سفرنامہ 'الفوز العظیم' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے چھپ چکا ہے۔ نواب صاحب نے حج بیت اللہ کی سعادت ۱۹۲۶ء میں حاصل کی تھی، اس سفرنامہ کا اختصار ان کی سوانح "صدر یار جنگ" میں بھی ہے جسے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ عالم جلیل مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ نے نواب صاحبؒ کے سفر سے متعلق اپنی ایک یادداشت بھی تحریر فرمائی ہے، جو درج ذیل ہے:

"خیال آتا ہے کہ سفرِ حج کا جب عزم فرمایا گیا تو فقیر کو علی گڑھ طلب کیا گیا، پہنچا حکم ہوا کہ سفر سے روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمان صاحبؒ کے مزار پر انوار پر بھی حاضری کا مقصد ہے جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہنچے یہاں حضرت گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد صاحب تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلوں کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گردے

بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترہ پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شیروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب سے دعا کی درخواست کی اس عجیب وغریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظہ کے نہاں خانہ میں گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا ان کے ساتھ ہم لوگوں کے بھی ہاتھ اٹھ گئے۔"

پھر فرمانے لگے :

"بارالہا! یہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی تیرا ایک بندۂ ناچیز ہے،

بارالہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو تو اس کی مدد فرمائی جائے۔

بارالہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، اور جب گور کے خلوت خانہ میں حبیب الرحمٰن خاں کو لوگ رکھ کر واپس آجائیں، اور غریب وہاں تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال وجواب میں یہ بے چارہ ثابت قدم رہے۔

بارالہا! جب حشر کا میدان قائم ہو اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہوں تو اس بے چارے حبیب الرحمٰن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہوں کو بخش دے اور بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لے جائیں۔

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہ ان کے الفاظ تھے، لیکن بہت سے الفاظ ان کی زبان سے نکلے ہوئے اس میں محفوظ ہیں، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہیں، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، سارا مجمع مجسم گریہ وبکا بنا ہوا تھا، آخر میں فرمایا "اے اللہ! اس غریب پر اس کے حج وزیارت کے سفر کو آسان فرما۔"

مولانا نے ارکانِ حج جس ہمت واستقامت سے ادا کیے اس کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی لکھتے ہیں :

"سفرِ حج میں مکہ معظمہ میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوئی منیٰ اور عرفات میں بھی ان کا

ساتھ رہا مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ باوجود اتنے بڑے رئیس ہونے کے ان کو مذہبی کاموں میں بہت زیادہ باعمل، محنتی اور مشقت برداشت کرنے والا پایا۔

حج کا زمانہ ماہ جون کا تھا، ۲۲ جون کو منیٰ میں وہ کڑی دھوپ میں تمام فرائض نہایت اطمینان اور سکون سے ادا کر رہے تھے، جب کہ لوگ قربانی کے جانور دوسروں سے منگا کر ذبح کرا رہے تھے، اور گرمی کی شدّت کی وجہ سے باہر نکلنے کی ہمّت نہیں کرتے تھے مولانا مرحوم اس وقت اور اس گرمی میں خود ہی انجام دے رہے تھے، ان کی طبیعت میں بے حد خلوص تھا اور شہرت پسندی سے ان کو نفرت تھی۔"[1]

اب نواب صدر یار جنگ کے سفرنامۂ حج "الفوز العظیم" کی تلخیص انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

الاعلام:

"آغاز سفر سے قبل متعدد امور ایسے وقوع پذیر ہوئے جو فال خیر و دال علی الخیر کہے جا سکتے ہیں، میں نشانِ فوز و کامیابی تصوّر کر کے الاعلام کے عنوان سے درج کرتا ہوں۔

رجب المرجب (۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء) میں دار الخیر اجمیر میں حاضر ہو کر عرس شریف کے موقع پر دعائے کامیابی سفر کی گئی۔

ہاں ایک شب ایک گلی سے گزر رہا تھا، ایک گورا چٹا نوجوان بینوا صدا لگا رہا تھا کوئی موٹا آئے گا تو روٹی کھلوائے گا۔" میں نے کچھ نذر کیا، اور آگے بڑھ گیا، بینوا نے بہ آواز بلند کہا: "خواجہ میرا موٹا تو آ گیا۔" یہ آواز دلنواز ہوئی اور میں نے فال خیر سمجھی۔"

" قبل روانگی حضرت پیر و مرشد رضی اللہ عنہ کے آستانۂ فیض کاشانہ پر حاضری ضروری تھی، چنانچہ ۱۰ر شوال المکرم کو شرف حضور حاصل ہوا، ایک دن رات حاضر رہا، ۱۱ر شوال کو بوقت صبح فاتحہ پڑھ کر رخصت ہوا، اب تک قلب پر ایک فیض کی سی کیفیت تھی، جس کا خیال تھا، بعد فاتحہ چلا ہی تھا کہ قلب میں ایک کیفیت بسط پیدا ہوئی، اور

---

[1] جمہور ۳۵

قلب نے وہ لطف محسوس کیا جو بزرگوں کی شفقتِ خاص سے حاصل ہوتا ہے، آنکھیں پُرنم ہوگئیں، دیر تک یہ کیف رہا، دل نے سمجھ لیا کہ بدرقۂ لطف کرم فرما ہے۔

دورانِ حاضری میں مولانا عبدالکریم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر التجائے دعا کی، دعا فرماکر یہ نصیحت کی کہ "میاں بے تعلق ہوکر جاؤ تو لطف ہے، ورنہ منھ اُدھر رہا اور دل اِدھر تو سفر بے نتیجہ ہوگا۔" مکرر یہ ارشاد ذہن نشین فرمایا یہ شعر بار بار پڑھا:

فراغت یافتم از حج و عمرہ　　　چو احرام سرکوئے تو بستم

۱۲ر شوال کو فیض آباد میں مولانا شاہ نیاز احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ پہلی حاضری تھی، کسی نے میرا تعارف کرایا تو فرمایا "پُرانے شاہزادے ہیں" استدعا پر غایت شفقت سے دعا فرمائی، دعا میں یہ الفاظ بھی تھے: "الٰہی! نہایت آرام اور بڑی عزّت سے یہ سفر ہو"۔

"ایام شرکت ریاست میں جن جن شرکا کا کام کیا تھا، ان سے یہ کہہ کر معافی چاہی کہ از خود خیانت نہیں کی تاہم اعتراف بشریت ہے، سب نے بطیب خاطر معافی دی، جزاھم اللہ خیرًا، اسی طرح رعایا و ملازمین سے معافی چاہی، مطالبے ادا کیے، جو نہ ہو سکے ان کے ادا کرنے کی وصیت برخوردار عبدالرحمٰن خاں سلمہ کو کی۔

ایک شرفِ عظیم یہ حاصل ہوا کہ اعلیٰ حضرت نظام نے یہ خدمت سراپا سعادت میرے سپرد فرمائی کہ مسجد نبویؐ اور روضۂ منورہ کی مرمت اور جانمازوں وغیرہ کی تیاری کا تخمینہ کرکے پیش کروں، اس خدمت میں امداد کے لیے میں نے مولوی سید عطا حسین صاحب انجنیر کی ہمراہی کی استدعا کی جو منظور فرمائی گئی۔"

سفر:

"۱۷ر شوال المکرم ۱۳۲۴ھ شنبہ کو بعد نماز عصر حصن حصین کی ادعیہ ماثورہ پڑھ کر حبیب گنج سے روانہ ہوا۔"

"بارہ روز بمبئی میں قیام رہا، موسم خوشگوار، آموں کی بہار، رحمت کا ظہور،

نعمت کا وفور، بلدۃٌ طیبۃٌ و ربٌّ غفور، حیدرآباد کا قافلۂ حجاج بھی آیا ہوا تھا، اختر یار جنگ بھی تھے، وقت بہت اچھا گزرا، شیخ الفضل نے مہربانی سے دعوت بھی کی، بالآخر سمندر کا سفر شروع ہوا :

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

۴ ذی قعدہ روز دوشنبہ کو سہ پہر کے وقت نمازی کمپنی کے جہاز "گرجستان" نامی پر مع الخیر سوار ہوئے، شیران کا کچ میں قیام رہا، گرجستان میں سفر ہوا، جمال وجلال دونوں کے مظاہر گویا جمع تھے، جہاز میں بہترین سیلون اور کمرے قیام کے لیے ملے انتظام اور صفائی بہت اچھی تھی کپتان خلیق اور معقول تھا، حجاج کی آسائش و رعایت کا پورا خیال رکھتا، ساتھ ہی ضبط و آئین کا بھی۔

جہاز پر سوار ہوتے ہی تین شوق بالکل فنا ہو گئے، اخبار بینی، شعر گوئی اور پان خوری، چند روز قبل سے اردو شعر کہنے کا ذوق از خود پیدا ہو گیا تھا بے اختیار شعر موزوں ہوتے، کبھی کبھی بہ یک وقت دو دو غزلیں موزوں ہوتی رہتیں، جو طرح پسند آجاتی، غزل پوری ہو جاتی، سمندر میں پہنچ کر گویا یہ سوتا خشک ہو گیا، اخبار واپسی بمبئی تک دیکھا ہی نہیں، اور نہ دل چاہا، حالانکہ برسوں سے التزام و اہتمام تھا، جو مسافر جہاز کے فرسٹ کلاس میں تھے، ان میں "مؤتمر" اور سیاسیات پر بحث کا بہت ہنگامہ تھا، جو اکثر اوقات برپا رہتا، میری طبیعت بحمدہ بالکل اس سے بیگانہ رہی، ایک بار سے زیادہ مجھ سے شرکت "مؤتمر" کی بابت سوال ہوا اور ہر دفعہ میں نے انکار کیا۔"

"چونکہ اس راستہ میں عدن نہیں آتا، اس لیے سب سے پہلے مبارک سرزمین عرب کا حصہ بیرم جزیرہ دیکھا، کپتان نے پہلے سے اس کے آنے کی خبر دے دی تھی، اس لیے انتظار تھا، جس وقت وہ پاک سرزمین نظر آئی، نگاہ محبت و عقیدت سے دیکھی، قلب میں رقت پیدا ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، گنہگاری یاد آئی، دیر تک دعا و استغفار کا سلسلہ عجز و نیاز کے ساتھ جاری رہا، سرزمین مقدس عرب کی یہ پرتزکیہ تاثیر ہر ہر مقام پر دیکھی۔

"دوشنبہ ۱۸ ذی قعدہ کو ۹ بجے صبح جہاز بندرگاہ جدّہ میں داخل ہوا:

شکر کہ جمّازہ بہ منزل رسید زورقِ امید بہ ساحل رسید

جدّہ کے حمالوں کی دراز دستی اور جھڑک کی دقتوں کا اندیشہ بہت کچھ دلایا گیا تھا، اس لیے خیال تھا، اس کی بندہ نوازی، جہاز کے پہنچنے کے بعد ہی شیخ علی رضا زینل قائم مقام جدّہ، رئیس البلدیہ جدّہ (میونسپلٹی) اور مدیر اخبار ام القریٰ اور ایک صاحب میرے سیلون میں تشریف لائے، ملک الحجاز ابن سعود کی جانب سے خیر مقدم کیا، اور موٹر کشتی میں ہم سب کو سوار کرکے جدّہ بہ آرام پہنچا دیا، قیام کے لیے قصر شریف علی تجویز ہو چکا تھا، یہ شاندار عمارت سمندر کے کنارے پر ہے، جو شریفیہ عہد میں دار الامارۃ تھی، تھوڑی دیر میں بقیہ ہمراہی اور سامان بھی وہاں پہنچ گیا جس دقت کا اندیشہ تھا وہ بفضلہ تعالیٰ خواب میں بھی نظر نہ آئی، اس دن اور شب کو جدّہ میں قیام رہا، ضیافت بھی ابن سعود کی جانب سے تھی، سہ پہر کے وقت قائم مقام جدّہ کے مشورہ کے بموجب ملک الحجاز کو اپنے جدہ پہنچنے کی اطلاع تار کے ذریعہ سے کی اور اخلاقاً حاضری کی اجازت طلب کی، جواب میں پُر عنایت خیر مقدم کا پیام آیا، شام کو انگریزی کونسل سے ملاقات کی۔"

"ایک بار سے زیادہ اس دوران میں رقت آمیز دعا و استغفار کی نوبت آئی، خصوصاً حد حرم میں داخل ہونے کے وقت بمقام جدّہ پورا جوش نیاز و عجز تھا، پیہم دعا و استغفار تھے، اشک رواں تھے، مکہ مکرمہ زادہا اللہ تعالیٰ تشریفاً کے قریب پہنچ کر ساڑھے سات بجے نظر آئے، الحمد للہ حرم شریف میں سات جمعے ادا ہوئے، لاری کے قائد نے اشارہ کرکے کہا: "ھٰذا احرام الحمی" عاجز دل نے محسوس کیا کہ مسافر نوازی فرمائی گئی، اس تصور سے دیر تک ایک کیف رہا دعاؤں کے ورد کے ساتھ عصر کے وقت لاریاں مکہ مکرمہ پہنچیں اور ایک عمر کی تمنا بلکہ حاصل زندگی تمنا فضل ربانی سے بر آئی، زیارت بیت اللہ المکرم و حاضری مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ظہر (قضا) اور عصر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی، طواف، عمرہ و سعی صفا و مروہ سے مشرف ہو کر احرام اُتارا، پیاس تھی، برف کی بالائی

اور تازہ خوبانی ذائقہ نواز و سرمایۂ تسکین ہوئی، الحمد للہ تعالیٰ، قیام ضیافت کا اہتمام منجانب حکومتِ حجاز تھا، حرم شریف سے بالکل متصل "بیت خوفیر" میں قیام ہوا، یہ مکان باب الدُّریبہ کے قریب اور کتاب خانۂ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے آمنے سامنے ہے، عالی شان کئی منزل کی عمارت ہے۔"

"۲۲ ذی قعدہ کی شب کو بعد عشاء ابن سعود سے سقافیہ میں ملاقات ہوئی، حافظ وہبہ مصری آکر حکومت کے موٹر میں لے گئے، سلطان اس وقت حدیث شریف سُن رہے تھے، مجھ کو بہ اصرار اپنے قریب بے تکلف بٹھایا، حدیث شریف کے سماع سے فارغ ہوکر گفتگو کی، ملاقات تو تقریباً ۴۵ منٹ تک رہی مگر باتیں کم ہوئیں، زیادہ حصہ سکوت میں گزرا، دو مرتبہ میں نے اجازت بھی چاہی، مزید نشست پر اصرار کیا، خیر مقدم کے بعد راستے کی خیریت دریافت کی، آسایش قیام کا حال پوچھا، مدینہ طیبہ کے راستے میں موٹر چلنے پر خیالات ظاہر کیے، کہا ابھی محطّات نہیں جہاں سامان ضروری دستیاب ہو، اس لیے تاخیر ہے، عنقریب چلنے لگیں گی۔ حیدر آباد کی آبادی اور پیداوار پر گفتگو کی، ایک موقعہ پر میرے استفسار پر حافظ وہبہ نے (بتایا) کہ سلطان نے ملاقات کے بعد تمھاری نسبت کہا ھو رجل اصیل۔

۸ ذی الحجہ سے قبل منیٰ میں جاکر مکان پسند کیا، اثنائے راہ میں جبل النور معطوف صاحب نے دکھایا، ایک سیدھی بلند چٹان دیدہ افروز تھی، جس کا رنگ اداہٹ لیے محسوس ہوا، اس مبارک چٹان سے گویا نگاہ لپٹ گئی، جب تک سامنا رہا دیکھتا رہا، نظر جم جانے کے بعد بداہتہً ایک اثر اس پہاڑ کے آسمانی بلکہ عرشی تعلق کا قلب محسوس کرتا رہا، جس قدر احساس قوی ہوتا گیا، قلب پر ایک کیفیت بےخودی و وجد بڑھتی گئی، یہ اس امر کی شہادت ہوگی کہ ہنوز نزولِ وحی کے برکات و آثار اس بقعۂ مبارکہ پرفیض بار ہیں:

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشاں ست"

"نماز عصر خیمے میں ادا کی، اس کے بعد جبلِ رحمت کی حاضری سے مشرف ہوا، میرے

ہم نام مولوی لدھیانوی ساتھ لے گئے، مقام ناقۂ نبوی قصوا نامی کے قریب حاضر ہوکر دعار شروع کی، ہاتھ اٹھنے کے بعد دعا کے الفاظ زبان پر آئے تھے کہ قلب میں ایک جوش خضوع پیدا ہوا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، تَرٰىٓ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔ بدن جھک گیا، معاصی کی یاد اور ندامت دل وجسم کو گھلائے دیتی تھیں، گھلاوٹ آنسو بن کر آنکھوں سے رواں تھی، اسی عالم میں دیر تک استغفار و دعار کا سلسلہ جاری رہا، الحمد للہ خضوع وخشوع کا وہ عالم طاری ہوا جو مدۃ العمر کبھی نہ دیکھا تھا، آنسوؤں سے نہ صرف چہرہ اور داڑھی تر ہوئی بلکہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی تر بتر ہوگئیں۔ قال اللّٰہ تعالیٰ :

"تَرٰىٓ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ"

یہ بین دلیل جوش رحمت کی تھی، فالحمد للّٰہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ختم دعار کے بعد قلب نے راحت سکون محسوس کی، جو بنعمتہٖ تعالیٰ دلیل قبول دعا ہوگی، مغرب کا وقت اچھی طرح ہو جانے پر عرفات سے مراجعت ہوئی، روانگی کے وقت چادر شب نے اس وسیع اور متبرک ومقدس میدان کو چھپا لیا تھا، ہزاروں انسان اور اونٹ اس اندھیرے میں رواں تھے، اس وقت مجھ کو ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا، قلب نے محسوس کیا کہ جس قدر میدان انسانوں سے خالی ہوتا جاتا ہے آسمان سے نازل ہونے والے ملائک سے بھرتا جاتا ہے، یہ احساس دم بدم قوت پکڑتا گیا، آنکھیں تو نہ دیکھتی تھیں، باقی تمام کیفیت اسی قدر گروہ کے نزول[1] واجتماع کی قلب محسوس کرتا تھا، یعنی قلب کو احساس قرب عظمت وتقدیس کا تھا، دیر تک یہ کیفیت طاری رہی، مزدلفہ پہنچ کر نماز مغرب وعشار ملا کر پڑھی، رمی جمار کے لیے کنکریاں چنیں، اونٹوں کے حلقے میں زمین پر بستر جمائے گئے، تہامہ کی رات کا سماں دیکھا، اس شب کی خنکی و راحت اور خواب راحت ساری عمر یاد رہے گی :

---

[1] مشاھد الحج وھی مواطن الشریفۃ التی یحضرون الملائکۃ والابرار من الناس۔ (المفردات امام راغب)

سقی اللہ لیلاً لصدغ الکواعب　　　شبے عنبریں موئے مشکیں ذوائب

ظاہرًا ایک عالم تھا، جو عالم سفلی کی کیفیات سے بالاتر تھا، سونے میں سہاگا، چاندنی نے سرور کو پُر نور کر دیا تھا، یارب کریم وہ پُر نور سرور پھر نصیب حبیب فرما، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین،

منیٰ واپس آکر قربانی کی، رمی جمار سے بہ اطمینان فراغت حاصل ہوئی، شب دوازدہم کو منی میں صبح کے قریب میں نے خواب میں دیکھا کوئی کہتا ہے: "یہ حج عدم کا ہے۔" میں نے پوچھا کیا مطلب؟ کہا: "ان کا جو بے تعلق ہے"۔ مولانا عبدالکریم صاحب مرادآبادی کا مقولہ یاد کرو، اللہ پاک اپنے حبیب کریم علیہ افضل التحیہ والتسلیم کے صدقے میں اس زمرے میں مجھ عاجز گنہ گار بندے کو بھی داخل فرما دے، نیز میرے ساتھیوں اور دوسرے مسلمانوں کو۔"

"۲۱ ر ذی الحجہ کے بعد پیچش کی زیادتی ہو گئی، نیچے اُترنا بالکل موقوف ہو گیا، حکیم تفضّل حسین خاں صاحب رامپوری نے نہایت عنایت وہمدردی سے علاج فرمایا۔"

"علالت کے زمانہ میں مولانا الحاج شفیع الدین صاحب (خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے متعدد بار کرم فرما کر مزاج پُرسی کی، ایک بار اس وقت تشریف لائے جب مسہل تجویز ہو چکا تھا، فرمایا، آب زمزم شریف بہ نیت اسہال پیو، پیا، مسہل کامیاب ہوا، سدّے خارج ہو گئے، اب حابسات کا استعمال شروع ہوا، ان دنوں میں تشریف لائے تو فرمایا، اب حبس کی نیت سے زمزم شریف پیو، پیا، نفع عاجل حاصل ہوا۔"

"خفّت مرض کے بعد ارادہ ہوا کہ چندے طائف میں تبدیل آب وہوا کی جائے، قوت آنے پر مدینہ طیبہ کا سفر مبارک ہو، اس ارادہ کی اطلاع ابن سعود کو ہوئی تو براہ عنایت وہاں قیام کا انتظام کر کے مجھ سے کہلا بھیجا کہ تبدیل آب وہوا مناسب ہے فلاں مکان تجویز کر دیا گیا ہے، پانی فلاں کنویں کا استعمال کیا جائے، جب یہ سب کچھ ہو گیا تو قلب کو اس تصور سے وحشت ہوئی کہ مدینہ طیبہ کی حاضری میں مزید

تاخیر ہوگی اور ایک دوسرا سفر حائل قصد ہوتا ہے، اس خیال کے آنے پر طائف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا:

"۴ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ پنجشنبہ روانگی مدینہ طیبہ کے واسطے مقرر ہوئی، شب پنجشنبہ کو شیبی صاحب نے داخلے کا انتظام کر دیا، داخلے کا وقت بعد نماز عشا قرار پایا، قافلوں کے چلے جانے کی وجہ سے پورا سکون وسکوت اس موقعہ پر تھا، شدتِ علالت کے بعد پہلی بار کرسی پر بیٹھ کر اس موقعہ پر نیچے آیا، جوں جوں وقتِ حاضری قریب آتا جاتا تھا، دل پر ہیبت بڑھتی جاتی تھی، عمامہ باندھنے کے وقت اپنی بد اعمالی و گنہگاری یاد کر کے بار بار اندیشہ ہوا کہ کہیں داخلے کے وقت صورت مسخ نہ ہو جائے، فضل وکرم کے سہارے نے دل تھاما خلاصہ، شرف داخلہ و باریابی سے مشرف ہوا، فللّٰہ الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، شیبی صاحب کے بڑے صاحبزادے دروازہ کے قریب اندر بیٹھے تھے، ایک سہ شاخہ اندر روشن تھا، داخلے کے وقت سخت گرمی محسوس ہوئی، نگاہ نیچی کیے ہوئے ادب سے عاجزانہ سیدھا آگے بڑھا، داخلے کی دعا زبان پر برابر جاری تھی، سامنے کی دیوار کے قریب پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھی، یہی وہ مقام ہے، جہاں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی، فالحمد للّٰہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیبا مبارکاً فیہ، بعد نماز دیر تک اہتمام خضوع کے ساتھ دعا کی، استغفار میں زیادہ حصہ گزرا، اور دعائیں بھی کیں، جن میں حضور نظام کے جاہ و اقبال کی بھی تھی، دفعۃً نسیم لطف کا ایک جھونکا آیا جس نے قلب میں ایک زبردست انبساط اور وجد کی کیفیت پیدا کر دی، اس کیفیت نے گویا کایا پلٹ دی، اب اور ہی عالم تھا، دعا میں اور ہی ذوق تھا، اسی عالم کیف میں ایک دعا کے مرتب الفاظ قلب پر گویا القا ہوئے[1]، القا یوں مانتا ہوں کہ نہ ان الفاظ کی طرف میرا خیال تھا، اور نہ کبھی ان الفاظ یا ان کے مشابہ الفاظ میں مدۃ العمر دعا کی، نیز یہ کہ ان الفاظ کے

---

[1] قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من فتح لہ من الدعاء منکم فتحت لہ ابواب الاجابۃ۔ (المصنف لابی بکر بن ابی شیبۃ، کتاب الدعاء۔ باب فی فضل الدعاء)

ذہن میں آتے ہی انبساط و وجد سابق ہیں ایک جوش مواجی پیدا ہوگیا، ہاتھ بے اختیار اپنی پوری وسعت کی حد تک پھیل گئے، جو مبارک و باعظمت دیوار سے دور نہ رہے ہوں گے، خلاصہ خضوع و ذوق کا پورا نقشہ کھنچ گیا، مبارک دعا یہ تھی: "یا کریم! ان ہاتھوں کو مرادوں سے بھر دے" کون سی عبارت یا زبان اس عالم کیف و وجد کا ایک شمہ بھی بیان کر سکتی ہے، جو اس، دعا کے وقت قلب و روح پر طاری تھا، یہ عاجز بندہ گویا مجسم ذوق عبودیت ہو کر یہ الفاظ ادا کر رہا تھا، اور گویا ظاہر و باطن دونوں مل کر زبان دعا بن گئے تھے، سوائے محویت دعا کے نہ کوئی تصور تھا، اور نہ کوئی احساس شروع میں کبھی لفظ مبارک "یا کریم" زبان پر آتا، اور کبھی "یا مولیٰ"۔ جوش عبودیت تھا، اور ان قدسی اثر الفاظ کی تکرار، تکرار تھی، اور جوشِ کیف، مزید کرم فرمایا گیا، جوشِ کیف نے لذت حضور حاصل کی، ادراک ہونے لگا کہ مولائے کریم قریب ہی سُن رہا ہے، اور نہ صرف سُن رہا ہے، بلکہ انداز دعا سے خوش بھی ہو رہا ہے، اس ادراک نے کیف عبودیت کو اور تیز کیا، اللہ پاک بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر یہ عالم رہا، کیا یہ عاجز بندہ اس کو مژدۂ رضا تصور کر سکتا ہے، فالحمد للّٰہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ ثم الحمد للّٰہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ بالآخر جوش، کیف، سکون راحت سے مبدل ہوا، اور جو عاجز گنہگار بندہ مسخ صورت کا اندیشہ لے کر حاضر ہوا تھا، وہ لطف و کرم سے نواختہ دل لے کر رخصت ہوا۔

اے خدا قربان احسانت شوم — ایں چہ احسان ست قربانت شوم

الحمد للّٰہ، ان نقوش کی تحریر کے وقت بھی قلب نے کیفِ رحمت کا احساس کیا، آنکھوں نے اشک بہائے، فالحمد للّٰہ تعالیٰ:

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست"

"دوسرے روز شام کو ارادۂ سفر مبارک تھا، مگر اہتمام کی بعض بے عنوانیوں کی وجہ سے روانگی نہ ہو سکی، جمعہ کی شام کو ہوئی، بے عنوانی عنوان خیر ہو گئی، وہ حرم محترم تھا، جہاں مرادیں ملتی ہیں، خطائیں صواب بن جاتی ہیں، روانگی بجائے شام پنجشبہ

کے جمعہ کی شام ہوئی اس طرح ایک نماز جمعہ اور حرم محترم میں ادا ہو گئی، جلسات جمعے ادا ہوئے، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ مکہ مکرمہ میں (منیٰ اور عرفات ملاکر) ۴۵ دن حاضر رہا، پانچ دن منیٰ اور عرفات میں، پورے چالیس دن مکہ مکرمہ جوار بیت اللہ تعالیٰ میں، اس طرح گویا چلہ (اربعین لیلۃ) پورا ہو گیا، ایک دن کے مزید قیام سے یہ برکت بھی حاصل ہو گئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

کبھی کبھی مسجد الحرام میں ادائے تہجد اور بعد تہجد طواف کا شرف بھی ملا، ایک مرتبہ تہجد کے وقت اوپر سے اترا تو نیچے دروازہ پر ایک معمر درویش پیاس سے بیتاب کھڑے تھے، مجھ سے پانی طلب فرمایا، لاکر پلایا، دعا دی اور کہا کل کے روزے کی نیت کی ہے۔

دوران طواف میں رکن شامی کی دعا میں جب الفاظ یا عزیز یا غفور زبان پر آئے قلب نے قریباً ہمیشہ ایک رقت آمیز کیف محسوس کیا، کیا عجب کہ ذوقِ حضور ہو، فالحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ روایت میں ہے کہ مقام موصوف پر ایک فرشتے دعائے حجاج پر آمین کہنے پر مامور ہیں۔

ایک بار مطاف کی جاروب کشی کی عزت بھی نصیب ہوئی، آغا سے بہ التجا جاروب لی، ایک اشرفی اس سرفرازی کی نذر دی۔"

مدینہ طیبہ کا مبارک سفر:

۳ محرم الحرام کو صبح کے وقت بعد نماز فجر بے فکر کے یہ مصرع موزوں ہو گیا:

خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو

تھوڑے سے خیال میں دوسرا مصرع بھی موزوں ہو کر شعر پورا ہو گیا:

نوید آنکھ کو ہو، تہنیت ہو سینے کو

"گیارہویں منزل بئر درویش تھی، اس کے بعد مدینہ طیبہ میں حاضری کا شرف حاصل ہونے والا تھا، یہیں میری پیچش کی شکایت بھی رفع ہو گئی، درد وغیرہ سب جاتا رہا،

اسی منزل میں مدینہ منورہ سے واپس آنے والا ایک قافلہ ملا، میاں مصطفیٰ علی صاحب علوی کاکوروی نے مدینہ منورہ کے جاں نواز پانی کی ایک صراحی عنایت فرمائی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

دانی چہ بود آبِ حیات دلِ مردہ
یک شربۂ آب از کفِ سقائے مدینہ

(مولانا محمد سعید عظیم آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ)

پہلی مرتبہ یہ روح پرور آبِ حیات نصیب حبیب ہوا، دل نے کہا کہ غریب پروری وعاجز نوازی نے ایک منزل بڑھ کر نوازش فرمائی، فالِ خیر ہے، جس شب کی صبح کو حاضری مدینہ طیبہ ہونے والی تھی، سارے قافلے میں جوشِ مسرّت تھا، غسل کیلئے کپڑے بدلے، عطر لگایا، بدوؤں نے بھی لباس بدلا، حامد میرے جمّال اٹھائیسویں مرتبہ حاضر ہو رہے تھے، تاہم ایسے ہی خوش تھے، جیسے دوسرے نئے حاضر ہونے والے، پچھلی شب سے قافلے والے بیدار ہو کر لباس بدلے ہوئے پاپیادہ چل رہے تھے، میں بھی پیادہ ہولیا، ہمشیرہ صاحبہ نے از راہ شفقت فرمایا: "تھک جاؤگے، سوار ہو لو" میں نے کہا، میں بھی جانتا ہوں، مگر اب سوار ہو کر سفر نہیں کر سکتا، اترنے کے بعد اول نماز تہجد ادا کی جو الحمد للہ پرکیف تھی، اس کے بعد پیادہ چلا اور بقیہ مسافت پیادہ پا طے کی۔

صبح صادق کی روشنی میں مبارک مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے نورانی منارے دیدہ افروز، دل نواز اور جاں پرور ہوئے۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکًا فیہ،

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند" (حافظ)

" بعد نماز حاضر مسجد شریف ہوا، داخلے کی دعا پڑھ کر اول تحیۃ مسجد محراب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ادا کی، پھر روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر درود و سلام عرض کرنے کا شرف

حاصل کیا، زہے سعادت، زہے نصیب حبیب، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ جس نور و سرور کی نوید و تہنیت آغاز سفر سے پہلے نوموزوں شعر میں ملی تھی، اس کا یہ مبارک آغاز تھا، شرفِ حضور کے بعد فرودگاہ پر آیا، یہ مکان حرم شریف سے چند ہاتھ کے فاصلے پر باب رحمت کے متصل تھا، درخیر سے حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی، اس مکان کا نام بیت پشاوری تھا، افغانی نیاز بھی قائم رہا، یہ پنجشنبہ کا بابرکت دن تھا۔"

اس کے بعد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر حاضر ہوا، حاضر ہونے پر امومیت کی نسبت اس قوت سے قلب پر طاری ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی، جوش رقت میں امی امی کی صدا دل و زبان کے ساتھ گویا جسم کا ریشہ ریشہ دے رہا تھا، اور روح محو ذوق تھی، بے شائبۂ تکلف محسوس ہوتا تھا کہ بچے نے مدت دراز کی مفارقت کے بعد شفیق ماں کو دفعۃً پالیا ہے، اور جوش محبت و احساس شفقت سے بیتاب ہو ہو کر امی امی پکار رہا ہے، الفاظ کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ سکتے ہیں، غرض ایک عالم تھا، جو اسی آستانۂ مرحمت کاشانہ کے ساتھ مخصوص تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا عنّی۔ یہ دونوں کیفیتیں اپنی اپنی نوعیت میں عجیب و غریب تھیں، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

"دوشنبہ ۲ صفر المظفر، آج صبح روضۂ مبارک کے خدام، میرے اور سارے عالم کے مخدوم اغوات نے میرے قیام گاہ پر قدم رنجہ فرما کر ضیافتِ چائے قبول فرمائی، مجھکو مشرف و مکرم فرمایا، عجیب باادب اور سلیقہ شعار بزرگ ہیں، کیسے ادب اور قاعدے سے خدمت روضۂ مبارک ادا فرماتے ہیں، جس کو دیکھ کر دل عش عش کرتا ہے، ایک موقعہ پر جب حاجی احمد مرحوم بمبئی کے باخیر سیٹھ نے اپنے مکان میں دعوت میں مجھ کو بھی بلایا تھا، تو آغا سرو شیخ الاغوات صدر نشین تھے، میں پہلو میں قریب حاضر تھا، اثنائے کلام میں میں نے پوچھا کہ کس قدر زمانے سے روضۂ مبارک پر حاضر ہیں، فرمایا ۶۵ برس سے سعادتِ خدمت حاصل ہے، سات برس کی عمر میں حاضر ہو گیا تھا، یہ سُن کر

ممدوح کی طہارت کا اس قدر تصور بندھا کہ مجھ کو اپنا وجود نجس محسوس ہونے لگا اور میں شیخ کے قریب سے علیحدہ ہوگیا، جس طرح طاہر جسم کو نجاست سے بچاتے ہیں۔"

"جمعہ ۱۰ صفر المظفر دوران حاضری مدینہ طیبہ میں عرض درود و سلام کا یہ طریقہ رہا کہ شروع میں تو مزوّر زائرین کے ہمراہ چند بار روضۂ مبارک کے قریب حاضر ہوکر یہ شرف حاصل کیا، لیکن اس کے بعد قریب حاضر ہونے کا قصد ہی نہ ہوتا تھا، نہ جراُت ہوتی تھی، دور سے باادب ایستادہ ہوکر عرض کرلیتا، برابر یہی طریقۂ ادب ملحوظ رہا، اسی اثناء میں ایک موقع پر جناب مدیر حرم شریف نے روضۂ منورہ میں داخلے کی مجھ سے تحریک فرمائی تو میں ہیبت زدہ سا ہوگیا، اور اپنی نااہلی ظاہر کرکے معذرت کی، نماز جماعت میں بھی روضۂ مبارک کی جالی کے قریب کھڑے ہونے کی جراُت نہ ہوئی۔"

"تصور کرو میری اس عزت و شان کا جب میں اس مبارک ہیئت سے منتظر خدمت و حاضری درگاہ ملائک پناہ موقفِ خدمت میں حاضر تھا، دل میں سکون وعجز کی کیفیت تھی، بالآخر خدام کرام حسب قاعدۂ مقررہ غایت ادب کے ساتھ روضۂ اقدس کے باب معلیٰ پر حاضر ہوکر صف بستہ ایستادہ ہوئے، زہے شرف کہ یہ عاجز بندہ بھی اس باشرف صف میں تھا، کلید بردار خادم سب سے آگے ایستادہ تھے، ان کے گلے میں بھاری چاندی کی زنجیریں آویزاں تھیں، جن میں بڑی بڑی کنجیاں تھیں، سب نے اول درود و سلام عرض کیا، پھر بعد استیذان درِ سعادت کھولا، سب خاموش نیچی نظر کے ساتھ آہستہ بدن کو سمیٹے ہوئے داخل ہوئے۔"

"اس کے بعد حضرت سیدۃ النساء فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک کے قریب حاضر ہوکر فاتحہ پڑھی، یوں ہی آہستہ آہستہ درود و سلام پڑھتے خدمت کرتے باہر آ گئے، ادب نے نگاہ کو اتنا قابو میں رکھا کہ باہر آنے پر یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کیا دیکھا، فرطِ ادب سے نگاہ فرش مقدس پر بھی نہ جمی، لہٰذا اس کی ہیئت بھی ذہن میں نہ تھی، باہر آنے پر قلب میں پورا سکون تھا، مفارقت و مہاجرت کا تصور بھی نہ رہا، قلب کو طمانیت حاصل ہوگئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

اللھم صل علیٰ سیدنا محمد وعترتہ بعدد کل معلوم لک ۔"

"عصر کی نماز کے بعد روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر الوداعی درود و سلام عرض کیا گیا، اہل قافلہ صدمۂ مفارقت سے بے چین مصروف آہ و بکا تھے، میرا قلب الحمد للہ تعالیٰ سکینہ حضور محسوس کر کے مطمئن تھا، تصور مفارقت ہی نہ رہا، اور آج تک بھی نہیں ہے، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ بعد نماز عصر قافلہ مع الخیر جدّہ کو روانہ ہوا۔"

"جیب گنج سے روانگی ۷ ارشوال المکرم روز شنبہ کو ہوئی تھی، واپسی ۱۱ ربیع الاول روز شنبہ ہوئی، جملہ ایام سفر مبارک پانچ مہینے :

شکر کر جمازہ بمنزل رسید   زورق امید بہ ساحل رسید"

رویائے عظیمہ

(بلحاظ جلالتِ شان اس مبارک خواب کا مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے)

۲۰ صفر المظفر، روز چہار شنبہ کی مبارک شب کو مراجعت مدینہ طیبہ کے بعد منزل بیر الشیخ اور مستورہ کے درمیان ایک بجے کے وقت میں ایک عظیم الشان رؤیا سے مشرف ہوا۔

بعونہ و نعمتہ تعالیٰ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کشادہ میدان میں برابر برابر دو خس پوش بنگلے بنے ہوئے ہیں، ان کے احاطے جدا جدا ہیں، احاطوں میں درخت نصب ہیں، جن میں بڑے بڑے درخت بڑ کے بھی ہیں، ایک بنگلے میں بطور مہمان حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، عاجز کا قیام ہے، اسی اثنا میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مع ایک رفیق کے میرے قیامگاہ کے بنگلے کے احاطہ میں ورود فرمایا، اس طرح کہ جیسے کوئی کہیں جاتے جاتے مہمان پرسی کے لیے اس کے قیامگاہ پر ہوتا جائے، ایک کمیت گھوڑا میانہ قد، خوب صورت عربی النسل (اس جوڑ بند کا جیسی ایک بچھیری مدینہ شریف میں علی شحّاد مجھ کو دیتے تھے) زین کسا ہوا احاطہ میں کھڑا تھا، حسب ارشاد میں سوار ہوا، اس خیال و یقین کے ساتھ کہ یہ محض مہمان نوازی و غریب پروری ہے، ایک جانب دست راست مبارک سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی باگ پکڑی اور دست چپ سے دوسری

جانب سے دوسرے بزرگ نے جو ذات اقدس سے صورتاً و لباساً اشبہ تھے۔

جسم مبارک دُبلا تھا، ریش مبارک دراز تھی، لباس مبارک اُجلا نہ تھا، دوسری جانب کے بزرگ بھی اسی صورت و لباس کے تھے، دل میں از خود خیال آیا کہ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، یہ خیال برابر دل میں قوت کے ساتھ آتا رہا کہ یہ محض عاجز نوازی اور غریب پروری ہے، میرے قیام کے بنگلے میں رونق افروزی بھی اسی قصد سے فرمائی گئی، ورنہ اصلی مقصد دوسرے بنگلے میں تشریف بری کا ہے، غرض اسی ہیئت مبارک سے گھوڑا احاطہ سے باہر آیا، اور سامنے کے میدان کی جانب چلا، اس وقت بھی یہ خیال آیا کہ دوسرے بنگلے کے قریب کے راستے کو ترک فرما کر میدان کی جانب تشریف فرمائی بھی بخیال مذکورۂ بالا ہے، گھوڑا چلتا تو آہستہ تھا، مگر بڑے بناؤ اور قدیم روش کی چلبلی رفتار سے (جس کی اگلے شہسوار تعلیم دیتے تھے) چاروں ڈنڈے بھاڑتا ہوا کھیلتا رہا تھا، رفتار کے انداز بھی بدلتا جاتا تھا، اور کسی طرح سے قدم ڈالتا تھا، لیکن سب آہستہ۔

دوسرے صاحب گھوڑے کی رفتار کی برابر تعریف فرماتے جاتے اور رفتار کے اقسام کا نام ظاہر فرماتے، مگر میں اس کا مخاطب نہ تھا، تمام راستے میں مجھ سے کوئی کلام نہیں فرمایا گیا، اسی طرح دور تک گھوڑا آگے بڑھا چلا گیا، اس کے بعد دوسرے بنگلے کی جانب مراجعت فرمائی ہوئی، اس اثنا میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے:

"انتظام گڑبڑ ہے، جائزہ دلوا دیا جائے گا۔"

اس کے بعد دوسرے بنگلے میں داخل ہوئے ہیں گھوڑے سے نیچے اتر آیا، اس وقت بھی زبان مبارک اور رفیق مبارک کی زبان پر گھوڑے کی رفتار کی تعریف تھی، اس وقت میں نے رقت آمیز آواز سے عرض کی:

"یا رسول اللہ! میرے فخر کی بھی انتہا نہ رہی۔"

بہ آواز بلند فرمایا: "بے شک" اس کے بعد بنگلے کے اندر قدم رنجہ فرمایا، کمرے میں ایسا سماں تھا جیسے کچہری ہو، حاکم صدر میں کرسی پر تھا، میز سامنے تھی، اہلِ دفتر اور اہلِ معاملہ سے کمرہ بھرا ہوا تھا، حاکم کا چہرہ گورا تھا، مگر میلا، داڑھی منڈھی ہوئی، دونوں جانب صرف قلمیں، سر پر پیلی پگڑی تھی،

گردن جھکائے لکھنے میں مصروف تھا، انگریزی لکھ رہا تھا، قریب پہنچ کر ارشاد فیض بنیاد ہوا، جائزہ دے دو، ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی حاکم معاً قلم ہاتھ سے رکھ کر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد دوسرے کمرے میں، میں تنہا گیا، وہاں بھی یہی سماں تھا، دل میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوا کہ یہ نائب حاکم ہے، وہ نائب بھی مصروفِ تحریر تھا، شکل وصورت بھی وہی تھی، اسی حالت میں اس نے یہ چیز سُنی کہ جائزہ دلوا دیا گیا، اس نے بھی فی الفور قلم روک کر ہاتھ سے رکھ دیا، اس کے بعد آنکھ کھُل گئی، گھڑی دیکھا تو ایک بجا تھا، ہوا سرد چل رہی تھی، چاندنی کا دریائے نور میدان میں موجزن تھا، جلالتِ خواب سے متاثر ہو کر میں فوراً سجدۂ شکر میں گرا، دیر تک حمد باری تعالیٰ کرتا رہا، سر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ سجدہ مدینہ شریف کی جانب ہوا:

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پر گر پڑا بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا"

تعمیر مسجد شریف کا تخمینہ:

یہ بھی آثار سفر مبارک میں سے ایک عظیم الشان اثر ہے، اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ حضور نظام نے مسجد شریف کی تعمیری و عمرانی ضروریات کا تخمینہ کرنے کی خدمت میرے سپرد فرمائی تھی۔

مولوی سید عطا حسین صاحب مہندس ہمراہ گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے کو ہر موقع پر آسان فرمایا، ابن سعود نے کشادہ پیشانی سے اجازت دی، امیر مدینہ طیبہ کو خط امداد کے واسطے لکھ دیا، امیر ممدوح نے جناب مدیر حرم کو مدد کے لیے مامور فرمایا، جملہ مصارف کا تخمینہ نو لاکھ روپے ہوا، اس تخمینے میں ضروری تعمیر، قالین و دری کے مصلے، برقی روشنی، آب رسانی وغیرہ شامل تھے، نیز حرم محترم مکہ مکرمہ کی برقی روشنی، بعد حاضری حیدرآباد یہ تخمینہ بارگاہ خسروی میں پیش کیا گیا، حسب ضابطہ باب حکومت سے رائے طلب فرمائی گئی، وہاں سے صرف ایک لاکھ تیس ہزار کی منظوری کی رائے عرض کی گئی، فنانس نے اس سے بھی کم تجویز کی تھی، باقی رقم کی بابت دونوں جگہ سے اختلاف قوت کے ساتھ کیا گیا، مگر بارگاہ خسروی سے پورے نو لاکھ منظور فرمائے گئے، اللہ تعالیٰ حضور نظام کے جاہ و اقبال میں ترقی بخشے اور یہ خدمت قبول فرمائے، ان کے طفیل میں اس عاجز بندے اور مولوی سید عطا حسین صاحب کو بھی نوازے۔

ایک سعادت یہ بھی ہے کہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے لیے میری سفارش پر حضور نظام نے پچیس ہزار روپیہ کلدار منظور فرمائے۔

عرض درود وسلام کا سلسلہ جاری ہے:

ایک سعادت عظمیٰ یہ بھی للہ الحمد حاصل ہے، کہ عاجز بندے کی جانب سے اب بھی روضۂ منورہ کے حضور میں درود وسلام پیش ہوتا رہتا ہے، میرے ماموں صاحب حاجی عبدالکفیل خانصاحب مقیم مدینہ طیبہ ہیں، از راہ شفقتِ بزرگانہ موصوف اس سعادت سے مجھ کو بہرہ یاب فرماتے رہتے ہیں، ایک قرابت دار کے ذریعہ سے پیشی درود وسلام مزید قوت نیابت رکھتی ہے، ماموں صاحب مدینہ شریف سے ۱۰ رجمادی الآخر ۱۳۴۶ھ کو تحریر فرماتے ہیں:

"آج پچھلی رات کے حصے میں بہ حضوری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھا، خود بخود میرے دل میں یاد آیا بالوکالتہ آپ کی طرف سے نام لے کر ہدیۂ صلوٰۃ وسلام پیش کرکے لکھ بھیجوں، یہ خط لکھا ہوا رکھا تھا، چنانچہ اطلاع کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔"

دوسرا مکتوب:

"خوشخبری سنو! کم وبیش ڈیڑھ مہینے تک حرم شریف میں حاضر نہ ہوسکا، بیماری کی وجہ سے حاضری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت آپ کی یاد خود بخود میرے دل میں پیدا ہوئی، جب ہدیۂ فاتحہ و درود پیش کرچکا آپ کی طرف سے میرے دل میں اشارہ ہوا، سورۂ اخلاص اور پڑھو، چنانچہ تین بار وہ بھی آپ کی طرف سے پڑھی گئی۔"

(۷ رذی الحجہ ۱۳۴۶ھ)

فالحمد للہ تعالیٰ حمداً طیباً کثیراً مبارکاً فیہ۔

تم بالخیر

حبیب الرحمان

حبیب گنج ضلع علی گڑھ، ۱۶ ررمضان المبارک ۱۳۴۶ھ
یوم مبارک جمعہ

ریاض الدین احمد
الٰہ آباد

تسخیر فطرت

"اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰماً وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً ج۔"

(آل عمران۔ ۱۹۱)

"وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔"

اس دور کے ماہرین سائنس اپنی فکر، دماغ کی رسائی اور جسم کی توانائی فطرت کے پوشیدہ رازوں کو کھولنے میں لگا کر حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔ امریکہ کا فضائی طیارہ پائنیر ۱۰ اس راہ کا ایک سنگِ میل ہے۔ یہ اس وقت تمام معلوم سیاروں کے حدود سے باہر اڑ رہا ہے، اور ریڈیائی سگنل زمین پر بھیج رہا ہے۔ یہ خالی از انسان طیارہ اس وقت سورج سے چھ ہزار سات سو (۶،۷۰۰) ملین کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ فاصلہ زمین سے سورج کے فاصلے کے مقابلہ میں ۴۵ گنا زیادہ ہے۔ پائنیر ۱۰ سے قبل بنی نوع انسان کی کوئی تخلیق اس طول طویل فاصلے کو طے نہیں کر پائی تھی، لیکن اس حیرت انگیز پرواز کے باوجود یہ ابھی تک نظام شمسی کی سرحدوں کو چھو نہیں سکا ہے اور نہ وہاں تک پہنچنے کے آثار نمایاں ہیں۔

اس سال امریکہ کے فضائی مرکز ناسا (NASA) National Aeronautics & Space Admins، میں پائنیر ۱۰ کے عبور پلوٹو (PLUTO) کی پانچویں سال گرہ منائی جا رہی ہے۔ اس فضائی طیارے کا وزن ۲۲۵ کیلو گرام ہے، اور دور ترین سیارہ جہاں سے سگنل زمین کے لیے روانہ کیا جاتا ہے اس وقت اتنے فاصلے پر ہے کہ اس کا ریڈیو سگنل نوری رفتار سے چل کر زمین تک

پہنچنے اور طیارے تک واپس جانے میں ۱۲ گھنٹے لیتا ہے۔ یہ طیارہ ۴۸ ہزار (۴۸۰۰۰) کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین سے دور ہوتا جارہا ہے۔ ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ اس طیارے کو سورج کی فضا سے باہر نکلنے میں ایک سے تین سال تک لگ سکتے ہیں۔ باہر نکل کر یہ فضائی گیس اور خلائی ریڈیئشن (cosmic radiation) کی پیمائش براہ راست کر سکے گا۔ یہ کام سطح زمین سے اس لیے ممکن نہیں ہے کہ سیاروں کا سرد خلا راستے میں حائل ہے اور شمسی فضا کا دباؤ سیاروں کے ذرّات کا راستہ تبدیل کر دیتا ہے۔

خیال ہے کہ شمسی فضائیہ کا انحصار لامعلوم شمسی ہوائی لہروں پر ہے۔ شائد یہی تیز رفتار ہوائیں (solar winds) ایٹمی توانائی سے بھرپور ذرّات کو سورج کی سطح پر پھیلادیتی ہیں۔ ماہرین سائنس کا پہلے اندازہ یہ تھا کہ شمسی ہوائیں جوپیٹر (Jupiter) کے محور سے آگے نہیں بڑھ سکیں گی۔ لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا کیونکہ پائنیر اس سے چھ گنا آگے بڑھ چکا ہے، پھر بھی شمسی فضائیہ کا کنارہ ہاتھ نہیں لگ پایا ہے۔ بلکہ ابھی بھی سورج کی فضا کا اتنا دباؤ موجود ہے کہ اس کے کنارے تک پہنچنا ایک خواب پریشاں بن گیا ہے۔ اب تو ماہرین سائنس یہ خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس طیارے کے پاس برقی نیوکلیائی توانائی کا جو خزانہ موجود ہے اور جس کی مدد سے وہ ریڈیائی سگنل روانہ کرتا رہتا ہے وہ شمسی فضائیہ کے دہانے تک پہنچنے سے قبل ختم نہ ہوجائے۔ حالانکہ ناسا (NASA) کے پروجکٹ منیجر رچرڈ فائمل (Richard Fimel) کا دعویٰ ہے کہ یہ ذخیرہ ۱۹۹۰ء تک برابر کام دیتا رہے گا۔ کیا اس وقت تک پائنیر۱۰ سورج کے فضائیہ کو پار کر لے جائے گا، یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ابھی تو سورج کے قریب ترین سیارہ برنارڈ (Barnard) تک پہنچنے میں اسے (۱۰۵۰۰۰) سال درکار ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک مرتبہ جب یہ (Inter steller space) میں داخل ہوگیا تو اب یہ ہمیشہ ہمیشہ چکر لگاتا ہی رہے گا یہاں تک کہ ہمارا نظام شمسی خود ہی معدوم ہوجائے۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ خلائی پروازوں کی تاریخ میں یہ پہلا طیارہ ہے جو فضا کے باہر جاکر تصویریں روانہ کر رہا ہے۔ یہ ۱۹۷۲ء میں فضا میں داخل کیا گیا تھا اور اب جوپیٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے مریخ کی پٹی سے باہر نکل گیا ہے۔ اس کی تحقیقات سے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ جوپیٹر کی سطح رقیق مادوں سے تیار کی گئی ہے۔

درحقیقت پائنیر۱۰ کا اولین مقصد جوپیٹر کے قریب ترین ماحول کا علم حاصل کرنا تھا۔ یہ کام دسمبر ۱۹۷۳ء میں

ہی پورا ہو گیا۔ اس کے بعد ماہرین سائنس نے اس کے لیے ایک نیا پروگرام مرتب کیا جس کا مقصد سورج کی فضائی حالت کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے علاوہ کسی دسویں ستارے کے وجود کا پتہ اور پُرکشش ہواؤں کا پتہ لگانا تھا جس کے بارے میں انسٹائن (ENSTAIN) نے پیش گوئی کی تھی۔ دنیا کے ماہرین سائنسدان ان لہروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں مگر ابھی تک ان کے عملی وجود کا کوئی ثبوت نہیں مل پایا ہے۔ نظریاتی طور پر پُرکشش لہریں طاقتور فضائی اجسام کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہیں جو شاذونادر ہی وجود میں آسکتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوجائے کہ وہ عظیم کہکشاں یا وہ تاریکی مجسم بلیک ہول (Black Hole) آپس میں ٹکرا جائیں تو ایک کائناتی اتھل پتھل وجود میں آجائے گا۔ لیکن بہرحال اب تو پانیر کائنات کی فضا سے اتنا باہر نکل گیا ہے کہ اگر کوئی پُرکشش لہر موجود ہو تو باہر ہی سے اس کا جائزہ لینا اور پیمائش کرنا عین ممکنات سے ہوگا۔

پانیر ۱۰ دسویں ستارے اور پُرکشش لہروں کی کھوج میں لگا ہوا ہے۔ اس کا معاون پانیر ۱۱ سورج کی دوسری جانب مصروف جستجو ہے۔ ان دونوں فضائی طیاروں کے پاس منقش پیغامبر (Graphic Messenger) موجود ہیں جن پر مرد۔ عورت اور نظام شمسی کے طلائی نقوش بنے ہیں، کسی نئی دریافت کے وجود میں آتے ہی وہ پیغامبری کے فرائض ادا کرنے لگیں گے۔

دائرہ جستجو کی حقیقت اور وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان کی ساخت میں یہ غور وفکر عین منشائے قرآن کے مطابق ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو داعیانِ حق اس تلاش میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔؟

"لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝" (سورۃ المومن ـ ۵۷)

"آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔"

USIS Science News
(NIP dated 11, 10, 88)

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیاں

مسلم پرسنل لا کا اجلاس کان پور:

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا نواں عام اجلاس ۴، ۵ مارچ کو صنعتی شہر کان پور کے حلیم مسلم ڈگری کالج کے وسیع میدان میں ہوا، ملک کے تقریبًا تمام صوبوں اور ہر مکتب فکر کی نمائندگی تھی، بورڈ کے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی مدظلہ کے علاوہ نائبین صدر میں سے مولانا ابو اللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا ابو سعود صاحب امیر شریعت کرناٹک، ڈاکٹر سید کلب صادق مجتہد شریک اجلاس ہوئے۔ ڈاکٹر عبد الحفیظ صاحب سلفی خرابی صحت کی بنیاد پر شریک نہ ہو سکے، بورڈ کے سرگرم اور فعال سکریٹری جنرل مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی اپنے رفقاء مولانا سید نظام الدین صاحب ناظم امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے ساتھ شریک ہوئے، دیگر اہم شرکاء میں مولانا عبد الکریم (ناگپور) مولانا عبد الجلیل صاحب چودھری (آسام) جناب عبد الستار شیخ صاحب سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ (بمبئی) جناب عبد الرحیم قریشی صاحب (حیدرآباد) جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب (لکھنؤ) جناب سلیمان سکندر صاحب (تعمیر ملت حیدرآباد) مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی (ندوۃ العلماء، لکھنؤ) اور میر واعظ مولوی محمد فاروق صاحب (کشمیر) کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اجلاس کی کارروائیاں دو روز تک جاری رہیں، خصوصی نشستوں کے علاوہ جو بورڈ کے ارکان اور خصوصی مدعوئین پر مشتمل ہوتی تھیں۔ دو عام اجلاس ہوئے، ان میں سے ایک خواتین کے لیے مخصوص تھا اور اس میں خطاب بھی خواتین ہی نے کیا، حلیم مسلم ڈگری کالج کے وسیع سبزہ زار پر اجلاس عام میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے مولانا مجاہد الاسلام صاحب نے کہا کہ: "مسلمانوں کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ اسلام کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے اور ایک اچھا اور خلق خدا کے لیے

مفید شہری بننے کے لیے اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا چاہتے ہیں، یا اس سازش کا شکار ہونا چاہتے ہیں جو ان کے ملی تشخص کو مٹانے کے لیے منصوبہ بند طریقہ پر پوری ہوشیاری کے ساتھ کی جارہی ہے۔" انھوں نے کہا کہ: "اگر مسلمان ہندوستان میں عزت کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے نفس کی قربانی دینی ہوگی اور اپنے ملی شیرازہ کو برقرار رکھنا ہوگا، برادری اور گروہ بندی کی عصبیت سے کنارہ کش ہونا پڑے گا، ایک دوسرے سے جڑ کر اپنی اجتماعی وحدت و طاقت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔" انھوں نے کہا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے جس میں مختلف مسلک اور مکتب فکر کے افراد شریک ہیں، اس کے مشن کو کامیاب بنانے کی کاوش ہر مسلمان کو کرنا چاہیے۔

قاضیٔ شریعت مولانا مجاہد الاسلام صاحب نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ: "وہ اس بات کا عہد کریں کہ وہ شریعت محمدی سے روگردانی نہیں کریں گے اور اس کے تحفظ کے لیے قرآن و سنت کے احکام پر عمل پیرا ہوں گے۔ مولانا نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، ان کا مہر اور ان کا نان نفقہ بخوشی ادا کرنے، جہیز کی لعنت اور غیر شرعی رسوم سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی تلقین کی۔

ڈاکٹر سید کلب صادق مجتہد نے اپنی مرصع تقریر میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی کارکردگی کی تحسین کی اور کہا ہم اس کے شکر گزار ہیں کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے مسائل حکومت کے سامنے بہتر طریقے سے پیش کیے جاتے ہیں، انھوں نے کہا: "ہم اپنے اوپر یکساں سول کوڈ کبھی نافذ نہیں ہونے دیں گے، خواہ وہ اختیاری ہی کیوں نہ ہو، ہم اپنے ملی تشخص کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور ہندوستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا قانونی حق ہے۔" میر واعظ مولوی محمد فاروق نے کہا کہ ہم تن من سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتھ ہیں، کیونکہ شریعت محمدی کے تحفظ اور مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لیے ہمارا یہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے، اور بورڈ نے قابل قدر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

بورڈ کے خازن مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے پریس کانفرنس کے دوران اخبار نویسوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یکساں سول کوڈ مسلمانانِ ہند کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے آئین نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوستان میں رہائش پذیر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے پرسنل لا پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دے رکھی ہے، یکساں سول کوڈ کا نفاذ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں پر قابلِ عمل نہ ہوگا بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی مزاحمت کریں گے اور

انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ حکومت سول کوڈ کا سودا اپنے دماغ سے نکال دے۔ مولانا پاریکھ نے کہا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے، بورڈ نہ صرف مسلمانوں کے شرعی قانون کے تحفظ کے لیے حکومت پر زور دیتا رہتا ہے، بلکہ وہ خود مسلمانوں کے اندر سدھار اور اصلاح اور ان میں رائج غیر شرعی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں متعدد اہم تجویزیں منظور ہوئی ہیں ایک تجویز میں کہا گیا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ سے مسلم پرسنل لا کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے دستور میں ترمیم کرائی جائے، اس مقصد کے لیے بورڈ کا ایک موقر وفد وزیر اعظم ہند سے ملے۔ یونی فارم سول کوڈ کے بارے میں بورڈ نے اپنی قرار داد میں کہا ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر مذہبی اور کثیر تہذیبی ملک میں قومی اتحاد کے بہانے مذہبی تشخص، ملی امتیاز اور تہذیبی شناخت کو مٹانے کی کوئی بھی کوشش انتشار اور بحران پیدا کرے گی، جس سے قومی یک جہتی کے جذبات فروغ پانے کے بجائے ایسی فضا پیدا ہوگی جس سے ملک کی قوت اور سالمیت کو نقصان پہنچے گا، چنانچہ بورڈ نے طے کیا ہے کہ یونی فارم سول کوڈ کے خلاف ملک کی رائے عامہ ہموار کی جائے۔ اس ضمن میں سیاسی جماعتوں سے رابطہ پیدا کیا جائے۔

ایک دوسری اہم تجویز اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں منظور کی گئی ہے، جس کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا کہ "مسلمانوں کی زندگی کو اسلام کے بتائے ہوئے طریق کار پر لانے کے لیے غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف مہم چلائی جائے، ان رسوم کے خاتمے اور معاشرتی اصلاح کے لیے مسلم خواتین میں بھی بیداری پیدا کی جائے۔ اسلام میں خواتین کے مرتبہ و مقام کو واضح کیا جائے اور اس سلسلہ میں موجود غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، جس کے لیے "سالِ خواتین" کے زیرِ عنوان پورے ملک میں تحریک چلائی جائے، سمینار، سمپوزیم، اجتماعات، کتابوں، کتابچوں اور دیگر ذرائع سے مسلم خواتین کے مقام کو اُجاگر کیا جائے، غلط رسوم و رواج خصوصاً جہیز کے خلاف فضا بنائی جائے۔"

اجلاس کے آخری دن خواتین کا ایک خصوصی اجلاس ہوا، جس میں تقریریں بھی خواتین ہی نے کیں، بعض اہلِ نظر کا کہنا ہے کہ نظم و ضبط، حاضری اور مقصدی تقریروں کے اعتبار سے خواتین کا اجلاس بہت کامیاب رہا، لکھنؤ کی ڈاکٹر عزیز جہاں (بیگم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی) نے جن کی صدارت میں جلسہ ہوا،

اپنی تقریر میں کہا کہ لوگ اسلام کی حقانیت اور دل آویزی سے خوفزدہ ہیں اور وہ مسلم خواتین کو گمراہ کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں صرف وہی خواتین آسکتی ہیں جو اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں انھوں نے زور دے کر کہا دنیا کی کوئی تہذیب عورت کو وہ مقام نہ دے سکی جو اسلام نے عطا کیا ہے۔

شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی پروفیسر ڈاکٹر رؤفہ اقبال صاحبہ نے اپنی تقریر میں کہا "اسلام ہمارے لیے ایک مکمل نظامِ حیات ہے، مسلم پرسنل لا سے ہمارا تعلق گوشت اور خون کا ہے، وہ ہمارے ایمان کا ایک حصہ ہے، جس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی یا مداخلت ہم مسلم خواتین برداشت نہیں کریں گی"۔ بمبئی کی بشریٰ عابدی صاحبہ نے اپنی تقریر میں کہا "یورپ کی عورت آج خود ہمارے (مسلم خواتین کے) مقام کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سوا کسی اور قانون میں عورت کے دُکھوں کا مداوا نہیں ہے، ڈنمارک میں جہاں دیگر ممالک کے مقابل عورتوں کو زیادہ آزادی حاصل ہے وہاں عورتوں کی خودکشی کے واقعات کی شرح بھی زیادہ ہے۔

اجلاس کو کامیاب بنانے اور مسلمانوں کو راحت پہنچانے میں مجلس استقبالیہ کے صدر جناب ڈاکٹر نعیم حامد صاحب، مولانا مظفرالحق صاحب ندوی اور ان کے دیگر رفقا نے اپنی بھر کوشش کی۔ یہ لوگ مسلمانانِ کان پور، اور عام مسلمانوں کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ادیان و مذاہب کی ڈائرکٹری :

مسلم نوجوانوں کی عالمی تنظیم الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی نے "الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاھب المعاصرۃ" کے نام سے ایک ڈائرکٹری تیار کی ہے جو عربی زبان میں ریاض سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں دنیا کے مختلف گوشوں میں پائے جانے والے ادیان و مذاہب اور تحریکات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ سب سے پہلے ہر مذہب کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے جس سے اس مذہب یا تحریک کے خط و خال نمایاں ہو جائیں اس کے بعد اس کی اہم شخصیتوں کا تذکرہ ہے، جنھوں نے اس کو قائم کرنے اور فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی ضمن میں اس کے قیام کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے نمبر پر جن افکار و معتقدات پر اس مذہب

یا تحریک کی بنیاد ہے ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اس مکتب فکر کی مرکزی اور بنیادی کتابوں کا تذکرہ ہے، اس کے اصول ونظریات کا بیان ہے، اور اس میں قابل گرفت کوئی چیز ہے تو اس کی نشان دہی کی گئی ہے، اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کوئی نیا نظریہ یا مکتب فکر ہے، یا ماضی کے کسی نظریے یا مکتب فکر سے متاثر اور اس کا خوشہ چیں ہے، اور اس میں ترمیم واضافہ کرکے اسے ایک نئے مذہب یا نظریہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، اس کے ماننے والے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، ان کی تعداد کیا ہے؟ کس ملک میں اس کا اثر و رسوخ زیادہ ہے، اور اس میں لوگوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کتنی صلاحیت ہے ان امور کا ذکر ہے، سب سے اخیر میں اس موضوع پر تصنیف شدہ کتابوں کا تذکرہ ہے تاکہ جو لوگ اس مذہب، نظریہ یا تحریک کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ان کتابوں سے رجوع کریں۔ البلاغ کویت کے بیان کے مطابق کتاب کا انداز موضوعی ہے، مثبت انداز میں ہر تحریک، پارٹی اور نظریہ کے بارے میں یکجا طور پر معلومات فراہم کردی گئی ہیں، اس کے بارے میں فیصلہ کہ وہ حق ہے یا باطل ہے، قابلِ اخذ وتقلید ہے یا لائق ترک واجتناب ہے قاری کے صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

کتاب میں جن مذاہب، نظریات اور تحریکات کا ذکر ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

الاخوان المسلمون، استشراق، اسماعیلیہ، اباضیہ، بابیہ، بہائیہ، بریلویت، امریکہ کے بلالی، بودھ مت، جماعت اسلامی، جماعت تبلیغ، دارونزم، دروزی، سرمایہ داری، کیمونزم، روٹری لائنز، زیدیہ، سلفیت، سکھ مذہب، شیعہ امامیہ، صیہونیت، تصوف اور صوفیہ، سیکولرزم، فرائڈزم، قادیانیت، قرامطہ، عرب قومیت، مارونی، ماسونیت، مہارشیت، نصرانیت، نصیری فرقہ، نورسیہ، وجودیت، یزیدیہ، ہندومت اور یہودیت۔

ندوہ عالمیہ للشباب الاسلامی نے افکار و مذاہب سے متعلق یہ کتاب شائع کرکے گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ مسلم نوجوانوں کے لیے ان تحریکات ونظریات سے واقفیت ازبس ضروری ہے تاکہ وہ کسی غلط نظریہ یا ازم کے دام تزویر میں نہ آئیں۔

ماہنامہ

ذکر و فکر

دہلی

جلد: (۶) ــــــــــــ ماہ شوال ۱۴۰۹ھ

شمارہ: (۲) ــــــــــــ ماہ جون ۱۹۸۹ء

ترتیب

افتتاحیہ، مقالات، جائزے، تحقیقات اور ادبیات

۱۔ مذاکرات	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲
۲۔ عہد قدیم کے معجزہ ہائے ہنر	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۱۰
۳۔ قرآن اور فہم سلیمان	پروفیسر سید سلمان ندوی	۱۴
۴۔ عربی زبان میں جدیدیت کا رجحان	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲۳
۵۔ امیر عبدالکریم خطابی	مولانا نذر الحفیظ ندوی	۳۶
۶۔ معارف مسجد قرطبہ	خالد جاوید شمسی	۴۵
۷۔ عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں	ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی	۵۱

مولانا عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

گزشتہ فروری (سنہ ۱۹۸۹ء) کے آخر میں راقم کو مورشس، کیپ ٹاؤن، اور ڈربن کی سیاحت کا موقع ملا، مقصد سفر ایک دینی کام تھا، جو رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے انجام دینا تھا۔

مورشس بحر ہند میں جنوبی افریقہ کے مغرب کی جانب ایک جزیرہ ہے، جو آزادی سے پہلے فرنچ کالونی تھا، یہاں کی معاشرت یورپین ہے اور سرکاری زبان فرنچ ہے، چند پشت پہلے ہندوستان (برصغیر غیر منقسم) سے جو مزدور اور کاروباری لوگ آکر آباد ہو گئے تھے آج ان کی اولاد یہاں حکمراں ہے، آبادی ایک ملین بتائی جاتی ہے جس میں بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے۔ یورپین ۱۹ فیصد، مسلمان ۱۵ فیصد، اور چینی تین فیصد ہیں۔ یہ شہر ہندوستان سے دور ہے مگر ہندوستان ہی کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ خاص بات یہ نظر آئی کہ یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی نہیں ہے، مسلمان اپنے شعائر آزادی سے انجام دیتے ہیں، گائے کے ذبیحہ پر کوئی پابندی نہیں ہے، غرض یہاں کی اندرونی سیاست منافرت کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ مل جل کر ملک کو ترقی دینے اور اپنے جزیرہ کو خوب صورت بنانے، عوام کی ضروریات پوری کرنے کی بنیاد پر وحدت قائم ہے۔ یہ بات ہمارے برصغیر (ہندو پاک) کے لیے قابلِ رشک ہے، کیونکہ یہاں کی سیاست صرف نفرت کی پرورش اور اس کے استحصال پر قائم ہے۔

یہاں کے باشندوں کی اکثریت فرنچ کے بعد جو زبان بولتی اور سمجھتی ہے، اس کا نام جو بھی ہو مگر عملاً اردو ہے۔ فرنچ۔ اردو ڈکشنری بھی مرتب ہو چکی ہے، وزارت تعلیم کے ماتحت ایک اردو بورڈ بھی ہے۔

اس سفر میں مجھے ایک نئے دوست ملے، اصلاً تو شائد گجرات کے ہوں گے کیونکہ زیادہ آبادی انہی لوگوں کی ہے، ان کا نام گل حمید بیگن ہے، ان کے ذریعہ اردو کے ایک اور حامی احمد عبداللہ صاحب سے ملاقات ہوئی مسلمانوں کے حلقوں میں ہندوستان، پاکستان کی چھپی ہوئی کتابیں رائج ہیں۔ ذکر و فکر کا بھی ایک حلقۂ اشاعت قائم ہو گیا ہے، اگرچہ ایک صاحب نے انتہائی سادگی کے ساتھ یہ تبصرہ کیا:

"اس کی اردو بہت گاڑھی ہے، ذرا کچّی زبان لکھو تو میگزین اچھا چلے گا۔"

موریشس میں مسلمان اپنی ہندی و پاکستانی خصوصیات و روایات کے ساتھ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا بھی ہے جن کے رہنما سال میں ایک یا دو بار دورہ کرتے ہیں، ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ "سب کافر ہیں اور جو ان کو کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر ہے۔"

موریشس یوں تو چھوٹا سا ملک ہے، ملک کیا ایک شہر ہے، جس کا ایک محلہ پورٹ لوئیس دارالحکومت ہے، مگر جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے یہ مکمل آزاد ملک ہے جیسے خلیج میں کویت اور بحرین ہے، ۵ا وزرار کی کابینہ ہے۔ ہر مذہب کا ایک ایک سنٹر حکومت کی سرپرستی میں قائم ہے۔ مسلمانوں کا سنٹر (سنٹر اسلامیکا) کی عمارت معمولی ہے، حکومت نے اس کے لیے ایک زمین الاٹ کی ہے، جہاں رابطہ کے تعاون سے عمارت بنانے کا منصوبہ ہے، رابطہ کا بھی دفتر ہے جس کے ماتحت ایک لکچر ہال اور ایک مسلم ہائی اسکول قائم ہے، ایک اور اچھی بات نظر آئی کہ معمّر لوگوں کی دیکھ بھال اور لاوارث، یا معذور بچوں کی پرورش کا کام حکومت نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، دوسرے اہلِ خیر بھی تعاون کرتے ہیں، یہ بات یورپ میں عام ہے، ہندوستان پاکستان میں تو کوئی اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

موریشس کے بعد مجھے کیپ ٹاؤن جانا تھا، اور راستہ جوہنسبرگ سے ہو کر طے کرنا تھا، جوہنسبرگ شہر اور شہریت کے اعتبار سے یورپ کا ایک شہر معلوم ہوتا ہے، پرشکوہ عمارتیں، کشادہ سڑکیں، سجی سجائی دکانیں، ہر جگہ مشینوں اور کمپیوٹر کی حکومت، بلکہ یوں کہیے آدمی کم مشینیں زیادہ۔ یہاں رابطہ کا عالیشان دفتر اور نورالاسلام نامی اسلامی مرکز ہے، ہمارے میزبان رابطہ عالم اسلامی کے دفتر کے نگراں تھے، استقبال سے لے کر وداع تک ساتھ ساتھ رہے، پروگرام کچھ اس طرح کا بنایا کہ مجھے سوائے شہر اور چند مسجدوں کے کچھ اور دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ اسی شہر میں مولانا ابراہیم میاں اور ان کا بہت بڑا اسلامی مرکز بھی ہے جس کو نہ دیکھنے کا ایسا افسوس ہوا جیسے کسی سیاح کو آگرہ آکر تاج محل نہ دیکھنے کا افسوس رہ جائے۔

ایک مسجد کا حال سنیے، افریقہ کے اصل سیاہ فام باشندوں کی آبادی میں بنائی گئی ہے، مسجد خوب صورت ہے، اعلیٰ درجے کی قالینیں بچھی ہیں، جھاڑ فانوس، پردے اور منبر سب ہی

حسین ہیں مگر عصر کی نماز میں نمازیوں کی تعداد صرف چھ تھی۔ برخلاف اس کے کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد دیکھی جو انہی افریقی مسلمانوں کی آبادی میں ہے، کچی سڑکیں، ایک منزلہ اور بہت معمولی مکانات، ان کے درمیان ایک دالان ہے جس کی دیواریں پلائی بوٹ کی ہیں، چٹائی کی صفیں، اس پر میلی چادریں اور بوسیدہ جاے نمازیں مگر نمازیوں کی کثرت تھی، لوگ باہر گلیوں تک بھرے تھے۔ ان دونوں مسجدوں کے درمیان نمایاں فرق نظر آیا۔ جوہنسبرگ میں سب کچھ تھا نمازی نہ تھے، یہاں کچھ نہیں ہے مگر نمازی ہیں۔ اس مسجد میں اخلاص وصداقت کی نورانیت تھی جتنی دیر ٹھہرے اُنس اور اپنائیت کا احساس قائم رہا۔

کیپ ٹاؤن دراصل ہمارے سفر کی پہلی منزل تھی اور آخری بھی، یہاں ایرپورٹ پر اترتے ہی زبان پر یہ شعر آیا:

قالوا خراسان اقصیٰ ما یراد بنا
ثم القفول، فقد جئنا خراسانا

استقبال کرنے والوں میں سب سے پہلے ایک جانی پہچانی مانوس و مونس صورت مولوی علی آدم ندوی، کی نظر آئی، محسوس ہوا کہ سفر کی آدھی تکان ان کو دیکھتے ہی ختم ہو گئی، اور جو کچھ باقی رہ گئی تھی وہ میرے میزبان فاضل ایڈوکیٹ احمد چوہان صاحب کے اخلاق و میزبانی نے اتار دی، یہاں آکر محسوس ہوا جیسے اپنے گھر آ گئے۔

دوسرے نئے چہروں میں نظم صاحب تھے جو دارالقضاء الاسلامی کے سربراہ ہیں، ان کے قدو قامت اور طلاقت کے ساتھ عربی بولتے ہوئے دیکھ کر خیال ہوا کہ کوئی مصری فاضل ہیں، معلوم ہوا کہ اصلاً ونسلاً گجراتی ہیں، مکہ مکرمہ میں نوعمری کا زمانہ گزارا ہے، اور ابتدائی تعلیم مکہ مکرمہ کے مدارس میں حاصل کی ہے۔ احمد چوہان صاحب کا تعارف لکھنؤ ہی میں پروفیسر سید حبیب الحق ندوی نے کرایا تھا، اور ان کو اطلاع دے دی تھی، اور برابر ٹیلیفون سے مجھے ہدایت کرتے رہے کہ کہیں اور نہ ٹھہرنا، احمد میاں ان کے شاگرد بھی ہیں اور دوست بھی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ مجھے اپنے کام کے سلسلہ میں جن سے زیادہ سے زیادہ مدد مل سکتی ہے وہ یہی صاحب ہیں، اور یہاں کے اہلِ تعلق نے بھی میرا قیام ان کے یہاں تجویز کیا تھا۔

مولوی علی آدم کئی سال تک مخدوم و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہٗ کی خدمت میں رہ چکے ہیں، یہاں کے دو اسکول لڑکوں اور لڑکیوں کے ان کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ حبیبہ کالج یا مؤسسہ حبیبہ ابتدائی، ثانوی تعلیم کا مرکز ہے جس کے ماتحت متعدد مدرسے چل رہے ہیں۔ علی آدم صاحب احمد چوہان صاحب، نظم صاحب ان تمام احباب نے میرے دورہ کو بھی کارآمد بنایا اور میزبانی بھی ایسی کی جس کی یاد باقی رہے گی، کیپ ٹاؤن میں جوہنسبرگ کی طرح مقید نہیں رہا، تقریباً تمام ہی مراکز دیکھے، مسجدیں دیکھیں، احباب نے یکے با دیگرے پرتکلف دعوتیں کیں۔

کیپ ٹاؤن کو افریقہ کے نقشہ میں دیکھیے جنوب کا آخری حصہ ہے جس کے بعد چاروں طرف سمندر ہے، احباب نے اس مقام کی سیر کرائی جہاں ایک منزل تک کاروں سے گئے، وہاں سے انتظامیہ کی بس پر اوپر گئے، اس کے بعد بھی دس سیڑھیاں اوپر جاکر اس کنارے پر کھڑے ہوگئے جس کے بائیں جانب بحر ہند ہے اور دائیں جانب بحر اٹلانٹک ہے اس کے بیچوں بیچ ایک سفید شعاعی دھارا ہے جو دونوں سمندروں کے درمیان حد فاصل ہے۔

مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لايبغيان کا عینی شاہدہ بتا رہا تھا کہ آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے ایک اُمّی کو (کروڑوں دانشوروں اور فلسفیوں کے سر جس کی خاکِ پا پر قربان ہوں) کس نے یہ منظر دکھایا تھا؟ ـ جو بدبیں و بدبخت قرآن حکیم کے اعجاز پر زبانِ جہل دراز کرتے ہیں ان کی نگاہوں سے یہ معجزہ بھی پوشیدہ ہے۔ سچ ہے معبودِ حقیقی کا یہ ارشاد کہ اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں کے اندر ہیں وہ محروم بصارت ہوجاتے ہیں:

"فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور"۔ (الحج ۴۶)

جنوبی افریقہ میں حکمرانی گوروں کی ہے، وہی یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں، اصلی باشندے اب سر اٹھا رہے ہیں اور آزادی کی تحریک قوت پکڑ رہی ہے، گزشتہ دس سال کے اندر کافی تبدیلی آئی ہے، بعض علاقے جہاں گوروں کے علاوہ کوئی نہیں جا سکتا تھا وہاں سے گزرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ کبوتروں اور کوؤں کے درمیان صرف رنگ ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مخلوق اور پرند ہونے میں بھی ایک دوسرے سے جدا اور علیٰحدہ علیٰحدہ مخلوق ہیں۔

ایک آبادی برصغیر سے جانے والوں کی ہے جن کو انڈین کہا جاتا ہے۔ آبادی کی دوسری قسم ملیزیا، انڈونیشیا سے ترک وطن کر کے آنے والوں کی ہے، اور ان لوگوں کی ہے جن کو ڈچ حکومت عمر قید کی سزا دے کر یہاں بھیج دیتی تھی ان کی اولادیں Malays (ملون) کہلاتے ہیں۔ ہر ایک کی پارلیمنٹ علیحدہ، اسکول، کالج، ہوسٹل علیحدہ۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی دینی شناخت قائم رکھی ہے، گجرات کے مسلمان تاجر خوش حال ہیں۔ آئندہ دس سال کے اندر انقلاب کی پیشین گوئی حالات کا رُخ جاننے والے کر رہے ہیں، مظلوم اہل وطن کو دنیا کے تمام انصاف پسند عوام کی حمایت حاصل ہے۔

کیپ ٹاؤن میں طلبہ اور طالبات اور اساتذہ سے خطاب کی سعادت حاصل ہوئی میری آمد کے ۳ روز بعد مولانا قطب الدین ندوی کسی بیرونی سفر سے واپس آئے۔ شہر کے مقبول عالم اور کوکنی برادری کے رہنما ہیں۔ جمعہ کے روز خطبہ سے پہلے ان کا وعظ ہوتا ہے۔ اخلاص و احترام کے الفاظ میں انھوں نے مسافر کا تعارف کرایا اور دس پندرہ منٹ اردو میں کچھ دینی باتیں کرنے کا موقع ملا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ پوری مسجد بھری ہوئی تھی اور سب اردو سمجھ رہے تھے، البتہ اسکولوں میں انگریزی ہی ذریعہ گفتگو تھی، یہاں کی عام زبان انگریزی ہے لیکن لہجہ اور ایکسنٹ ہندوستانی ہے، اس لیے ان کی باتیں سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے میں وہ دشواری نہیں ہوتی جو لندن اور امریکہ میں ہوتی ہے۔

کیپ ٹاؤن میں میری مہم جس کے لیے یہ سفر کیا تھا ختم ہو گئی، واپسی کا پروگرام میرا ذاتی تھا اور اس کے محرک ہمارے فاضل دوست پروفیسر سید حبیب الحق ندوی تھے، ڈربن موصوف کی دعوت پر حاضری ہوئی، سید حبیب الحق صاحب ندوی باڑھ (بہار) کے رؤسا اور زمینداروں کے ایک گھرانے کے فرزند ہیں، ندوہ میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد پٹنہ، علی گڑھ سے انگریزی ڈگریاں حاصل کرتے ہوئے وہاں سے پاکستان چلے گئے، بلکہ یوں کہیے حالات نے ان کو پاکستان کی گود میں پھینک دیا۔ اس کے بعد دنیا کی سب سے بڑی نامور یونیورسٹی ہارورڈ سے پی ایچ۔ ڈی کیا۔ کچھ عرصہ کراچی یونیورسٹی میں لکچرر رہے، اور اب ڈربن یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو کے شعبہ کے صدر ہیں۔ ان کی مہمان نوازی، پذیرائی، مسافر نوازی اور سیر چشمی نے روایات کہن کو زندہ کر دیا۔ میرے آنے سے پہلے میرے لکچر کا اعلان کر چکے تھے، دعوت نامے جاری ہو چکے تھے، محاضرہ کا موضوع 'عربی کی لسانیاتی اہمیت' تھا۔ اس سے ایک دن پہلے افریقی نوجوانوں کا ایک کیمپ دیکھا، وہاں میرے اندر خود یہ داعیہ پیدا ہوا کہ ان سے کچھ کہوں اور بتاؤں

کہ اسلام اور صرف اسلام ہے جو عقیدہ کی بنیاد پر انسان کو جانچتا اور تولتا ہے، تم مسلمانوں کے امام بن سکتے ہو، ان کی سربراہی کر سکتے ہو، تم پہلے دن سے مسلم برادری کے فرزند ہو گئے ہو، اور جن افریقیوں نے مسیحیت قبول کیا ہے وہ آج بھی ایک علیٰحدہ مخلوق ہیں، ان کے چرچ الگ اور ان کی عبادت تک الگ ہے گویا کالوں کا خدا اور گوروں کا خدا الگ الگ ہے۔ صرف اسلام خدائے واحد کا تصوّر دیتا ہے۔

ڈربن میں ڈاکٹر سید سلمان ندوی سے ملنے کا اشتیاق تھا اور ارادہ تھا کہ ان سے جا کر ملوں گا، میرے مخدوم زادہ ہیں اور استاد زادہ بھی۔ اس یونیورسٹی میں وہ اسلامیات کے پروفیسر اور شعبہ کے صدر ہیں، مگر انہوں نے خود پہل کی اور میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ سادہ کرتے پاجامے میں، دو پلی ٹوپی اس انداز کی دیکھی جس سے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہو گئی عزیزانہ اخلاص سے ملے، اپنے دولت کدہ پر دعوت کا اہتمام کیا، اور یونیورسٹی کے لکچر میں شریک رہے اور موضوع سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سید سلمان صاحب یہاں قرآن کریم کا درس بھی دیتے ہیں اور یہاں کی جمعیت علماء سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ میرا تعارف اس حلقہ سے موصوف ہی نے کرایا۔

سید حبیب الحق صاحب ندوی نے ایک دوسرا جلسہ شہر میں کیا اور عربی کی نعتیہ شاعری خاص طور پر قصیدۂ بانت سعاد اور قصیدۂ بردہ پر کچھ بولنے کی دعوت دی، وہاں بھی سوچ کر ہی گئے تھے کہ اردو میں کہنا ہوگا مگر عین وقت پر گٹ پٹ کرنا پڑا۔

ڈربن میں میرا قیام وہاں کے ایک مخیر مسلمان تاجر موسیٰ پاریکھ صاحب کے یہاں ہوا، جنھوں نے بڑی فراخدلی اور اخلاص کے ساتھ مہمان داری کی، نہ صرف وہ بلکہ ان کا پورا خاندان اس طرح پیش آیا جیسے کوئی اپنے عزیز اور فرد خاندان کے ساتھ پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ نے دولت مندی اور دینداری دونوں عطا کی ہے۔

اس سفر میں ایک سعادت اور میرے حصہ میں آئی کہ رابطۂ ادب اسلامی کی شاخ کا باقاعدہ افتتاح ہوا، پروفیسر سید حبیب الحق ندوی اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کی تفصیل "عالم اسلام کی ثقافتی سرگرمیاں" کے صفحات میں شائع ہوگی۔

جنوبی افریقہ کے ممالک سے متعلق اعداد و شمار پر سید حبیب الحق صاحب نے مختصر اور جامع

نوٹ بھیجا ہے جو یہاں درج کر رہا ہوں :

افریقہ کے جنوبی ممالک کا تعارف قارئین کے لیے مفید ہوگا۔ ہر ملک میں مسلمان آباد ہیں اور اپنے دین و کلچر کے تحفظ کے لیے فکر مند بھی ہیں۔ براعظم افریقہ کے جنوبی ممالک۔ (southern African countries) میں چھوٹے بڑے دس ممالک شامل ہیں۔

۱۔ ایک تو بوٹسوانا (Botswana) ہے۔ اس نے ۱۹۶۶ء میں آزادی حاصل کی اور اس کا دارالخلافہ گیبرون (Gaberone) ہے۔ اس کا جغرافیائی رقبہ ۵۸۲,۰۰۰ اسکوائر کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی ۹۳۶,۰۰۰ ہے۔ مسلمانوں کی معتدبہ تعداد آباد ہے۔

۲۔ دوسرا ملک سوازی لینڈ (Swazi land) ہے۔ جس نے ۱۹۶۸ء میں آزادی حاصل کی۔ اس کا پایہ تخت مبانی (Mbubane) ہے۔ اس کا طول و عرض رقبہ ۱۷,۳۶۳ اسکوائر کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی ۵۸۹,۰۰۰ ہے۔

۳۔ تیسرا ملک لسوتو (Lesotho) ہے۔ جس نے ۱۹۶۶ء میں آزادی حاصل کی، اور اس کا پایہ تخت میسرو (Maseru) ہے۔ رقبہ ۳۰,۳۵۵ اسکوائر کلومیٹر ہے اور آبادی ۴۰۷,۰۰۰ ہے۔

۴۔ چوتھا ملک زمبابوے (Zimbabwe) ہے۔ جسے ۱۹۸۰ء میں آزادی ملی۔ اس کا پایہ تخت ہرارے (Harare) ہے اس کا رقبہ ۳۶۰.۶۲۰ اسکوائر کلومیٹر اور آبادی ۷۵۳۹,۰۰۰ ہے۔

۵۔ پانچواں ملک موزمبیق (Mozambique) ہے جسے ۱۹۷۵ء میں آزادی ملی اور اس کا پایہ تخت میوتو (Maputo) ہے۔ اس کا رقبہ ۷۸۳.۳۰ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۱۲۴۵۸۰۰۰ ہے۔

۶۔ چھٹا ملک زمبیا (Zambia) ہے جس نے ۱۹۶۴ء میں آزادی حاصل کی اور اس کا پایہ تخت لساکا (Lusaka) ہے۔ رقبہ اراضی ۷۵۲۶۱۴ مربع کلومیٹر ہے آبادی ۶۳۳۰,۰۰۰ ہے۔

۷۔ ساتواں ملک ملاوی (Malawi) ہے، جسے سنٹرل افریقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو

آزادی ۱۹۶۴ء میں ملی اور اس کا پایہ تخت للونگوی (Lilongwe) ہے۔ رقبہ ۱۱۸۴۸۴ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۶۰۸۷۰۰۰ ہے۔

۸۔ آٹھواں ملک انگولا (Angola) ہے جسے ۱۹۷۵ء میں آزادی ملی اور جس کا پایۂ تخت لواندا (Luanda) ہے۔ رقبہ ۱۲۴۶۷۰۰ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۶۹۴۳۷۰۰ ہے۔

۹۔ نواں ملک جنوبی افریقہ ہے اس کے تین مراکز حکومت ہیں۔ انتظامیہ کا پایہ تخت پریٹوریا ہے، عدلیہ کا مرکز بلوم فونٹین (Bloemfontein) ہے اور دستوری مرکز کیپ ٹاؤن ہے۔ اس کا رقبہ ۱۱۲۲۲۲۶ مربع کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی ۳۰۰۰۰۰۰۰ (تیس ملین) ہے۔

۱۰۔ دسواں ملک نمبیا (Namibia) ہے جس کو ۱۹۹۰ء میں آزادی حاصل ہوگی، اس کا رقبہ ۸۲۳۱۴۴ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۱۰۳۸۰۰۰ ہے۔

بقیہ ص ۱۳ کا:

تھیں سب آگ کی نذر ہو گئیں لیکن سب سے زیادہ نقصان جولیس سیزر کی بربریت سے اسکندریہ کی کی لائبریری کو پہنچا جس میں سات لاکھ توقیعات اور اتنی ہی بیش قیمت کتابیں تھیں۔ اُن کی فہرست ۱۲۰ جلدوں میں مرتب ہوئی تھی جس میں ہر مصنف کا حال بھی درج تھا۔ یہ صرف لائبریری نہیں، یونی ورسٹی تھی۔ اس میں ریاضی، طب، ہیئت، نجوم اور ادب کے شعبے تھے اور اس سے ملحق باغات، عجائب گھر، تحقیق اور علاج کے انسٹی ٹیوٹ تھے۔ طالب علموں کی تعداد ۱۴۰۰۰ سے کم نہیں تھی۔ اسی طرح چین کے بادشاہ TSIN SHI HWANGTI کو کتابوں سے للّہی بیر تھا اور اس نے ۲۱۳ ق م میں اتنی کتابیں جلوا دی تھیں کہ آج تک اُن کا شمار نہیں ہو سکا۔ کلیسا کی عدالتِ احتساب کے ذریعہ بھی جو کتابیں جلائی گئیں ان کا شمار احاطۂ بیان سے باہر ہے۔

اگر آج یہ سب ذخیرے محفوظ ہوتے تو ہماری تہذیبی اور علمی تاریخ کتنی مختلف ہوتی۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

عہدِ قدیم کے معجزہ ہائے ہنر

دورِ حاضر کو بڑا غرور ہے کہ اس نے ایٹمی توانائی دریافت کی ہے اور وہ حقیر ترین ذرّہ کا دل چیر کر اس کے اندرون تک پہنچ گیا ہے، حالاں کہ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے DEMOCRITUS نے ان بے شمار اور حقیر ترین ذرّوں کی طاقت کا راز معلوم کر لیا تھا۔ اِس راز کو از سرِ نو معلوم کرنے میں انسان کو کتنی زحمتیں اٹھانا پڑی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ حضرت مولانا رومؒ نے صحیح فرمایا تھا آسمان پر اُڑنا آسان ہے لیکن زمین پر چلنا بڑا ہی دشوار ہے:

بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

مشہور جرمن سائنس داں فان بران VON BRAUN جس کا نام جوہری تحقیق اور راکٹ کی ایجاد میں سرِ فہرست ہے، جنگ دوم کے بعد امریکہ آ گیا تھا۔ مجھے اس کی بیٹی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میں نے پوچھا آپ عالمی شہرت کے مالک فان بران کی بیٹی ہیں۔ کیا آپ بھی سائنس کے ایٹمی شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کہنے لگیں: "یہ تہمت ہے کہ میں اُن کی بیٹی ہوں۔ وہ ساری زندگی اپنی تجربہ گاہ میں بند رہے اور میں ساری زندگی اپنے بورڈنگ ہاؤس میں مقید رہی۔ بہت کم بائے سخن درمیان میں آیا ہے۔ اب بھی وہ امریکہ میں سارا وقت، شب و روز، تجربہ گاہ میں صرف کرتے ہیں۔ میں باپ بیٹی کی اُس محبت سے ناآشنا ہوں جس کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہے۔ تخلیق و تحقیق کے لیے شاید ایک حد تک تنہائی ضروری بھی ہے۔ اس لیے میں اعلیٰ سائنس کی نعمت سے محروم رہی۔"

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اِسی طرح عہدِ قدیم کے مصری اب سے چار ہزار برس پہلے پنسلین کے استعمال سے واقف تھے۔

بجلی کی بیٹریاں KONIG سے بہت پہلے غالباً دو ہزار برس قبل بیبی لونیا میں استعمال ہو چکی تھیں۔

آج خلائی سفر کی بڑی دھوم ہے اور جہانِ قمر کی دہلیز تک پہنچنے پر شادیانے بج رہے ہیں لیکن زمانہ قبل از تاریخ میں جینیوں نے اپالو کی پروازوں سے چار ہزار سال پہلے خلا میں اڑنے کا ذکر بڑے مزے لے لے کر کیا ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں علامہ اقبال کا یہ خیال شاعری نہیں، حقیقت ہے۔

ع دور حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم

ہم نے یہ سائنسی معلومات عربوں سے حاصل کی ہے اور عربوں کی رسائی ان علمی خزانوں تک، قدیم مصر، بے بی لونیا اور یونان کے ذریعہ ہوئی تھی۔ ان کو اس کا احساس تھا کہ انسان کی ترقی کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ عصر حاضر کے عظیم کارناموں سے کس حد تک واقف ہے۔ وہ فکرِ فردا میں کس حد تک منہمک ہے اور مستقبل کے بارے میں کیسے کیسے خواب دیکھ سکتا ہے۔

زبان بندی آج ہی کا دستور نہیں۔ اس سے پہلے بھی رہی ہے۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں ایک پادری برونو کو روم کے پیازا میں اس لیے زندہ جلا دیا گیا تھا کہ اس نے یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ کائنات میں بے شمار سورج اور سیارے ہیں جو برابر گھومتے رہتے ہیں اور اس کا قرینہ قوی ہے کہ ان میں سے بعض میں آبادیاں بھی ہوں۔

برونو سے بھی دو ہزار سال قبل ایک یونانی فلسفی ANAXTMENES نے جب سکندر اعظم سے کہا تھا کہ تم نے تو ایک دنیا کے صرف ایک ہی حصہ کو فتح کیا ہے اور ابھی بہت سی دنیائیں باقی ہیں تو سکندر مایوسی کے عالم میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پانچ صدی قبل ANAXAGORAS نے بھی اس بسیط کائنات میں بہت سی دنیاؤں کا ذکر کیا ہے۔

قدیم ہندوستان میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے ڈھائی ہزار سال پہلے موہنجدارو اور ہڑپا اس سلیقہ سے تعمیر کیے گئے تھے جیسے آج اس زمانے میں پیرس اور واشنگٹن کو تعمیر کیا گیا ہے۔ ان میں پانی کا انتظام تھا۔ بہت سے مکانوں میں غسل خانے اور نہانے کے حوض تھے۔ یہ سہولتیں آج بھی یورپ اور امریکہ میں "عیاشی" کی ذیل میں آتی ہیں۔

سولہویں صدی سے قبل یورپ کے پاس نہ کانٹے تھے اور نہ چمچے۔ لیکن قدیم مصری ان

سہولتوں سے آشنا تھے اور اس کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ انھوں نے تین ہزار برس قبل مسیح میں کانٹے اور چمچے استعمال کیے تھے۔

میکسی کو پر پہلا حملہ MOCTEZUMA نے کیا تھا۔ اس کے چپل کے تلے سونے کے بنے ہوئے تھے۔ یہ بات بھی کتاب میں لکھنے کی ہے کہ جب ۱۴۹۲ء میں کولمبس امریکہ کو دریافت کرنے نکلا ہے تو اُس وقت پورے یورپ میں سونے کے ذخیرے نوّے ٹن سے زیادہ نہیں تھے۔ لیکن میکسیکو اور پیرو کی سلطنتوں کو لوٹنے کے بعد یہ ذخیرہ اُٹھ گُنا یعنی ۷۲۰ ٹن ہو گیا۔

قدیم تہذیبی تاریخ کو مرتب کرنا جوئے شیر لانا ہے اور چیونٹیوں کے منہ سے لے کر ایک ایک دانہ جمع کرنا ہے۔ اس دشواری کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے کتب خانے جلا دیے گئے۔ اسکندریہ کا مشہور کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا تھا جس کا الزام اہلِ یورپ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذمہ لگا دیا ہے۔ قلوپطرہ نے یہ دیکھ کر جولیس سیزر سے کہا تھا:

"تم نرے درندے ہو، وحشی کہیں کے۔ تم علم کی قدر کیا جانو۔ ہم اپنے اہلِ علم کی قدر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ان کی ممی بنا لیتے ہیں۔ تم ان کی کتابوں کو ردّی سمجھ کر جلا دیتے ہو ہم انھیں آنکھوں سے لگاتے ہیں اور عقیدت کے ہونٹوں سے بوسہ دیتے ہیں۔"

ٹیپو سلطان کے بعد ۱۷۹۹ء میں، انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد ۱۸۵۶ء میں اور بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کی سلطنت کا چراغ گُل ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء میں، ہمارے کتب خانے ورق ورق ہو کر اڑ گئے اور بعض یورپ کے ملکوں میں منتقل ہو گئے۔ اقبالؔ نے لکھا ہے:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

میں ۱۹۵۶ء میں پہلی دفعہ یورپ گیا تھا اور تقریباً دو برس وہاں کے کتب خانوں میں کام کیا۔ اس عرصہ میں میں نے دوپہر کا کھانا بند کر دیا تھا تاکہ یہ وقت اور روپیہ کتابوں کے پڑھنے

یں اور حصول پر خرچ کیا جا سکے۔ اِس عرصہ میں ہیں نے کتابوں کے عکس لیے یا ان کو نقل کیا اور ان بیش قیمت مخطوطات کو ایڈٹ کرنے اور دہلی یونی ورسٹی کی طرف سے شائع کرنے کا ایک منصوبہ بنایا جس کا نام تھا "سلسلۂ اشاعتِ مخطوطاتِ اردو دہلی یونی ورسٹی"۔ جب اس سلسلہ کی دو کتابیں فضلی کی کربل کتھا' اور سرور کا تذکرہ 'عمدہ منتخبہ' بڑے اہتمام سے چھپ گئیں اور یہ کھوئی دولت پھر واپس آ گئی تو ہم نے وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو سے درخواست کی کہ وہ اِن کتابوں کی رسمِ اجرا ادا فرمائیں۔ انھوں نے اِس درخواست کو قبول فرمایا اور شعبہ میں تشریف لا کر ہمارے کام پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

ہم نے اِس سلسلہ کی کم و بیش تیس کتابیں شائع کی ہیں جو اردو ہی کے لیے نہیں تاریخ کے لیے بھی بے حد اہم ہیں۔ لیکن یونی ورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد اربابِ حل وعقد نے کہا ہمارے پاس ان کتابوں کے رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ ان کو جلد سے جلد اٹھوا لیجیے یا بیچ دیجیے:

کان اُن کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

فروری ۱۹۸۹ء میں مجھے ایک دوست کے گھر جانے کا اتفاق ہوا وہاں دیکھا کہ ہماری یہ کتابیں ایک چوکی پر پڑی ہیں اور بارش کی بوچھار اور سورج کی شعاعیں روزانہ ان کو بوسہ دیتی ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے الور کے کتب خانے، دارالترجمہ حیدر آباد کے ذخیرے، رام بابو سکسینہ، مولانا حسرت موہانی، اور قاضی شوکت حسین کی کتابیں خراب ہوتے ہوئے دیکھی ہیں۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا

بات میں بات نکل آئی۔ عصرِ رفتہ کی کہانی اس سے زیادہ دردناک ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ایتھنس کی لائبریری بالکل تباہ و برباد ہو گئی لیکن علمی دنیا کی خوش نصیبی سے ہومر کی منظومات کسی طرح بچ گئیں۔ MEMPHIS کی لائبریری کا اب کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ ایشیائے کوچک میں PERGAMUS کے کتب خانہ میں دو لاکھ (۲۰۰,۰۰۰) کتابیں موجود تھیں اب ان کا ایک ورق بھی باقی نہیں ہے۔ کارتھیج کے علمی ذخیرے جن میں پانچ لاکھ کتابیں

پروفیسر سید سلمان ندوی
صدر شعبۂ اسلامیات
ڈربن یونیورسٹی (جنوبی افریقہ)

قرآن اور فہمِ سلیمانؒ

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت عوام الناس میں مورخِ اسلام کی حیثیت سے تھی، صرف چند اہلِ علم کو معلوم ہے کہ حضرت سید صاحب کی بحث و تحقیق کا اصلی میدان تفسیر قرآن کریم تھا، احادیث نبویہؐ کی تحقیق میں وہ ایک 'ناقد بصیر' کا درجہ رکھتے تھے، سیرۃ النبیؐ کا ذکر جن لوگوں نے سوانح حیات یا "لائف" کی حیثیت سے کیا ان کو یہی دھوکہ ہوا، مگر جنھوں نے اس کے مطالعہ اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی وہ واقف ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی یہ جلدیں 'رسالت' کی شرحیں ہیں جہاں ایک قدم بھی قرآن کریم کی صحیح فہم اور سنت پر عالمانہ بصیرت کے بغیر نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔

قرآن کریم کی انھوں نے کوئی تفسیر تو نہیں لکھی مگر امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی طرح ان کے مختصر نوٹ یا چند چھوٹی سورتوں کی تفسیر ان کے علمی پایہ کو واضح کرتی ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیروں پر ان کی جو وسیع نگاہ تھی اس کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے جو مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ترجمہ کی توثیق فرماتے ہوئے ۱۳۵۵ھ میں تحریر فرمائی تھی۔ اس کی ابتدائی سطریں یہ ہیں:

"عین اس وقت جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا حکمت الٰہی نے اس غرض سے کہ اس آفتاب کے غروب سے مسلمانوں کے قلوب میں تاریکی نہ پھیلنے پائے ایک اور آفتاب نکالا، جس نے اس وقت سے لے کر آج تک اس ملک کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کر رکھا ہے، یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور ان کے اخلاف۔ شاہ صاحبؒ نے عوام کے لیے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا

اور خواص کے لیے قرآن پاک کے علوم پر متعدد رسائل لکھے، شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے صاحبزادوں میں سے مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اردو میں قرآن پاک کی تفسیر موضح القرآن لکھی اور اردو میں قرآن پاک کا وہ ترجمہ کیا جو اپنی گوناگوں صفات کی بنا پر آج تک بے مثال ہے، شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ اور حواشی کی خوبی کا اصلی اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے خود قرآن پاک کے سمجھنے کی تھوڑی سی کوشش کی ہو۔ شاہ صاحب کے حواشی موضح القرآن اپنے اختصار کے باوجود فہم مطالب میں بے حد معین ہیں اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو فہم قرآن کا خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے بخشا تھا۔"

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ پروفیسر سید سلمان ندوی صدر شعبۂ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی نے سید صاحبؒ کے ان حواشی کو نقل کیا ہے جو وہ تلاوت کے وقت رقم فرما دیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر بعینہ وہی بات آج سید صاحب کے متعلق کہی جا سکتی ہے جو انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے حواشی موضح القرآن کے بارے میں تحریر فرمائی تھی، ذکر و فکر اس نایاب ہدیہ پر پروفیسر سید سلمان کا شکر گزار ہے اور ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ پورے قرآن پر توضیحی حواشی کو جمع کر کے قرآن فہمی کی راہ میں ایک تاریخی اور علمی خدمت انجام دیں۔

(ادارہ)

جنوبی افریقہ میں جہاں آج کل میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں مقیم ہوں، پچھلے سالوں سے میں نے وہاں کی ایک مقامی مسجد میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اس درس کی وجہ سے عربی، اردو اور انگریزی کی مختلف تفسیریں میرے زیر مطالعہ رہتی ہیں، پھر بھی بعض مقامات پر مشکل پیش آتی ہے۔ چنانچہ چند برس ہوئے مجھے خیال آیا کہ والد ماجد مرحوم جس نسخہ قرآن میں تلاوت فرمایا کرتے تھے، اس کے حاشیہ پر آیات کی تشریح کے لیے کچھ اشارات تحریر فرمایا کرتے تھے، انکو دیکھنا چاہیے، چنانچہ وہ نسخۂ قرآن میں اپنے ساتھ کراچی سے جنوبی افریقہ لے گیا اور اس کا مطالعہ شروع کیا تو

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے ان چھوٹے چھوٹے اشارات اور جملوں کی قدر ہوئی۔ اشارات اگرچہ چند لفظی ہیں مگر اتنے بلیغ ہیں کہ بات نہایت واضح ہو جاتی ہے اور مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ یہ اشارات عموماً عربی زبان میں ہیں اور کہیں کہیں اردو میں ہیں۔ اسی ضمن میں ایک سلسلہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی شروع فرمایا تھا کہ قرآن کی آیتوں کی تفسیر حدیثوں سے کی جائے یا جو معنی و مطلب قرآن کی آیت میں ادا ہوتا ہے اس معنی و مطلب کی حدیثیں ان آیات کے ذیل میں جمع کر دی جائیں تاکہ معلوم ہو کہ قرآن پاک متن ہے اور احادیثِ نبوی اس کی شرح ہیں۔ یہاں بطورِ نمونہ چند آیات مع حواشی درج کرتا ہوں:

۱۔ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر (۵۱) مومنین کو متنبہ کر رہی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے محبت و مودت کا رشتہ قائم نہ کریں:

"یاآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ أولیاء بعضھم أولیاء بعض ؕ ومن یتولھم منکم فانہ منھم۔"

(اے مومنو! یہود و نصاریٰ کو اپنا ہمراز نہ بناؤ کیونکہ یہ لوگ ایک دوسرے کے دوست و ہمراز ہیں تم میں سے جو بھی ان سے دوستی کرے گا اس کا شمار بھی انہی میں ہوگا)۔

چنانچہ ومن یتولھم والے ٹکڑے پر والد ماجدؒ نے من تشبہ بقوم فھو منھم والی حدیث تحریر فرمائی ہے ــــ یہاں آیت و حدیث میں جو مماثلت و مطابقت ہے وہ ظاہر ہے، آج کی اسلامی دنیا اسی آیت و حدیث کے انتباہ سے روگردانی کا نتیجہ بھگت رہی ہے۔

۲۔ سورۂ احزاب کی آیت نمبر (۵) میں بھول چوک والی غلطیوں کی معافی کا ذکر ہے:

"ولیس علیکم جناح فیما اخطاتم بہ ولکن ما تعمدت قلوبکم۔"

(تم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس سے تم پر کچھ گناہ نہ ہوگا لیکن اگر دل سے ارادہ کر کے کرو گے تو گناہ ہوگا)۔

اس آیت کی تشریح میں الخطاء معفوٌ والی حدیث درج فرمائی گئی ہے۔

۳۔ اسی طرح سورۂ احزاب ہی کی اگلی آیت نمبر (۶) پر بھی حاشیہ ہے۔ وہ یہ ہے:

"النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم"۔
(نبی کو مؤمنین کے ساتھ ان کے نفسوں سے زیادہ تعلق ہے اور نبی کی بیویاں
ان کی مائیں ہیں)۔

اس آیت پر حاشیہ میں سورۂ توبہ کی آخری مشہور آیت لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم الخ کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور پھر حسب ذیل حدیث تحریر فرمائی ہے:

لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ
والناس اجمعین۔

"تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک کہ میں اس
کے والدین، بچوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"

قرآنی آیات واحادیث کے تطابق کا یہ سلسلہ والد ماجدؒ غالباً جاری نہ رکھ سکے کیونکہ مذکورہ بالا آیات واحادیث کے علاوہ صرف چند ہی اور آیات میں یہ اہتمام ملتا ہے۔ لیکن قرآنی آیات کی تشریح اور ان کے مطالب ومعانی کی وضاحت کا سلسلہ آخر تک موجود ہے، اس سے یہ بات بالکل واضح ہے، جیسا کہ بہت سے اور واقف کاروں نے لکھا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کا اصل ذوق اور ان کے ذوق علمی کا محور "قرآن" ہی تھا، گو دنیا نے ان کو مورخ اسلام اور سیرت نگار کی حیثیت سے جانا مگر ان کی دلچسپی اصلاً قرآن وحدیث اور پھر علم کلام سے تھی وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ اصلی علوم تو بس قرآن وحدیث ہی ہیں، تاریخ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے جو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہے[1]

---

[1] چنانچہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں بعد ظہر تفسیر قرآن کا معمول تھا جس میں دارالمصنفین کے رفقاء شریک رہتے، اس درس قرآن سے سب سے زیادہ نفع مولانا محمد اویس نگرامی ندوی مرحوم (مولف التفسیر القیم) نے اٹھایا تھا جو خود بھی تفسیر کا ذوق رکھتے تھے اور دارالعلوم ندوہ میں شیخ التفسیر ہو گئے تھے، مرحوم اپنے درس قرآن میں بار بار والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے اور ان کے نکات قرآنی بیان فرمایا کرتے تھے۔ مولانا محمد اویس مرحوم سے کئی بار مخلص احباب اور بزرگوں میں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے فرمائش کی کہ وہ قرآنی افادات سلیمانی کو جمع اور مرتب کر کے شائع کریں مگر مرحوم وعدہ کرنے کے باوجود اپنی مسلسل علالت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہر کیف جیسا میں نے عرض کیا کہ اپنے درسِ قرآن کے سلسلہ میں بعض آیات کی تشریح کے سلسلہ میں مجھے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے اشارات کی تلاش تھی، جب میں نے ان کو پڑھا تو میرے سب شکوک وشبہات زائل ہو گئے۔ مثلاً رفع عیسیٰ کا مسئلہ بعض جدید ذہن کے مترجمین ومفسرین اعتزالی اثر کے تحت جمہور کی رائے کے خلاف بیان کرتے ہیں، اگرچہ مجھے خود "رفع" کے سلسلہ میں انشراح تھا لیکن لیطمئن قلبی کے درجہ میں مزید دلیل کی تلاش تھی، حضرت والد صاحبؒ کے حاشیہ نے اس مسئلہ میں مجھے وہ دلیل بہم پہنچا دی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ممکن ہے متقدمین میں کسی نے یہ دلیل بیان کی ہو گر میری نظر سے نہیں گزری۔ مجھے یہ چیز حاشیہ ہی سے ملی [1]

سورۂ نساء کی رفع والی آیت نمبر (۱۵۷) تا (۱۵۹) کے حاشیہ پر والد ماجد نے بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزاً حکیماً کے سلسلہ میں ایسا زبردست جملہ عربی میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کے بعد مزید کسی تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، وہ جملہ یہ ہے:

کونہ عزیزاحکیما یقتضیٰ ان یکون الرفع امرًا عظیمًا یعنی آیت کے ختم پر اللہ تعالیٰ کا اپنے کو عزیز وحکیم کہنا اس بات کا مقتضی ہے کہ "رفع" یقیناً کوئی عظیم الشان واقعہ ہوگا ورنہ عزیز وحکیم کا ذکر اس موقع پر بے فائدہ ہوگا۔

پھر اگلی آیت میں قبل موتہ میں "ہ" کی ضمیر کو والد ماجد نے حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب مانا ہے اور حاشیہ دیا ہے قبل موت عیسیٰ پھر تحریر فرمایا ہے کہ ترتیب میں رفع کا ذکر پہلے ہے پھر ذکر موت کا آیا ہے! ــــ اس کے بعد حاشیہ پر نزولِ عیسیٰ کی دلیل کا اشارہ سورۂ زخرف کی آیت نمبر (۶۱) وانہ لعلم للساعۃ کے حوالہ سے دیا ہے اور اردو میں "حضرت عیسیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ):

اور ندوہ کی تدریسی مصروفیت کے باعث یہ کام انجام نہ دے سکے۔ کاش مولانا محمد اویس صاحب مرحوم کے صاحبزادوں میں سے کوئی مرحوم کی یادداشتوں کو مرتب کر کے شائع کریں۔

والد ماجدؒ کے درسِ قرآن کا سلسلہ بھوپال اور کراچی کے مختصر قیام میں بھی جاری رہا۔

[1] کچھ ملتی جلتی بات حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحریر فرمائی ہے۔

کی آمد" تحریر فرمایا ہے۔

اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر(۵۵) میں "متوفیك" کا لفظ آیا ہے اس کی تشریح سورۂ زمر کی آیت نمبر(۴۲) کے حوالہ سے رقم فرمائی ہے، اور حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ "معنی التوفی۔ زمر رکوع ۵" سورۂ زمر کی آیت میں توفی اور موت دونوں کا ذکر ہے یعنی یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، وہ آیت یہ ہے:

"اللّٰہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسك

التی قضیٰ علیھا الموت ویرسل الاخریٰ الیٰ اجل مسمّیٰ"

(اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی اُن کے سونے کے وقت، پھر ان جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد معین تک کے لیے رہا کر دیتا ہے یعنی جن کی موت نہیں آئی ان جانوں کو واپس کر دیتا ہے)۔

مذکورہ بالا مسائل پر یہ حواشی والد ماجدؒ کے ذوقِ تفسیر اور طرزِ استدلال کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ کس قدر محتاط اور مستحکم راہ رکھتے تھے۔

اسی ربطِ قرآنی کے بارے میں اُن کی تعبیر بہت لطیف ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت "ربوٰ" کا اختتامً آیت نمبر(۲۷۶) واللّٰہ لایحب کل کفار اثیم پر ہے اس پر والد ماجد نے حاشیہ تحریر فرمایا ہے کہ اخذ الربٰو کفر النعمۃ ـــــ پھر اضافہ فرمایا ـــــ کفر النعمۃ ربھم ـــــ سود کی حرمت کے جہاں اور اسباب ہیں وہیں کفرانِ نعمتِ الٰہی کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو سود کے کفرِ نعمت ہونے کا سبب ہی حرمت کی مضبوط دلیل بن سکتی ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر(۷) میں "محکمات" و "متشابھات" کا تذکرہ ہے، اور اگلی آیت نمبر(۸) میں یہ دعا ہے: ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا الخ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے بعد اس کے کہ آپ ہمیں ہدایت کر چکے، پہلی آیت نمبر(۷) میں "متشابھات" کے سلسلہ میں ذکر ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی تفسیر من مانی کرتے ہیں، اس آیت میں "زیغ" بطورِ اسم مذکور ہے اور آیت نمبر(۸) میں بہ صیغۂ فعل آیا ہے ـــ ان دونوں کے درمیان جو ربط ہے وہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ سے ایسا واضح ہے کہ بات بالکل بے غبار

ہو جاتی ہے، وہ حاشیہ یہ ہے :

ابتغاء التاویل الباطل زیغ بعد الھدیٰ

یعنی تاویل باطل درحقیقت ہدایت پانے کے بعد کجی کے مترادف ہے۔

اور دیکھیے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر(۱۳۷) میں بیاؔن ۔ ھدٰیؔ اور موعظۃ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وہ آیت یہ ہے : ھذا بیان للناس وھدی وموعظۃ للمتقین یعنی دنیا میں اللہ کے دین کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہوا ہے اس کا بیان تمام لوگوں کے لیے کافی ہے اور اس سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ونصیحت ہے۔ آیتِ پاک کے مذکورہ تین الفاظ پر والد ماجدؒ نے حاشیہ میں تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ ھدیٰ اور موعظۃ کا تعلق مُتّقین سے واضح ہوتا ہے اور خود اس تشریح سے متقین کی بھی تشریح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بیاؔن، ھدٰیؔ اور موعظۃ کے فرق کو اس طرح تحریر فرمایا ہے :

البیاؔن ما کان بین بنفسہ (البیان ھو الاعلان)۔ والھدٰیؔ اخفیٰ۔ والموعظۃ اخفیٰ منہ۔

یعنی بیاؔن تو وہ ہے جو خود ہی اتنا ظاہر ہو کہ محتاج شرح نہ رہے۔ ہدایتؔ چونکہ قلب سے متعلق ہے اس لیے وہ بیاؔن سے زیادہ نازک و خفی ہے اور موعظتؔ کا تعلق بھی قلب اور تقویٰ سے ہے اس لیے وہ ہدایت سے بھی خفی تر اور نازک تر ہے۔

"سیرۃ النبیؐ" جلد سوم میں جو معجزات پر مشتمل ہے، معراجِ نبوی پر بحث کرتے ہوئے والد ماجدؒ نے سورۂ بنی اسرائیل کا عمود معراج ہی کو بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ پوری سورت کا تعلق معراج ہی سے ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر(۹۳) میں کفار مکہ کا ذکر ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نبوت پر مختلف معجزانہ دلیلوں کا مطالبہ کرتے ہیں، ان میں سے ایک مطالبہ کا ذکر آیت نمبر(۹۳) میں اس طرح ہے کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ کے پاس سونے کا گھر نہ ہو، یا آپ آسمان پر نہ چڑھ جائیں۔ اس سے آگے آیت پاک کا یہ ٹکڑا ہے :

"ولن نومن لرقیک حتی تنزل علینا کتبا نقرؤہ"

(اور ہم تو آپ کے چڑھنے کا بھی یقین نہ کریں گے جب تک کہ آپ ہمارے

پاس ایک نوشتہ نہ لے آئیں جس کو ہم پڑھ بھی لیں)۔

آیت کے اس جزو پر والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا ہی لطیف حاشیہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

تدل الآیۃ ان النبی ادعی الرّقی فی السمآء۔ یعنی یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان پر چڑھنے کا دعویٰ فرمایا تھا[1]

آخر میں اس مختصر مضمون کو میں سورۂ حدید کی آیت نمبر (۲۵) کے حاشیۂ سلیمانی کے ذکر پر ختم کرتا ہوں۔ پہلے آیت ملاحظہ فرمائیے:

"لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس... الخ۔"

(ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں)۔

اس آیت میں کتاب و میزان کے ساتھ لوہے کا ذکر ہے جو بظاہر بے جوڑ محسوس ہوتا ہے، اس کی تفسیر مختلف مفسروں نے کی ہے اور بعض نے لوہے سے سیاسی و جنگی طاقت مراد لی ہے۔ ہمارے والد ماجدؒ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے چند لفظوں میں کیا بلیغ بات فرما دی ہے، فرماتے ہیں:

طریقان لاقامۃ القسط، اولھما الکتاب والمیزان وثانیھما الحدید۔ یعنی عدل و انصاف کا قیام دو ذرائع سے ہوتا ہے۔ پہلا ذریعہ قرآن اور انصاف کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے جو ظاہر ہے کہ خدا اور اس کے سامنے جواب دہی کے احساس سے حاصل ہوتا ہے لیکن انسان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ بھی معلوم ہے کہ احساس مسئولیت پر غفلت بھی غالب آجاتی ہے، ان اہلِ غفلت کی اصلاح کے لیے قوت کا استعمال کرنا

---

[1] حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بیت المقدس سے آگے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آسمانی کو سورۂ والنجم کی آیت ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ عند سدرۃ المنتھٰی سے بہ اشارۃ النص ثابت کیا ہے کہ اس میں لفظ "عند" مقتضی ہے کہ رائی و مرئی (یعنی حضورؐ اور جبریلؑ) متحد المقام ہوں یعنی سدرۃ المنتہیٰ پر ہوں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضورؐ سدرہ تک تشریف لے گئے۔ مگر جو استدلال حضرت سید صاحبؒ نے فرمایا ہے وہ قوی تر ہے کہ اس سے نصِ قرآنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر جانا اور کفار پر اس واقعہ کا اظہار فرمانا دونوں باتیں ثابت ہوگئیں۔

پڑتا ہے، وہ قوت چاہے انفرادی ہو یا حکومتی ہو، پس اب کتاب ومیزان کے ساتھ حدید (لوہے) کا تعلق واضح ہو گیا۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں مختلف آیات پر حواشی تحریر فرمائے ہیں وہاں کہیں کہیں سورتوں کے عمود کی طرف بھی بعض سورتوں کے شروع میں اشارے فرما دیے ہیں۔ سورۂ اسریٰ کے بارے میں آپ سُن چکے کہ معراج ہی کو اس صورت کا عمود قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سورۂ ہود کی ابتدا میں تحریر فرمایا ہے:

هذه السورة تسلية للنبي۔

یعنی یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلاسے کے لیے نازل فرمائی گئی ہے، اس سورت میں مختلف انبیاء اور ان انبیاء کو اپنی اپنی قوموں میں جن مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا تذکرہ ہے تاکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی رہے کہ قریش نے آپ کو جن مشکلات وآلام میں ڈال رکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ سب ہی انبیاء نے یہ اذیتیں اٹھائی ہیں۔

ایک آخری مثال ـــ سورۂ مریم کے عمود کا اشارہ آغاز سورۃ پر ان دو لفظوں میں فرمایا ہے ـــ عبدة الانبياء ـــ یعنی اس سورہ میں مختلف انبیاء کرام کی عبدیت اور بندگی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

یہ تھے فہم سلیمانی کے چند نمونے جو حواشی قرآن کی صورت میں پیش کیے گئے۔[1] جو اشارات والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جا بجا پورے قرآن پر تحریر فرمائے ہیں وہ جمع ہو جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے، اس کے لیے بڑا وقت بھی درکار ہے۔ خدا کرے کہ یہ عظیم خدمت مجھ ناتواں کے قلم سے انجام پا جائے، پہلے تو فہرست ہی خاصی طویل ہو گی پھر آیات کی تشریح اور اشارات کی توضیح اور بھی زیادہ طویل کیونکہ والد ماجد کا قلم ایجاز رقم چند لفظوں میں بڑے بڑے مضامین سمو لیتا ہے، اللہ تعالیٰ والدِ ماجد مرحوم ومغفور کی قبر مبارک کو اپنی تجلیات وانوار کا مہبط بنائے رکھے کہ مجھ ناچیز کو زندگی میں بھی تفسیر قرآن خود پڑھائی اور بعد از مرگ بھی اپنے ان قرآنی حواشی کے ذریعہ قرآن پاک سے متعلق رہنے کے سامان فرما گئے۔

---

[1] ملت قرآن پر آپ کا یہ احسان ہو گا اگر اس طرح کے مزید اشارات آپ جمع کر کے شائع کریں۔ (ععن)

مولانا عبد اللہ عباس ندوی

عربی زبان میں

جدیدیت کا رجحان اور اس کا ارتقاء

جدیدیت کا مفہوم ہر جگہ یکساں نہیں ہے، عرب جب اس لفظ کو بولتے ہیں تو ان کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور برصغیر کے عربی داں اس کا مفہوم کچھ اور لیتے ہیں، ایک تحریک بھی "الحداثة" کے نام سے متعارف ہے وہ اگرچہ قدیم ہے مگر آجکل اس کا عربی ادب میں بہت چرچہ ہے اور اس کا سرا بھی اس جدیدیت" سے ملتا ہے۔

میں ان تینوں مناہج پر موضوعی انداز میں روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں، سب سے پہلے "جدید عربی" کے اس مفہوم کو سمجھ لیا جائے

جدید عربی کا مفہوم ہمارے یہاں یہ ہے کہ قدیم ذخیرہ الفاظ سے زیادہ جو الفاظ پائے جائیں وہ نئی عربی ہے، یہی نہیں بلکہ قدیم الفاظ کے نئے مشتقات جن کو درسیات کی کتابوں میں نہ پایا جائے، یا مفرد مستعمل کی جگہ اس کی جمع نئے قسم کی آجائے وہ سب نئی عربی ہے۔ خواہ وہ عربی قواعد کے لحاظ سے درست ہوں، مثال کے طور پر ایک لفظ "اکتتاب" کو لیجئے، لغت میں اس کے معنی ہیں کسی کتاب کی اپنے قلم سے نقل لینا، اور دوسرے معنی ہیں" اسماء کی فہرست تیار کرنا"۔ حدیث میں یہ لفظ آیا ہے غزوات کے موقع پر لوگوں کے ناموں کی فہرست تیار کی جاتی تھی۔ ایک صحابی کہتے ہیں: "اکتتبت فی غزوۃ مونتة أسماء الغزاۃ" یعنی غزوہ موتہ کے وقت ہم نے شریک جہاد لوگوں کے اسماء کی فہرست تیار کی تھی، اب یہ لفظ کسی فنڈ میں چندہ دینے والوں کے نام لکھنے کے لیے مستعمل ہے، یہ لفظ اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہے اور قدیم ہے لیکن چونکہ اس کا رواج نہیں ہے اس لیے اس کو نئی عربی میں سمجھا جانے لگا، بعض وقت نحوی استعمالات سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کسی ایسے استعمال کو جدید سمجھا جاتا ہے جس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا، مثلاً ہم کو لفظ "یا" کا استعمال صرف

یہی معلوم ہے کہ یہ صرف ندا ہے، کسی کو مخاطب کرنا یا پکارنا ہو تو کہتے ہیں یا فلاں، لیکن اگر الفیہ اور سیبویہ کی الکتاب میں دیکھئے تو اس کے متعدد استعمال معلوم ہوں گے، جیسے تنبیہ کے لیے، کسی خطرہ سے خبردار کرنے کے لیے، اچھی یا بُری بات پر بے ساختہ تاثر کے اظہار کے لیے مثلاً "یالہما من فزع" (کتنے خوف کی بات ہے یا کتنی گھبراہٹ کی بات ہے) اسی طرح "یاصاح" لفظی معنی ہیں اے بیدار ہونے والے، مفہوم یہ ہے لوگو! ہوش میں آؤ، چونک جاؤ، مگر صرف ندا کے علاوہ جو مفہوم ہے اس کے استعمال کو نئی عربی کہا جاتا ہے مثلاً آج کل عرب میں کوئی بیرونی آدمی گھر کے اندر داخل ہوتا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ پردہ نشین خواتین اس جگہ سے ہٹ جائیں تو کہتے ہیں "یاساتر"[1] غرض یہ کہ قدیم لفظ کا استعمال بھی نیا سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہماری محدود ضرورتوں میں اس کا رواج نہیں ہے۔

سب سے زیادہ معرّب اور دخیل الفاظ کو نئی عربی کہا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب مسمّیٰ پایا جائے گا تو اس کا اسم بھی وضع ہوگا، تمدن کے ارتقاء اور ایجادات کی کثرت نے ہمیں وہ اشیاء دی ہیں جو پہلے نہیں تھیں، اس کے لیے اسماء کا لانا ضروری ہے، اس کی دو شکلیں ہیں، ایک یہ کہ جس زبان سے لفظ برآمد ہوا ہے وہی لفظ قبول کر لیا جائے جیسے ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر وغیرہ[2]۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کا ترجمہ عربی کے ذخیرہ مصادر سے اس کے قاعدہ صرف و اشتقاق کے مطابق وضع کر لیا جائے، جیسے فضائی سفر کے لوازمات، طب جدید کے آلات، انجینیرنگ کی اصطلاحات کے لیے موزوں ترین نام جو پورے مفہوم پر حاوی ہو اختیار کر لیا جائے، مثلاً طار یطیر کا مادہ عربی میں موجود ہے جس کے معنی اُڑنے کے ہیں اس کا اسم ظرف مطار ہے، مصدر طیران ہے، طیّار اسم ہے جو فعّال کے وزن پر بنا ہے جو پیشہ بتلانے کے لیے خاص ہے جیسے حدّاد، صبّاغ وغیرہ، ھبوط کے معنی اوپر سے نیچے اترنے کے ہیں، اقلاع کے معنی ہیں کشتی کا لنگر اٹھا لینا،

---

[1] ساتر، ستّار کی جگہ اسمائے حسنیٰ میں تو نہیں ہے مگر مفہوم یہی ہے کہ خدائے ستار پردہ پوشی فرمانے والا ہے اور پکارنے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل پردہ پوش تو اللہ ہے آپ پردہ نشین خواتین پردہ کے اندر آجائیں۔

[2] صوتی لحاظ سے یہ فرق قابل نظرانداز ہے کہ جو اصوات عربی میں نہیں ہیں مثلاً چ، ٹ، پ وغیرہ ان کی جگہ ج، ت، ب استعمال کیے جاتے ہیں۔

کسی چیز کا کلیتہً جگہ چھوڑ دینا، اب ان قدیم مادوں سے فضائی پرواز سے متعلق اسماء وضع کر لیے گئے ہیں تو ان کو نئی عربی کہنا ناواقفیت ہی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ مگر بہر حال ان کے استعمالات نئے ہیں، اس طرح کے الفاظ ہر زمانہ میں دوسری زبانوں سے منتقل ہوتے آئے ہیں، ان استعمالات کو جدید عربی کہا جاتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ہم ٹیلی گرام کو تیلیغراف کہیں جو صرف صوتی ضرورت سے بدل کر گ کو غ کر دیا گیا ہے، یا اس کا ترجمہ برقیہ کر دیں جو برق سے بنا ہے جس کے معنی بجلی ہیں، وہ جدید عربی ہے، چنانچہ آج سے نصف صدی پہلے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان الفاظ کی لغت ترتیب دی تھی اور اس کا نام لغات جدیدہ رکھا تھا[1] مگر جو الفاظ اس وقت مستعمل تھے وہ اب قدیم ہو چکے، اور ان میں ہزارہا ہزار الفاظ کے اضافے ہو گئے اور بہتیری ڈکشنریاں تیار ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی، ان الفاظ کے مجموعہ کو لغت کہنا صحیح بھی ہے اور غلط بھی، صحیح یوں ہے کہ قدما مفرد الفاظ کو بھی لغت کہتے تھے مثلاً سیوطی کی 'المزھر' میں، اور العسکری کی کتاب 'الصناعتین' میں، علی القالی کی 'الامالی' میں بکثرت الفاظ کے متعلق پڑھیں گے کہ یہ فلاں قبیلہ میں بولا جاتا ہے ایسے موقع پر وہ حوالہ دیتے ہیں "ھذہ لغۃ طی" یا والکلمۃ فی لغۃ قضاعۃ وعرفت فی لغۃ کذا وغیرہ، اور غلط یوں ہے کہ لغت جس کو ہم بولی یا زبان جو بھی کہیں وہ پورے مجموعہ نظام صوتی، تولید لفظی اور ترکیب نحوی، syntex Phonology-Morphology کو کہتے ہیں۔

علم لسانیات کی رو سے مفرد الفاظ، زبان میں بنیادی کردار نہیں ادا کرتے، کیونکہ اگر مسمی پایا گیا تو اس کے لیے اسم وضع کر لیے گئے، یا عاریۃً دوسری زبانوں سے لے لیے گئے، جس کو Borrowed vocabulary کہتے ہیں، بعض الفاظ اپنے معانی بدل دیتے ہیں جس کو sementics کہتے ہیں، بعض الفاظ مردہ ہو جاتے ہیں کیونکہ جس معنی کے لیے بولے جاتے تھے وہ ختم ہو چکے، آدمیوں کی طرح الفاظ کا بھی اقبال و زوال ہوتا ہے، مثال کے طور پر عربی میں "مشھد" اس جگہ کو کہتے تھے جہاں حاکم وقت کسی کو قتل کرنے یا قصاص لینے کے لیے کھڑا کرتا اور لوگ جمع کیے جاتے ان لوگوں کے اجتماع کو مشہد کہتے تھے، بعد میں یہ لفظ عید گاہ کے لیے بولا جانے لگا، کیونکہ لوگوں کا جمع ہونا دونوں میں

---

[1] اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے بڑا فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں آج سے ۵۰ سال پہلے عربی صحافت میں مستعمل ترکیبوں کی غلطیاں واضح کی تھیں، جس کو مصر کے 'الفتح' نے تحسین کے ساتھ نقل کیا تھا۔ (ع ع ن)

مشترک ہے، لفظ مر جاتے ہیں جیسے عربی کا لفظ "ترتیب اور اس کا اسم ظرف مِترّبۃ لغت سے ناپید ہوگیا، پہلے روشنائی خشک کرنے کے لیے لوگ تازہ تحریر پر مٹی یا راکھ ڈال دیا کرتے تھے تاکہ اس کا داغ دوسرے سادہ ورق پر نہ پڑے یا روشنائی پھیل نہ جائے، اور ایک خاص قسم کی ڈبیہ پیتل کی بنائی جاتی تھی جس کے دہانے پر چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے تھے، اس کو مِترَبہ کہتے تھے، پھر جب سے بلاٹنگ پیپر کا استعمال شروع ہوا لوگ ترتیب اور مترِبہ کو بھول گئے اور بال پن کے رواج نے بلاٹنگ پیپر کو بھی تاریخ کا ذخیرہ بنا دیا، بعض الفاظ کا کسی زمانہ میں عروج ہوتا ہے، اس کے سنتے ہی ذہن پر رعب پڑتا ہے، پھر اس لفظ کا زوال ہو جاتا ہے جیسے لفظ "مقصورہ" ہے، سلاطین بنی امیہ و بنو عباس مسجد جانے تو صف کے اندر ایک کٹہرہ ہوتا تھا جس کے اندر صرف ایک آدمی کی جگہ ہوتی اور تین طرف سے بند ہوتا تھا، سلاطین و خلفا اپنی حفاظت کے خیال سے اس میں نماز ادا کرتے تھے اس وقت اس لفظ کا عروج تھا، اب یہ لفظ ٹرافک کنٹرول کرنے والے سپاہی کے کھڑے ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں، بعض ملکوں میں اس کی شکل بلکہ مقصورہ ہی کی سی ہوتی ہے، بعض الفاظ ایک زمانہ میں اچھے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں بعد میں وہ مذموم ہو جاتے ہیں جیسے استعمار کا لفظ ہے، جس کے معنی کبھی آبادکاری یا نوآبادی کے تھے یہ اچھا نام سمجھا جاتا تھا کہ کوئی ویران یا بنجر علاقہ کو آباد کرے بعد میں امپیریلزم کے لیے یہ لفظ بولا جانے لگا، اور اس کے ساتھ ایک ظالمانہ تصوّر لفظ کے مفہوم میں داخل ہوگیا، کبھی ایک لفظ بُرا سمجھا جاتا تھا جیسے "ثورۃ"، بغاوت و سرکشی کے لیے مستعمل تھا، موجودہ زمانہ میں پُرانے فرسودہ نظام کے خلاف آواز اٹھانے کو کہتے ہیں اور اب یہ لفظ عروج پا گیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجرد اسمار کسی زبان میں کلیدی حیثیت نہیں رکھتے، اور زبان کا تشخص اسمار سے نہیں ہوتا، قرآن کریم میں غیر عربی کے بیسوں لفظ آئے ہیں، کافور، زمہریر، جہنم، رق، استبرق عبقری، امام سیوطی نے الاتقان میں ان کی فہرست دی ہے کہ ایک سو چار لفظ ایسے ہیں جو اصلاً غیر عربی کے ہیں، علما و مفسرین نے ان کی مختلف تاویلات کی ہیں، کسی نے کہا دراصل یہ عربی کے ہی الفاظ تھے جو دوسری زبانوں نے مستعار لے لیے تھے اور پھر عربی نے ان کو قبول کرلیا، بعض نے کہا یہ غیر عرب الفاظ ہیں مگر ان کو عربیت کے سانچہ میں ڈھال دیا گیا وغیرہ وغیرہ، لیکن دراصل ان الفاظ کے غیر عربی ہونے سے قرآن کے دعویٰ "بلسان عربي مبين" پر کوئی حرف نہیں پڑتا کیونکہ

زبان اسمار کا نام نہیں ہے، زبان کا تشخص اس کے قاعدہ اشتقاق، حروف جر و ربط و متعلقات فعل سے ہوتا ہے، اگر یہ موجود ہے تو غیر ملکی الفاظ کی کثرت جس قدر بھی ہو زبان نہیں متغیر ہوگی۔ ایک مثال دیتا ہوں مالٹا کی زبان کسی زمانہ میں عربی ہوگئی تھی، یہاں جنگ عظیم سے پہلے مسلمان ترکوں نے اس کو فتح کر کے اسلامی ثقافت وہاں رائج کر دی تھی، چنانچہ عربی کے بہت سے الفاظ وہاں کی زبان میں آج موجود ہیں، جیسے مسجد، طریق، منارہ، داخل، خارج، صعود، منزل وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہاں کی موجودہ زبان کو عربی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہاں عربی کے قاعدہ اشتقاق بدل کر اٹیلین زبان کے قواعد قبول کر لیے گئے اور حروف جر بدل دیے گئے، اب خواہ وہاں ۵۰ فیصد نہیں ۹۵ فیصد بھی عربی زبان کے الفاظ ہوں اس کو عربی زبان نہیں کہا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ برصغیر میں نئی عربی کی اصطلاح یا "موڈرن عربک" جس کو کہتے ہیں وہ ایک موہوم چیز ہے جس کا وجود نہیں ہے۔

لسانیات نے جو ناقابلِ انکار اصول دیے ہیں ان کی رو سے عربی زبان جو لکھنے پڑھنے کی زبان ہے وہ آج بھی وہی ہے جو دوسری صدی ہجری میں تھی، جو شخص نہج البلاغہ کی نثر اور عمر بن ابی ربیعہ کی نظم سمجھ سکتا ہے وہ آج کے اخبارات، ریڈیو، پارلیمنٹ کی بحثوں، عدالتوں کے فیصلوں اور عوامی تقریروں کی زبان بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے، عربی کا یہی کمال ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اپنے قدیم نہج پر قائم ہے جب کہ دوسری زبانیں سو دو سو سال میں پرانی ہو جاتی ہیں، غیر مسلم عرب یعنی شام و فلسطین کے عیسائی و یہودی اور مصر کے قبطی اس کو محسوس کرتے ہیں اور بارہا ایسی تحریکیں چلا چکے ہیں اور آج بھی ان کی آواز مجلہ "الآداب" میں سنائی دیتی ہے کہ قرآن نے عربی زبان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں، عبداللہ القصیمی نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "هٰذه هي الاغلال" (یہی بیڑیاں ہیں) اس میں مذہب اور زبان کے محدود ہونے کا ماتم کیا ہے، ماروت العبود، میخائیل نعیمہ، بشارۃ الخوری ہر چند کہ صرف و نحو کی پابند عربی لکھتے رہے کیونکہ اس کے لکھنے پر مجبور تھے، اور اگر وہ عربی کے نام پر اپنی تجویز کردہ زبان لکھیں بھی تو کوئی ان کی بات سمجھ نہ سکے گا، مگر علانیہ اور کبھی بین السطور اس رناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ ہم جاہلی ادب اور موروثی ادب کے پابند ہو کر ایک کونے میں بند ہو گئے ہیں۔

جدید عربی کا میرے نزدیک جو صحیح مفہوم ہے وہ یہ کہ خیالات و افکار غیر عربی ہوں اور دوسری

زبانوں کے طرزِ کلام کو عربی میں ڈھالا جائے، اگرچہ اس میں بھی صرفی ونحوی رعایت فصیح عربی کی ہے، مگر بات کرنے کا انداز غیر عربی ہے، مرحوم مصطفیٰ صادق الرافعی نے 'الرسائل' میں لکھا تھا کہ کچھ لوگ عربی لہجہ میں انگریزی بولتے ہیں اور کسی نے لکھا کہ عربی زبان کو یورپین ہیٹ پہنا کر اس کی گردن میں ٹائی باندھ دی گئی ہے، اگر ہم کسی چیز کو نئی عربی کہہ سکتے ہیں تو واقعۃً یہی زبان ہے جس میں انگلش اور فرنچ کے محاورے لفظی ترجموں کے ساتھ بعینہٖ قبول کر لیے گئے ہیں۔

اب آئیے تھوڑی دیر کے لیے نمونہ کے طور پر ان اسالیب پر ایک نظر ڈالیں جہاں عربی اسلوب چھوڑ کر مغربی اسلوب اختیار کیے گئے ہیں، اور جن کو الرافعی کے بقول ہیٹ اور ٹائی پہنائی گئی، یا وہ لسانی عنصر جس کی بنا پر ہم جدید عربی کا واقعی تشخص کر سکتے ہیں وہ غیر عربی ترکیبیں ہیں، جو عربی کے قالب میں ڈھال دی گئی ہیں ان میں بعض ترکیبیں اخبارات کی وجہ سے اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ لوگوں کا ذہن بھی نہیں جاتا کہ یہ جملہ انگریزی کا چربہ ہے۔ مثلاً عام طور پر لوگ لکھتے ہیں ھو یعمل کمدرس، یا ھو یشتغل ککاتب، یہ طرز عربی کا نہیں ہے، یہ ترجمہ ہے He works as a teacher یا He works as a clerk کا، عربی میں اس کو ھو یعمل مدرسًا، یا کاتبًا لکھا جاتا ہے۔

ایک تعبیر ہے کہ یہ چیز قابلِ استعمال نہیں رہی، یا فلاں شخص میں طاقت نہیں رہی اس کے لیے عام طور پر عادَ کا فعل استعمال کرنے لگے ہیں، مثلاً کہیں گے لم یعد صالحًا للاستعمال عربی فکر کے لحاظ سے اس کو ما بقی یا لم یبق صالحًا ہونا چاہیے۔

اب وہ مثالیں ملاحظہ فرمائیے جو کثرت سے موجودہ عربی میں استعمال ہوتی ہیں، اور وہ سب مغربی زبانوں کا قالب ہے،

۱۔ قال بمعنی الکلمۃ، قال بکل ما فی الکلمۃ من معنیٰ، یا فلان مخلص فی العمل بکل ما فی کلمۃ الاخلاص من المعانی النبیلۃ، یہ ترکیب انگریزی پیرایۂ بیان کا چربہ ہے انگریزی میں کہتے ہیں In the full sense of the word.

۲۔ کسی مقصد کے لیے اگر کوئی اپنی جان لڑا دے، زندگی وقف کر دے، اس کے لیے عربی فکر کے لحاظ سے کہتے ہیں "جعل ھمّہ الأوّل ھذا الشئ" یا "بذل کل رخیص وغال فی تحقیق ھدفہ" اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے فرنچ میں یہ ترکیب مستعمل ہے IL a consacre

vie sa اس کو جدید عربی میں بلا تکلف لکھنے لگے، فلان کرّس حیاتہ، حالانکہ لفظ کرّس عربی میں دخیل ہے اور اس کی اصل مسیحی عقائد و رواج سے ماخوذ ہے، کسی جگہ یا ظرف کو خدمت مسیح کے لیے وقف کرنا یا کلیسا کے لیے اپنے آپ کو قربان کرنا اس کا مفہوم ہے، انگریزی میں اس کا ترجمہ SACRIFICE سے کرتے ہیں HE SACRIFISED HIS LIFE۔

۳۔ ضرورت کی تاکید کے لیے عربی فکر اس کی صفت شدیدہ، ھائلۃ یا قہار کے یہاں اضطراریہ وغیرہ مستعمل ہے، موجودہ عربی میں الحاح کا فاعل ملحّۃ بولنے لگے ہیں، ضرورۃ ملحۃ یعنی ایسی ضرورت جو اصرار کر رہی ہے، انگریزی میں اس کے لیے INSISTING NEED، اور فرنچ میں NECESSITE INSTANTE مستعمل ہے، عربی میں اسی کا ترجمہ چل پڑا ہے۔

۴۔ کسی مبہم عبارت کی وضاحت کرنے کے لیے عربی میں "قال موضحًا" یا "فسّر العبارۃ" وغیرہ بولا کرتے تھے، جدید عربی میں فرنچ سے یہ ترکیب مستعار لی گئی ہے کہ فلاں حروف پر نقطے ڈالے، وضع النقاط علی الحروف Il a mis les points sur les mot۔

۵۔ دو ٹوک لفظوں میں جواب دے دیا، کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی اسلوب یہ تھا: "لم یدع فلان مجالاً للشك فی الأمر" یا "قال لہ قولاً صریحًا لا غموض فیہ ولا ابھام" جسے شیخ عبدالقادر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں استعمال کیا ہے، فرنچ میں اس کے لیے کہا جاتا ہے ایک حرف میں جواب دے دیا۔

عربی صحافت نے یہ اسلوب اپنا لیا، اب بے تکلف لوگ لکھتے ہیں أجاب بالحرف الواحد۔

۶۔ کسی کی فرمائش یا خواہش پر کوئی کام کرنا، ہمارے قدماء اپنی کتابوں کے دیباچہ میں لکھا کرتے تھے کہ یہ کتاب میں نے فلاں عزیز یا بزرگ کی خواہش پر تالیف کی ہے، اس موقع پر ان کا اسلوب یہ ہوتا تھا: "کتبت تحقیقا لرغبۃ فلاں" یا "طلب منی فلان فرأیت أن أنفذ طلبتہ" اس مفہوم کو خوب صورت ترکیب کے ساتھ ابن حاجب نے الشافیۃ میں لکھا ہے: طلب منی من لا یسعنی مخالفتہ" یعنی مجھ سے ایسے شخص نے فرمائش کی جس کے حکم کی خلاف ورزی پر میں قادر نہ تھا۔ بہر حال یہ عام مفہوم ہے جس کے لیے بے شمار اسالیب ہیں، آج کل عربی صحافت میں AT HIS OWN REQUEST کا ترجمہ رائج ہو گیا ہے، "نزولا عند رغبتہ" cedont a son

desire دراصل یہ فرنچ اسلوب ہے۔

۷۔ کسی کا اپنی ڈیوٹی انجام دینا، یا اپنے حصہ کا کام پورا کرنا، یا اپنی مفوضہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا، عام اسلوب ہے، عربی میں اس کے لیے پیرایۂ بیان یہ تھا کہ: "فلان قام بعملہ خیر قیام" یا "فلان لم یقصر فیما فوّض الیہ من الامر" یا "کان موفقًا کل التوفیق فی عملہ الخاص بہ" وغیرہ وغیرہ۔ جدید عربی میں "لَعِبَ الدور" کی ترکیب استعمال کرنے لگے ہیں "فلان لعب دورہ بنجاح" یعنی اس نے کامیابی سے اپنا پارٹ ادا کیا، یہ اسلوب تھیٹر کی معاشرت کا غماز ہے، جہاں ایک اداکار اپنا پارٹ ادا کرتا ہے، تو اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کا پارٹ کامیاب رہا، لہذا اس اصل کو فراموش کر کے ہمارے ثقہ اور ذی فہم مسلمان بھی بلا تکلف لکھنے لگے "لعب دورًا رائعًا" بہت شاندار پارٹ ادا کیا، اور یہ جملہ فرنچ، انگریزی اور تمام یورپین زبانوں میں کثرت سے بولا جاتا ہے He played his part۔

۸۔ یہ مسئلہ زیر بحث ہے، یا زیر غور ہے، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی اسلوب یہ ہے: ینظر فی المعاملۃ، والمسألۃ موضوع بحث لدی العلماء یا لدی المعیین، عربی نے جدید اسلوب میں اس کو اس طرح کہتے ہیں: ھذہ القضیۃ مطروحۃ علی بساط البحث، یعنی یہ معاملہ بحث کی بساط پر ڈالا ہوا ہے جو فرنچ کا لفظی ترجمہ ہے cette cause est mise sur le tapis۔

۹۔ وقت گزارنے کے لیے اردو میں تو خیر کاٹنے کا فعل استعمال کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں فلاں آدمی اپنا وقت کاٹ رہا ہے مگر عربی میں صرف قضیٰ یقضی ہی کے فعل سے اس کی صحیح تعبیر ہوتی ہے، مثلاً "فلان قضیٰ عمرہ فی کذا" یا "فلان یقضی یومہ فی کذا" نیز ادبی تحریروں میں آتا ہے: "فلان یوصل لیلہ بنہارہ فی ھذا العمل" یعنی وہ اپنے کام میں دن رات ایک کیے ہوئے ہے۔ جدید عربی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے قتل الوقت لکھا کرتے ہیں جو لفظی ترجمہ ہے انگریزی اسلوب کا To kill the time۔ جدید عربی میں بے تکلف لوگ لکھنے لگے ہیں فلان یقتل وقتہ۔

۱۰۔ ہمارے مشرقی ممالک کے ماحول میں کسی خوشی کی بات سے دل میں ٹھنڈک پڑتی ہے،

اپنی اولاد کو خوش حال دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، ٹھنڈک اور دل جمعی کے لیے "برداً وسلاماً"
قرآنی ترکیب سب کو معلوم ہے۔ یہ تعبیر ہماری جغرافیائی نوعیت اور موسم کی غماز ہے، مگر انگریزوں
کے یہاں اس کے برعکس اچھی چیز کو دیکھ کر وہ آنکھیں سینکتے ہیں، ملاقات میں گرماگرمی ہوتی ہے، معانقہ
بھی گرم ہوتا ہے، ان کے لیے WARM کا لفظ عام ہے جیسے A warm Reception
اس کے برخلاف اگر کوئی ناکامی ہو یا کسی مسئلہ میں کامیابی نہ ہو تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ اس نے
فلاں منصوبہ پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا، To Thrugh cold water۔

عربی قدیم کے قرۃ العین، برد القلب، لقاءہ أثلج الصدور کے بجائے
"لقاءحارا" عناقاً حارا، ارحب بکم أجمل الترحیب کے بجائے احر
الترحیب یا ترحیبًا حارًا بولنا رائج ہوگیا، اس طرح کی بیسوں مثالیں ہیں جن میں کہیں
مسیحی عقیدہ کی جھلک ہے، کہیں موسم کی، کہیں معاشرت کی۔

۔ ایسے موقع پر جب کہ یہ کہنا مقصود ہے کہ فلاں شخص نے اپنی آخری کوشش کرلی، یا جو بھی
اس سے بن پڑا کر ڈالا، یا اپنی آخری کوشش کر کے دیکھ لی عربی میں کہا کرتے تھے؛ أخرج آخر
سهامه من کنانته" یعنی اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا، یا کہیں گے: "بذل
أقصى مساعیه فی الامر" مگر جدید عربی میں کہتے ہیں: فلان لَعِبَ ورقته الأخیرة" یعنی
اپنے تاش کا آخری پتہ پھینک دیا، He played his last card

اس طرح بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں جہاں عربی کے صحیح قالب کو چھوڑ کر یوربین زبانوں
کی ترکیبیں رائج کر دی گئی ہیں، ممکن ہے اس کو بیجا نکتہ چینی کہا جائے اور یہ کہا جائے کہ ہر زمانہ میں اس
طرح کی تعبیرات قبول کی جاتی رہی ہیں جیسے عباسی دور کی چوتھی صدی میں یونانی منطق کی راہ سے منطق کی
اصطلاحات کے ترجمے کیے گئے۔ دلیل علّی (علت سے) دلیل لِمّی (لِمَ سے)، اللّانهایة
البتّةَ[1] کے علاوہ عربی قواعد کی ہیئت بھی بگاڑ دی گئی مثلاً قضایا شرطیہ کی مثالیں جو وضع کی گئیں

---

[1] بَتَّ یَبُتُّ حتمی طور پر فیصلہ کرنے یا کسی سلسلہ کو کاٹ دینے کے لیے بولا جاتا ہے، بَتّةٌ اس کا اسم
ہوا جس پر لام الف تعریف کا لگا دیا گیا۔ ایک موضوع حدیث ما ننسخ من آیة أو ننسها کے ضمن

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان میں آپ اس طرح کے جملے دیکھیں گے جو عربیت کے لحاظ سے بہت ہی رکیک ہیں،

لیس البتة اذا کانت الشمس طالعة فالليل موجودٌ

لیس البتة اذا کانت الشمس طالعة فالنهار لیس بموجودٍ

اور فارسی کے اثرات سے بہت سی ترکیبیں عربی میں رواج پاگئی تھیں، جیسے القاب واحترام کے لیے حضرة المکرم، حضرة الشیخ، یا جب ترکوں کی حکومت ہوئی تو عطوفة العلامة، فضیلة الشیخ، سماحة الشیخ، ان میں مشرقی نصرانی تہذیب کی بو صاف محسوس ہوتی ہے، لیکن ان کے اثرات پورے لٹریچر پر نہیں تھے، اور منطق کی اصطلاحات منطق ہی کی کتابوں تک محدود تھیں، شعر و نثر میں ان کا گزر نہیں تھا ان کی حیثیت Termenology کی تھی اور فارسی و ترکی اثرات زبان و بیان کے چند گوشوں تک محدود تھے اور ان پر نکیر کرنے والے علما بھی تھے، مگر اب شام و مصر کے عیسائی اور خاص طور سے وہ ادبا جو امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور ایک نئے لٹریچر کو أدب المهجر[1] کے نام سے روشناس کرا رہے ہیں وہ واقعی ایسی ہی عربی ہے جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں الفاظ و ترکیب تو عربی کے ہیں مگر لکھی جاتی ہے بائیں طرف سے۔

میں یہاں پر جدید عربی کے اس مفہوم کو جسے عرب ادبا بھی تسلیم کرتے ہیں مزید وسعت دیتے ہوئے اپنے موضوع کے تیسرے جزء پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں وہ الحداثة کے نام سے جو تحریک عرب ادبا میں مقبول ہو رہی ہے بلاشبہ جس تیزی کے ساتھ یہ تحریک پھیل رہی ہے اسی سرعت کے ساتھ اس کی مخالفت کرنے والے بھی بڑھ رہے ہیں، اور جس طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ):

میں بیان کی جاتی ہے اس میں یہ لفظ آیا ہے مگر اس کا حد درجہ ضعیف بلکہ موضوع ہونا خود اس لفظ سے بھی ظاہر ہے، کیونکہ قرآن کریم یا احادیث میں یہ لفظ اور کہیں نہیں آیا ہے اور نہ پہلی دوسری صدی کی عربی میں اس کا وجود ہے۔

[1] قاعدہ کے لحاظ سے مَهْجَرْ اسم ظرف و مکان ہے، چھوڑی ہوئی چیز یا جگہ، مگر اصطلاح میں ترک وطن کر کے جس جگہ آباد ہو گئے ہیں اس کو مهجر کہنے لگے ہیں، صحیح لفظ اس کے لیے مُهَاجَر ہے۔ (ع ع ن)

عام شاہراہ کو چھوڑ کر ایسی لسانیاتی تحریکیں جو عربی زبان وادب کے ڈھانچہ پر اثرانداز ہوں وہ دیرپا ثابت نہیں ہوتی ہیں، یہ بھی ایک وقتی رو ہے جس کو عرب ممالک کی آب و ہوا شاید راس نہیں آئے گی، یہ تحریک چونکہ بالواسطہ زبان پر اثرانداز ہو رہی ہے اس لیے ہم اس کو عربی میں جدیدیت کے رجحان کے ارتقاء کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔

الحداثۃ حدث کا ایک مصدر ہے، جس کے معنی جدّت یا جدیدیت کے ہیں، یہ دراصل ایک مغربی تحریک کا چربہ ہے، حقیقت پسندی، ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی کی جو تحریکیں برناسی، رمزی، سریالی کے نام سے چلتی رہی ہیں ان سب میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ یونان کے قدیم مذہبی افسانوی ادب کے خلاف سب میں بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے، جدیدیت کی تحریک دراصل، اسی کا ایک امتداد EXTENTION ہے، جو ذہنی اضطراب اور لامرکزیت کے جذبہ کا ترجمان ہے، اس ادبی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ قدیم ہی نہیں جدید بھی (یعنی جس کو جدید کہا جاتا ہے) وقت کے مطالبات اور نئے انسان کی تمناؤں اور تمدّن کی پیدا کردہ آرزوؤں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لیے مخالفت صرف ان ہی رجحانات کی نہ ہو جو اصطلاح میں کلاسک یا تقلیدی کہے جاتے ہیں، بلکہ رمزیت یا رومانیت بھی اب ایک فرسودہ چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ جدید اس وقت تک جدید ہے جب تک کہ اس سے بڑھ کر اگلا قدم نہیں اٹھایا گیا ہے، آج سے تین سو برس پہلے کی ادبی تحریک کو جدید کہنا غلط ہے، لہٰذا اب جدیدیت یا حداثۃ کا یہ مفہوم ہے کہ پچھلے تمام رجحانات کو کالعدم قرار دیا جائے اور نیا انسان، نئے شعور کی ترجمانی نئے الفاظ میں کرے، ہر پرانا سانچہ اس لائق ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے، کیونکہ اس قدیم سانچہ میں جدید تصورات اپنی جگہ نہیں پاتے ہیں۔

یہ تو تحریک ہوئی اور نظم و نثر میں اس کی نمائندگی یورپ میں آج سے پچاس برس پہلے شروع ہو چکی ہے، مشرق میں عربی میں اس کے ترجمے اب آئے ہیں اور ادبی رسائل و مقالات کا یہ موضوع اس طرح پیش کیا جا رہا ہے جیسے آج کی چیز ہو۔ روزالیوسف نامی لبنانی ماہنامہ کے شمارہ ۱۹۷۱ء میں فدوی عوقان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس نے عربی کی مروجہ شکل کو بدلنے کی سفارش کی تھی، ظاہر ہے یہ بات نہ مانی جا سکتی تھی نہ مانی گئی، اس لیے کہ اس کی تحریر کے نقوش اس طرح کے تھے:

۱۔ عربی سے ثلاثی ابواب کی تقسیم مفتوح العین، مضموم العین اور مکسور العین کی تفریق ختم کر کے

سب کو ایک کر دیا جائے۔ ایک مفتوح العین (باب فتح یفتح) باقی رکھا جائے۔

۲۔ اجوف اور معتل اور مہموز کی وجہ سے جو تلفظ میں فرق پڑتا ہے اس کو ختم کر کے یکساں صوتی معیار مقرر کیا جائے۔

۳۔ صیغہ مجہول کی عربی میں ضرورت نہیں ہے، باب انفعال سے اس کا مقصد پورا ہوسکتا ہے یا مجہول کو رکھا جائے تو مزید فیہ کے تمام ابواب ختم کیے جائیں۔

۴۔ تثنیہ کا صیغہ کالعدم قرار دیا جائے۔

۵۔ ایسے سوابق Prefixes ایجاد کیے جائیں جن سے ماضی کی صحیح نوعیت معلوم ہو سکے۔

۶۔ فعل استمراری کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہیں ہے اس کے لیے ایک صیغہ ڈھالا جائے۔

۷۔ تعبیرات میں مجازیات و استعارات کو باقی رکھا جائے لیکن لفظ کے Present value قیمت حضوریہ کو ترجیح دی جائے۔

غرض کہ الحداثۃ صرف نظم و نثر میں قدیم سانچوں سے بغاوت کا داعی نہیں بلکہ زبان کے اس ڈھانچہ کو ختم کرنے کا مدعی ہے جو قرآنی عربی کی ساخت ہے، تحریک مضر اس قدر نہیں ہے جس قدر مفید ہے۔ کیونکہ اس سے عربیت کے علم برداراد بار کے کان کھل گئے اور ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ تحریک نہیں ایک سازش ہے، جس کا ایک سرا عربی زبان اور ادبی تحریک ہے تو دوسرا سرا قرآن کی اس زبان سے ہے جس کی بنا پر غیر عرب مسلمانوں کا رشتہ عرب زبان وادب سے قائم ہے۔

اس لیے نہ صرف یہ تحریک بلکہ جتنی بے راہ روی اور لاپروائی زبان کے سلسلہ میں ہو رہی تھی سب کا ایک ساتھ استیصال ہو جائے گا، ان کے ناول نگاروں اور آزاد شاعری کے علم برداروں کا دائرہ کار، لبنان اور شام تک محدود ہے۔ نقالی میں کچھ مصر کے نوجوان اور خال خال دوسرے عرب ممالک میں اور خاص طور پر مغرب اقصیٰ میں موجود ہیں، لیکن ان کے اپنے نتائج فکر شائع کرنے کے لیے بیرونی امداد کا سہارا لینا پڑتا ہے جو روس سے آرہی ہے۔

ابھی حال میں نجیب محفوظ کو جو نوبل پرائز ملا ہے وہ اگرچہ ملحدانہ ناول "اولاد حارتنا" پر دیا گیا ہے یا اس ناول کو مرکزی تخلیق قرار دیا گیا ہے، اس پر سردست گفتگو مقصود نہیں ہے[1]، البتہ اس پر ان کے معاصر کا تبصرہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ انعام الحداثۃ والوں پر ایک بجلی بن کر گرا ہے کیونکہ نجیب محفوظ، خواہ ملحدانہ خیال رکھتا ہو مگر اس نے اپنے الحادی تصور کو ناول میں بیان کرنے کے لیے وہی قدیم عربی استعمال کی ہے جس کے خلاف ادب الحداثۃ نے علم بغاوت بلند کیا ہے۔

جدیدیت کے رجحان کا ارتقائی نقطہ سردست الحداثۃ کے نام پر عربیت کی شکل مسخ کرنے کی کوشش ہے، جو حضرات ان تحریکات کا صحیح رخ اور ان کے کام کی رفتار دیکھنا چاہیں وہ منیف موسیٰ کی نظریۃ الشعر کا مطالعہ کرسکتے ہیں جو دارالفکراللبنانی نے ۱۹۸۴ء میں شائع کی ہے یا ماروت عبود کی علی المحك، اور عبداللہ القصبی کی ھذہ ھی الاغلال دیکھیں۔ علمی رسائل میں لبنان کا مجلۃالآداب اور تیونس کا سریانی مجلہ الفکر العربی معاون ہوگا۔

ایک عربی لغت وادب کے مشہور محقق احمد عبدالغفور عطار نے الحداثۃ کو ہپّی ازم سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا ایک انٹرویو جدّہ کے روزنامہ عکاظ میں شائع ہوا تھا کہ الحداثۃ کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں انھوں نے کہا بالکل اسی طرح جیسے امریکن ہپّیوں کی نقل مشرقی ممالک کے نوجوان کرنے لگے ہیں، لہٰذا یہ ادبی ہپّی ازم ہے۔

---

[1] 'ذکر وفکر' میں نجیب محفوظ اور اس کے ملحدانہ ناول "اولاد حارتنا" کا تفصیلی جائزہ لیا جاچکا ہے۔ ملاحظہ ہو 'ذکر وفکر' شمارہ ۵، جلد ۳

مولانا نذر الحفیظ ندوی

امیر عبد الکریم خطابی

مغرب اقصیٰ کا ایک جانباز مجاہد

آج سے نصف صدی قبل دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی انجمن الاصلاح میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زیر صدارت ایک جلسہ ہوا تھا جس کا عنوان تھا من ھواکبر رجل فی العالم الاسلامی ؟ عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کون ہے۔ طلبا نے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا۔ آخر میں جب ووٹ لیا گیا تو امیر البیان امیر شکیب ارسلان کے حق میں ووٹ آئے کہ اس وقت اسلامی دنیا کی ممتاز ترین شخصیت وہی تھی۔ اس جلسہ کی کارروائی امیر البیان کو بھیجی گئی، تو انھوں نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کو شکریہ کا خط لکھتے ہوئے یہ تحریر فرمایا کہ آپ کے حسن ظن کا شکریہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اسلامی دنیا کی ممتاز ترین شخصیت امیر عبد الکریم خطابی کی ہے، جنھوں نے اسپینی اور فرانسیسی فوجوں کے چھکے چھڑا دیے اور مراکش کی سرزمین کے بڑے حصے کو آزاد کرا کے اس پر اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جب ۱۹۵۱ء میں مصر کے دورے پر تشریف لے گئے تو وہاں انھوں نے جلا وطنی کی زندگی گزارنے والے امیر عبد الکریم خطابی سے بھی ملاقات کی اور ان کی زبان سے دو بڑی استعماری طاقتوں کے مقابلہ کی داستان سماعت فرمائی، قارئین ذکر و فکر کی خدمت میں ہم اسی مرد مجاہد کی مجاہدانہ زندگی سے متعلق بعض معلومات پیش کر رہے ہیں:

(ادارہ)

محمد بن عبد الکریم کی ولادت مراکش کے مشہور شہر ملیلہ کے ایک دیہات "اجدر" میں ۱۸۸۲ء

میں ہوئی جہاں ان کے والد قاضی تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کر کے مراکش کے تاریخی علمی مرکز فاس گئے جہاں ۱۹۰۵ء میں مشہور دانش گاہ جامعہ القرویین میں داخلہ لے لیا۔ تعلیم کے دوران غیر معمولی ذہانت اور ہم عمر ساتھیوں میں امتیازی لیاقت کا اظہار ہوا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں تعلیم کے مراحل سے فارغ ہو گئے، کچھ عرصہ بیکار رہے، اس کے بعد اسپین چلے گئے جہاں انھوں نے مزید تحصیل علم کی خاطر شامنکا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور بہت جلد ادب اور قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹریٹ بھی کر لیا، اس دوران امیر عبدالکریم نے اندلس میں مسلمانوں کی اسلامی تاریخ کا تفصیل سے مطالعہ کیا اور پورے اسپین کی سیاحت بھی کی، اس طرح اپنے نامور آباء و اجداد کی عظمت کے لازوال یادگاروں کو انھوں نے بچشم خود دیکھا اور تہذیب حجازی کے مزار پر آنسو بہائے، جس نے بعد میں ان کے دل و دماغ میں اسپینیوں سے انتقام کی آگ بھڑکانے میں اہم رول ادا کیا۔

امیر عبدالکریم خطابی جن کو عبدالکریم ریفی بھی کہا جاتا ہے، خطابی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جو عرصہ سے دوسرے قبائل پر سیادت و قیادت کا مالک تھا اور اسپین کی عیسائی طاقت کے مقابلہ میں اس قبیلہ کو خاص شہرت حاصل تھی۔

امیر عبدالکریم اسپین سے تعلیم مکمل کر کے جب اپنے شہر ملیلہ واپس آئے تو ان کو قاضی مقرر کر دیا گیا لیکن انھوں نے اس منصب پر ہوتے ہوئے شہر ملیلہ اور اس کے آس پاس دیہاتوں کا تفصیلی دورہ کیا انھوں بچشم خود اسپینی سامراج کی چیرہ دستیوں کا مشاہدہ کیا، یہیں سے انھوں نے نوجوانوں کے اندر استعمار کے خلاف تحریک پیدا کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ریف کے علاقوں کے نوجوان امیر کی باتوں اور شخصیت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور انھوں نے استعمار کو ملک سے نکالنے کے لیے جنگی علوم و فنون کو سیکھنے کا عزم کر لیا، چنانچہ سیکڑوں نوجوانوں نے فوجی مراکز میں داخلہ لے کر فوجی مشن میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

جب پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو جرمنی اور ترکی نے مغربی کیمپ میں بے اطمینانی اور اضطراب و پریشانی اور انتشار پیدا کرنے کے لیے اسپینی ساحل پر (جو ریف سے ملے ہوئے ہیں) فوجیوں کی ایک تعداد پہنچا دی تاکہ چھاپہ مار جنگ کے ذریعہ اسپین اور فرانس کو پریشان کیا جا سکے۔ امیر عبدالکریم

نے ان فوجیوں کا ساتھ دیا تاکہ فرانس اور اسپین کے لیے مشکلات پیدا ہوں، امیر عبدالکریم اور ان کے رفقاء نے ترکی اور جرمنی کے ان فوجی افسروں سے بھرپور تعاون کیا اور ان سے فوجی تربیت بھی حاصل کرلی، اسپینی حکومت نے امیر عبدالکریم کی جدوجہد سے خوف زدہ ہوکر ان کو گرفتار کرلیا لیکن جلد ہی انھیں رہا کر دیا، بعد میں انھیں وزارت جنگ میں افسر بنا کر ترقی دے دی۔

۱۹۱۸ء میں ریف کے علاقہ میں اسپین کے خلاف فتنہ و فساد نے سر اُٹھایا اور سیاسی و فوجی مشکلات پیش آئیں تو اسپینی وزارت جنگ نے امیر عبدالکریم کو ایک فوجی دستہ کا سربراہ بنا کر ریف بھیج دیا، یہاں آکر انھوں نے بڑی ذہانت سے ریفی قوم اور اسپینی مفاد دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی، اس کے نتیجہ میں امیر کو غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے تو انھوں نے اسپینی فوج سے استعفیٰ دے کر قضا کا سابق عہدہ دوبارہ قبول کرلیا۔ حالانکہ اسپینی فوج میں ترقی کرکے انھوں نے کیپٹن کا عہدہ حاصل کرلیا تھا۔

اسپینی حکومت کے خلاف بغاوت:

امیر عبدالکریم خطابی ایک دن اپنے شہر ملیلہ میں کسی کام سے جارہے تھے کہ راستے میں انھوں نے ایک اسپینی رنگروٹ کو دیکھا کہ وہ ایک ریفی مسلمان کو کوڑوں سے بُری طرح مار رہا ہے، وہ ریفی بیچارہ مدد کے لیے چیخ رہا تھا لیکن اس کی مدد کے لیے کوئی آنہیں رہا تھا۔ امیر نے یہ منظر دیکھا تو آگے بڑھ کر انھوں نے اس کا سبب دریافت کیا، اسپینی رنگروٹ نے بڑی رعونت اور سختی سے جواب دیا کہ اس ریفی کے جانور نے اس کو دولتی سے مار دیا ہے۔ امیر عبدالکریم نے کوشش کی کہ اسپینی کے غیض وغضب کو ٹھنڈا کریں، اس کے بعد فوجی مرکز جاکر اس اسپینی کی شکایت کردی، یہاں انھیں یہ جواب ملا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسپینی چاہے وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اس ملک کا آقا اور مالک ہے۔ امیر عبدالکریم نے اس موقع پر جو جواب دیا اس نے آگے چل کر مغرب اقصیٰ کی تاریخ بدل دی۔ امیر نے کہا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ اسپین کو اس کوڑے کی کتنی زبردست قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ یہ کہہ کر امیر عبدالکریم غصے میں وہاں سے اپنے قبیلہ "بنی روریاغل" چلے آئے اور اپنے مخلص اور جاں باز ساتھیوں سے انھوں نے اپنی داستان سنائی، اسی کے ساتھ انھوں نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ وہ اسپین سے اس کا خوفناک

انتقام لے کر رہیں گے۔ پھر انھوں نے سوال کیا کہ کیا آپ لوگ اس مقصد میں ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں؟ سبھوں نے قسم کھا کر عہد و پیمان کیا اور دس کے دس ساتھیوں نے اپنی اپنی بندوقوں میں گولیاں بھر کر اسپین کے خلاف جنگ کا عزم مصمم کر لیا، ان لوگوں نے پہلی گولی اسپینی فوجیوں کے خلاف ۴، ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰، جولائی ۱۹۲۰ء میں چلائی۔

سب سے پہلے امیر عبدالکریم نے اپنے رفقا کے ساتھ اسپینی فوج کی چھاونی پر حملہ کیا، ہر حملہ میں ان کو کامیابی ہوئی، بندوقیں اور فوجی ساز و سامان ہاتھ آئے، جب ریفیوں کو اس حملے کا علم ہوا تو شہروں اور دیہاتوں سے بڑی تعداد میں نوجوان جوق در جوق آنے لگے، لیکن اسپین کی حکومت کو پہلے پہل یہی خیال ہوا کہ یہ لوگ ڈاکو ہیں جو اکا دکا حملہ کر کے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں، ایک بار اسپینی حکومت نے پانچ سو فوجیوں کو اس مقصد سے بھیجا تاکہ ان کا قلع قمع کر دیا جائے لیکن یہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اور ان کا فوجی ساز و سامان بھی امیر عبدالکریم کے قبضے میں آ گیا۔

جب امیر عبدالکریم کی دھاک بیٹھ گئی تو انھوں نے آزادی کی جد و جہد کو ایک منظم شکل دینے کے لیے اپنے قبیلہ کا ایک جلسۂ عام منعقد کیا، آغاز میں امیر نے اسپین اور مغرب اقصیٰ کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے استعماری مقاصد پر روشنی ڈالی اور حاضرین سے درخواست کی کہ ظالموں اور غاصبوں سے پاک کرنے کے لیے وہ ان کا ساتھ دیں۔ تمام حاضرین نے جہاد میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی اور آخری قطرۂ خون بہانے کا عہد کیا۔ اس کے بعد ہی ایک عمومی مجلس کی تشکیل کی گئی جس میں ریف کے تمام قبائل شریک ہوئے اور ۱۹، ستمبر ۱۹۲۱ء کو اس مجلس اعلیٰ نے امیر عبدالکریم کی قیادت میں ایک باقاعدہ جمہوری حکومت کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ اس نئی حکومت میں صرف چار وزارتی عہدوں کا اعلان کیا گیا، اس کے ساتھ ایک قومی میثاق مرتب کر کے شائع کر دیا گیا۔ اس قومی میثاق میں حسب ذیل اعلانات کیے گئے:

- ہر اس معاہدہ کو ہم تسلیم نہیں کریں گے جن میں عربوں کے حقوق پر دست درازی کی گئی ہو، خصوصاً وہ معاہدہ جو استعماری طاقتوں نے ۱۹۱۲ء میں کیا تھا۔
- اسپینی فوج ان تمام علاقوں سے چلی جائے جہاں اس نے فرانس سے معاہدہ کے

بعد قبضہ کر لیا ہے۔

- ریف کی جمہوری حکومت کو تسلیم کیا جائے۔
- ایک جمہوری حکومت اور دستور کی تشکیل نو کی جائے۔
- اسپینی حکومت ان نقصانات کا معاوضہ ادا کرے جو اس کے فوجیوں نے بارہ سال کے قبضہ کے دوران ریفیوں کو پہنچائے ہیں، اور جو ریفی ان کے پاس گرفتار رہے ہیں ان کا فدیہ ادا کیا جائے۔
- تمام ملکوں سے مساویانہ بنیاد اور باہمی احترام کے ساتھ دوستانہ تعلق استوار کیے جائیں گے۔

نئی حکومت نے ایک پرچم کا بھی انتخاب کیا جس میں سرخ بیک گراؤنڈ پر چھ سبز ستارے ایک سفید ہلالی دائرے میں ہوں گے۔

نئی حکومت کا پایہ تخت "اجدر" ہوگا۔

باقاعدہ حکومت کی تشکیل کے بعد ہی امیر نے ریف کی سیاسی، فوجی، اقتصادی اور تعلیمی وسماجی حالت درست کرنے کی زبردست اور جان توڑ کوشش شروع کر دی۔ سب سے پہلے انھوں نے ریف کے حدود متعین کر کے اس کا اعلان کر دیا، اس کے بعد فوجی ٹریننگ کے مراکز قائم کر کے بڑے پیمانے پر فوج کو منظم کر دیا۔ پہلے مرحلے میں امیر نے چار ہزار فوجیوں کے ساتھ اسپینی فوج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، اسی کے ساتھ فوجی تربیت، اسلحہ سازی کا کام بھی شروع کر دیا، زراعت اور تجارت کو بھی انھوں نے فروغ دیا، مدارس کثرت سے قائم کیے تاکہ حکومت کو کام کرنے کے لیے حکام مہیا ہو سکیں، اس کے ساتھ داخلی محاذ پر امیر نے سختی سے چوروں اچکوں کا صفایا کر کے اسلامی قوانین کی مکمل تنفیذ کر دی، اس کی وجہ سے امن وامان قائم ہو گیا۔ اس طرف سے بھی اطمینان ہو گیا تو امیر نے چند وفود کی تشکیل کر کے اسپین، فرانس، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ روانہ کیے تاکہ نئی حکومت کے متعلق ان حکومتوں کو بتا سکیں لیکن ان حکومتوں نے خصوصاً اسپین اور فرانس نے ریفی وفد کے ساتھ حقارت کا معاملہ کیا اور ان سے

ملاقات بھی نہیں کی۔ ریفیوں نے جب ہر طرح کوشش کر لی اور انھیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

فوجی نظام میں امیر نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ قبیلے کا سردار اپنی فوج کا خود ذمے دار ہوگا، اس سے نیچے جو شخص ہوگا وہ اپنے ساتھیوں کا ذمے دار ہوگا، ہر شخص مہینے میں دو ہفتے فوجی خدمت انجام دے گا اور دو ہفتے تجارت یا زراعت میں مشغول رہے گا۔ ہر وہ شخص جو فوجی خدمت کے قابل ہے اس پر جہاد فرض ہے۔ کسی وقت بھی اس کو فوجی خدمت کے لیے قریب ترین فوجی مرکز میں طلب کیا جا سکتا ہے اپنا اسلحہ وہ خود حاصل کرے گا، اس کو لباس بھی اپنے گھر سے لانا ہوگا۔ فوجی قیادت کی طرف سے ہر فوجی کو صرف ایک روٹی چوبیس گھنٹے میں ملے گی خواتین کا کام مجروحین کی دیکھ بھال ہوگا۔ جو شخص فوجی احکام کی مخالفت کرے گا اس کو ریف کی سکونت سے محروم کر کے اس کی تمام جائداد کو ضبط کر لیا جائے گا۔

ان تمام قوانین کی سختی سے پابندی کی گئی اور اسپین کے خلاف بھرپور لڑائی چھیڑ دی گئی۔

امیر عبدالکریم نے سب سے پہلے جولائی ۱۹۲۱ء میں ملیلہ میں محدود فوجی یورش کا آغاز کر دیا۔ شہر ملیلہ میں اسپینی فوجوں کی تعداد تیس ہزار تھی اور جدید اسلحہ سے لیس، اس کے برعکس ریفیوں کی تعداد صرف چار ہزار تھی، ان کے پاس بجز بندوق کے کچھ بھی نہیں تھا، لیکن تین دن کے معرکہ میں پچیس ہزار اسپینی مقتول اور اسیر ہوئے، اس حملہ میں اسپینی سپہ سالار جنرل سلوسٹر بھی قتل ہوا۔ دوسرا جنرل فاوور تمام بڑے فوجی افسروں کے ساتھ گرفتار ہوا۔

اس جنگ میں تین سو توپیں، ستر ہزار رائفلیں اور بے شمار دیگر فوجی ساز و سامان اور غذائی ذخیرہ ہاتھ آیا۔

یہ ایسی زبردست شکست تھی کہ اسپینی حکومت نے باقاعدہ اس شکست کے اسباب کا پتہ چلانے کے لیے انکوائری کمیٹی بٹھائی تھی اور فوجی جنرلوں پر مقدمہ چلا کر ان کو سزا دی تھی، پھر بعد میں اسپینی وزارت بھی مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئی۔

۱۹۲۱ء میں ایک دوسرے اسپینی جنرل کو متعین کیا گیا، جس نے اعلان کیا کہ ہم ریف میں عمومی امن قائم کریں گے اور فتنہ و فساد ختم کردیں گے، چنانچہ اس بار دو لاکھ فوجیوں نے ملیلہ پر چڑھائی کردی، ان کے مقابلہ کے لیے صرف بارہ ہزار ریفی سامنے آئے، دو مہینے کے خوں ریز معرکہ میں کسی فریق کو فتح نہیں ہوسکی تو تیسرے مہینہ ریفیوں نے ایک زبردست حملہ کیا، اس حملہ میں اسپینی فوج اپنے ٹھکانوں میں محصور ہونے پر مجبور ہوگئی۔ اسپینی حکومت کو جب سانحہ کا علم ہوا تو اس نے ایک دوسرے جنرل کو بھیجا کہ کسی طرح ریفیوں سے صلح کرلی جائے، لیکن فوجی جنرل تیار نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے مزید پچاس ہزار فوج کی مدد لے کر ریفیوں پر ایک نیا حملہ کردیا، جس میں پھر اسپینی فوج کو شکست فاش ہوئی، جنرل کو کاری زخم آئے اور وہ جانبر نہ ہوسکا۔ تین ہزار فوجی گرفتار اور پانچ ہزار مقتول ہوئے۔

اسپینی حکومت ایک بار پھر ذلیل و خوار ہوکر چار ملین پسیطہ (اسپینی سکہ) دے کر قیدیوں کو چھڑانے پر مجبور ہوگئی۔

۷ر جون ۱۹۲۳ء کو ایک اور معرکہ ہوا جس میں ریفیوں کی تعداد صرف سات ہزار تھی، جب کہ اسپینی فوجوں کی تعداد تیس ہزار تھی، اس معرکہ میں ایک ہزار اسپینی مقتول اور مجروح ہوئے۔

اس کے بعد داغیت شہر میں ایک اور زبردست معرکہ ہوا، اس کے مابعد ریفیوں اور اسپینی نمائندوں کے درمیان صلح کی بات چیت ہونے لگی۔ لیکن یہ گفتگو بھی اس لیے ناکام ہوگئی کہ اسپینی کسی قیمت پر بھی ریفیوں کی آزادی کے دعوے کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ مراکش کے شہر تطوان میں جب صلح کی گفت گو ناکام ہوگئی تو مراکش میں مقیم اسپینی فوج کے جنرل نے اپنی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک مزید زوردار حملہ کیا جائے، لیکن حکومت کے تین وزیروں نے اس نئے حملے کی مخالفت کی ـــ وزیر مالیات نے جنگی اخراجات دینے سے انکار کردیا۔ اس وقت مراکش میں مقیم اسپینی جنرل نے استعفیٰ دے دیا، اس کی جگہ نیا جنرل مقرر کیا گیا۔ لیکن اس بار ریفیوں نے امیر کی قیادت میں اسپینیوں پر حملہ کیا، ادھر اسپین کے شاہی خاندان نے اس جنگ میں فوجیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شاہی خاندان کے شہزادوں کو میدانِ جنگ میں بھیج دیا، یہاں تک کہ

اسپینی خواتین بھی میدان جنگ میں آگئیں۔ بڑے زور کا معرکہ ہوا، جس میں بعض کامیابیاں اسپینی فوج کو حاصل ہوئیں لیکن تین ہزار فوجی مقتول ہوگئے۔ ادھر اسپین میں انقلاب آگیا اور حکومت مستعفی ہوگئی، اور کئی جنرل فوج سے سبکدوش کردیے گئے۔

آخری معرکہ تطوان میں ہوا۔ یہاں بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی بہت سے علاقوں سے اسپینی فوج کو تخلیہ کرنا پڑا۔ اس سنگین صورت حال کو دیکھ کر فرانس نے اپنی فوج۔ جو دو لاکھ کی تعداد میں جدید ترین ساز وسامان سے لیس تھی ــ میدان میں اتار دی۔ یہ جنگ ۱۹۲۶ء تک جاری رہی۔

اتنی بڑی فوج کے سامنے ریفی ٹھہر نہیں سکے۔ بالآخر محمد بن عبدالکریم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔

امیر کو ستمبر ۱۹۲۶ء کے اواخر میں ری یونین جلاوطن کردیا گیا، جہاں انھوں نے اکیس سال جلاوطنی کی زندگی گزاری۔

۱۹۴۷ء میں فرانسیسی حکومت نے امیر عبدالکریم کو ری یونین سے فرانس لے جانے کا ارادہ کیا۔ جب امیر کا جہاز مصری علاقہ پورٹ سعید سے گزر رہا تھا تو اچانک امیر نے مصری حکومت سے سیاسی پناہ کی درخواست کی جو قبول کرلی گئی۔ وہاں مراکش کے چوٹی کے قائدین موجود تھے جس میں حزب استقلال کے قائد علال فاسی، حبیب بورقیبہ، عبدالخالق طریس، محمد بن عبود اور عبدالمجید بن جلون تھے۔

فروری ۱۹۶۰ء میں پہلی بار مراکش کی آزادی کے بعد مراکش کے شاہ محمد الخامس اور امیر عبدالکریم کے درمیان قاہرہ میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے ٹھیک تین سال بعد دل کے دورے میں امیر عبدالکریم خطابی کا قاہرہ میں انتقال ہوگیا۔

اوصاف واخلاق:

معتدل قد وقامت، دوہرا جسم، گول چہرہ صباحت لیے ہوئے، سیاہ آنکھیں، مگر تیز، سر اور داڑھی کے بال گھنے اور سیاہ، چہرے بشرے سے ذہانت، نرمی، شفقت

ومحبت عیاں۔

عمامہ اور مراکشی طرز کا لباس، عموماً سوٹ میں ملبوس، آنکھوں پر عینک۔

ہنستا مسکراتا چہرہ طبیعت کی نرمی اور شفقت کا غماز تھا۔ ملاقات اور کاموں میں خود پہل کرتے، سستی اور بزدلی کو ناپسند کرتے۔ انتھک اور مسلسل سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے، کسی دن راحت اور آرام کا نام نہیں۔

طاقت ور عزم و ارادہ کے مالک، پہلی ہی نظر میں دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا، جیالے اور نڈر ایسے کہ بہ نفس نفیس معرکوں میں خود شریک ہوتے اور فوجی محاذ پر سب سے پہلی صف میں ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پر غیر معمولی ایمان و یقین اور اعتماد و توکل، استقلال اور آزادی کے شیدائی۔

معرکہ جتنا سخت ہوتا، حالات جتنے پیچیدہ اور سنگین ہوتے اتنا ان کی فطری صلاحیتیں اور ذاتی جوہر نمایاں ہوتے۔ اخلاص اور تقویٰ ان کی شخصیت کی شاہ کلید۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یورپ و امریکہ کے اخباری نامہ نگاروں نے ریفیوں کی فوجی کامیابیوں کا بچشم خود مشاہدہ کیا، امیر عبدالکریم سے انھوں نے ملاقاتیں کیں۔ فرانس اور اسپین و برطانیہ کے فوجی جنرلوں اور سیاسی مبصرین نے امیر کی غیر معمولی ذہانت، قوت عمل، حکمت عملی کی تعریف کی اور اس بات کا برملا اقرار کیا کہ اگر امیر عبدالکریم جیسا مرد مجاہد یورپ کو مل جاتا تو اس کی تقدیر بدل گئی ہوتی۔

خالد جاوید شمسی
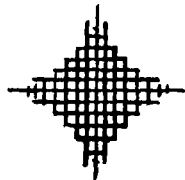
معارف مسجد قرطبہ

حکیم مشرق علامہ محمد اقبالؒ کی وفات پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر ان کے علم و حکمت کے موتی آج بھی اہلِ علم کے لیے اسی طرح آب دار ہیں جس طرح پہلے تھے، بلکہ جوں جوں علم و تجربات میں اضافے ہو رہے ہیں ان کی درخشانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔
جناب خالد جاوید شمسی کا تاثر یہ ہے کہ اقبالؒ کی اکثر نظموں کے پس منظر میں قرآنی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ علم اس نظر سے ان خاکوں پر نظر ڈالیں گے۔

(ادارہ)

۱۔ مردِ خدا کا عمل ہی زندۂ جاوید ہوتا ہے:

دنیاوی زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ بس روز و شب کا ایک سلسلہ ہے جس میں آئے دن پیش آنے والے واقعات کا نقش تیار ہوتا رہتا ہے، رات اور دن زمانے کے دو روپ ہیں جن کے پردے میں خدا کی گوناگوں صفات کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔

انسان کے ہاتھوں سے کیا کیا ممکن ہے اور کیسے کیسے کارنامے انجام پا سکتے ہیں، زمانے کے پاس روزِ اوّل سے اس کا ریکارڈ موجود ہے۔

زمانہ خود ایک کسوٹی ہے جو پرکھ کر بتاتا ہے کہ کون سا عمل زندۂ جاوید ہے۔ ہمارے تمھارے کتنے ہی باطل کارناموں پر وقت نے فنا کی خاک ڈال۔ بڑے بڑے کامل فن کار گردشِ زمانہ کی تاب نہ لا سکے، ان کے ہنر کے معجزے آنی و فانی ہو کر رہ گئے، وقت نے للکار کر کہا:

خبردار!

کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات.
نہ کوئی نقشِ کہن باقی رہا ہے اور نہ کوئی نقشِ نو باقی رہے گا۔
البتہ میری دست بُرد سے صرف وہ عمل محفوظ رہے گا جسے کسی مردِ خدا
نے خدا کے واسطے انجام دیا ہو۔

۲۔ مردِ خدا کا عمل 'عشقِ خدا' سے جاندار ہوتا ہے:

جس کارنامے کی بنیاد رضائے الٰہی ہو وہ کیونکر زندۂ جاوید نہ ہوگا۔ مردِ خدا کے عمل کی بنیاد اس کا جذبۂ والہانہ ہے۔

بڑے بڑے صاحبِ کمال دنیا کے اسٹیج پر اپنے کارنامے دکھا کر چلے گئے اور وقت کا سیلاب ان کے کارناموں کو بہا لے گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ وقت کے تند و تیز دھارے کا مقابلہ اگر کوئی کر سکا تو وہ مردِ خدا کا جذبۂ عشق و محبت تھا۔ گردشِ زمانہ کا مقابلہ عشق ہی کر سکتا ہے۔ 'زمانہ' محدود ہے اور 'عشق' لازوال، کائنات کی ہر شے زمانہ کی زد میں ہے اور زمانہ عشقِ خدا کی زد میں ہے۔ کلام اللہ کا حاصل اور گوہرِ مقصود 'عشق' ہی تو ہے، یہی گوہرِ مقصود 'دمِ جبرئیل' سے 'دلِ مصطفیٰ' پر مترشح ہوا تھا۔ کائنات کی ہر شے عشق کی مستی سے تابناک ہے، پھولوں کی سرمستی اور جامِ جہاں نما کی روشن ضمیری سب عشق کے کرشمے ہیں، اس کے ہزاروں روپ ہیں، اس نے کبھی 'حرم' میں جلوہ افروز ہو کر عالم کی تربیت کی تو کبھی امیرِ جنود بن کر ایماں کے لشکروں کی قیادت سنبھالی۔

عشق زمانے کی قید و بند سے آزاد ہے، جمود کا دشمن ہے، ہمیشہ رواں دواں ہے۔ اس کے 'ہزاروں مقام' ہیں۔

عشق کے بغیر کاروانِ حیات جامد ہے۔ 'تارِ حیات' کے نغمے 'عشق' کی قوت سے پھوٹتے ہیں۔ 'عشق' رزم و بزم کی رونق ہے۔ عشق سے ہی 'نورِ حیات' ہے اور 'عشق' سے ہی 'نارِ حیات' ہے۔ زندگی کی سرگرمی شوق عشق ہی سے عبارت ہے۔

مسجد قرطبہ بھی عشق کا ایک روپ ہے جو ایک مردِ خدا کے جذبۂ عشق سے وجو

میں آیا تھا۔

۳۔ عشق کے لیے قربانی اور خونِ جگر شرط ہے:

ظاہر ہے کہ کوئی بھی فنی کارنامہ خواہ رنگ و آہنگ کا ہو، خشت و سنگ کا ہو یا حرف و آہنگ کا ہو 'جگر کا خون' کیے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ زندگی میں سوز و سرور کی کیفیت 'خون جگر' سے پیدا ہوتی ہے، خونِ جگر کی صلاحیت نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ 'دل' پتھر ہے۔

ہر زندہ جاوید فن پارہ خونِ جگر کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک مردِ خدا نے جگر کا خون کیا تو مسجد قرطبہ[1] خشت و سنگ کا شاہکار بنی اور ایک مردِ خدا نے جگر کا خون کیا تو 'مسجد قرطبہ'[2] حرف و آہنگ کا شاہکار بنی۔ 'خشت و سنگ' کے شاہکار سے 'حضورِ قلب' نصیب ہوا اور 'حرف و آہنگ' کے شاہکار سے انشراحِ قلب کی دولت میسّر ہوئی۔

اگر اسپین کی مسجد قرطبہ سے دل کا حضور ہوتا ہے تو اقبالؔ کی مسجد قرطبہ سے دل کی کشود ہوتی ہے۔

دراصل قربانی اور خونِ جگر جسدِ خاکی کی اصل مایہ ہے، انسان کی حقیقت ظاہر کے اعتبار سے ایک مٹھی خاک سے زیادہ نہیں لیکن خونِ جگر کی مایہ نے قلب انسانی کو خدا کے 'عرش' کا درجہ عطا کیا ہے۔

فرشتے حالانکہ 'پیکر نوری' ہیں لیکن 'خونِ جگر' کی صلاحیت سے محروم ہونے کے باعث سوز و گداز کی لذّت سے نا آشنا ہیں خون جگر ہی کی مایہ ہے جس نے 'جسم خاکی' کو 'جسم نوری' سے بلند مرتبہ عطا کر دیا ہے۔ زندگی میں رچاؤ اور ذوق و شوق خونِ جگر ہی سے آتا ہے اور ذوق و شوق نہ ہو تو شاعر کا 'صلوٰۃ و درود اور نعرۂ اللہ ھو' سب بے نور ہو جائیں۔ وہ مسجد قرطبہ سے کہتا ہے کہ تو اس بات پر گواہ ہو جا کہ میری 'لے' اور 'نے' میں 'ذوق و شوق' کی کیفیت زندہ ہے اور 'اللہ ھو' کی لذّت سے میں سرشار ہوں۔

---

[1] عمارت　　[2] مراد نظم

۴۔ مسجد قرطبہ مردِ خدا کے ذوق و شوق کا مظہر ہے:

مسجد قرطبہ مردِ خدا کا زندۂ جاوید شاہکار ہے، اس کی بنیاد پائدار ہے، اس کے بے شمار ستون ایسے حسین و جمیل دکھائی دیتے ہیں جیسے شام کے صحرا میں کھجور کے بے شمار درختوں کا ہجوم ہو۔

جلال کا یہ عالم گویا اس کا بلند مینار جبرئیل امین کی جلوہ گاہ ہو اور بام و در سے 'وادیِ ایمن' کا نور ٹپک رہا ہے۔

یہ سارا جلال و جمال کسی مردِ خدا کے جلال و جمال کا عکس اور اس کی صفات و کردار کا مظہر نہیں تو اور کیا ہے۔ مردِ خدا کبھی مٹ نہیں سکتا، اس کی اذان میں آج بھی 'ضربِ کلیمی' اور 'صدقِ ابراہیمی' کی حلاوت موجود ہے۔

مردِ خدا کے شوق کی تکمیل کے لیے زمین و آسمان کی وسعتیں تنگ ہیں۔ دجلہ و دینوب و نیل اس کے عمیق سمندر کی معمولی لہریں ہیں اس کی تاریخ بڑی تابناک ہے اور اس کی داستانیں بڑی عجیب ہیں، اس کے دم سے عہدِ قدیم کا کاروانِ حیات جادہ پیما ہوا تھا، اس کی سرمستی بزمِ کائنات کی رونق تھی اور اس کی سرگرمی رزمِ حیات کی روح تھی۔ وہ 'اربابِ ذوق کا ساقی' اور 'میدانِ شوق کا فارس' تھا، وہ خدا کا سپاہی تھا اسے لا الٰہ کی پناہ حاصل تھی اس کے سامنے کائنات کی مادی قوتیں سرنگوں ہوگئی تھیں، اس کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُسے صفحۂ ہستی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔

۵۔ مردِ خدا کی صفات اور ان کا مقام:

مسجد قرطبہ کی زیارت سے مردِ خدا (بندۂ مومن) کی بہت سی خوبی صفات عیاں ہوگئیں۔

دن کے اُجالے میں اس کی جدوجہد اور سرگرمیٔ عمل کا عالم اور رات کے اندھیرے میں اس کی آہ و زاری، اس کے دنوں کی تپش، اس کی راتوں کا سوز و گداز، اس کی بلند خیالی، اس کی عالی ہمتی، اس کے سرور، اس کے شوق اور اس کے ناز و نیاز کا کچھ اندازہ ہوا۔

اقوامِ عالم میں اس کا مقام بلند ظاہر ہوا۔

اس کا ہاتھ گویا خدا کا ہاتھ ہے جس کی صفت غالب وکار آفریں ہونا اور کار کشائی و کار سازی ہے۔

وہ اگرچہ 'خاکی' ہے لیکن 'نوری نہاد' ہے، وہ 'بندہ' ہے لیکن 'مولا صفات' ہے اس کا دلِ بے نیاز دونوں جہان سے 'غنی' ہے وہ لمبی امیدیں نہیں باندھتا' امیدیں قلیل' لیکن مقاصد جلیل' رکھتا ہے۔

اس کی اداؤں میں دلفریبی اور نگاہوں میں 'دلنوازی' کی شان ہے، وہ گفتگو میں نرم اور اپنی جستجو میں سرگرم ہے۔ 'رزم' ہو یا 'بزم' اس کا دل ہمیشہ پاک اور پاکباز ہے۔ وہ 'نکتۂ پرکارِ حق' ہے جس کے مقابل ساری کائنات بے حقیقت ہے، اس کے 'دل کا یقین' خدا کا مقصود نگاہ ہے۔

اس کی فراست عقل کا منتہا ہے اور اس کی قوت عمل 'عشق کا حاصل' ہے اور خدا کی ساری کائنات میں روح رواں اور گرمیٔ محفل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۶۔ مسجد قرطبہ بندۂ مومن کے ماضی کی دستاویز ہے:

'مسجد قرطبہ' ایک طرف 'ارباب فن' کا کعبہ ہے تو دوسری طرف "دین مبین" کی عظمت وسطوت کا نشان ہے، اس کے بے نظیر حسن کا نقش اوّل بندۂ مومن کے حسین وجمیل قلب میں پہلے اُبھرا تھا۔ وہ سارے عالم میں بے نظیر ہے اور قلب مومن کی طرح حسین وجمیل ہے۔

افسوس اس کے بنانے والے مردانِ حق، عربی شہسوار، صاحبانِ صدق ویقیں، اور حاملانِ خُلق عظیم رخصت ہو چکے، انھوں نے بادشاہت میں فقیری کی تھی۔

ان کے طرزِ حکومت نے اس عجیب وغریب حقیقت کو ثابت کر دیا کہ اہلِ دل کی حکومت شاہی نہیں بلکہ فقر اور درویشی ہوتی ہے۔

ان کے فیضانِ نظر سے مشرق ومغرب کی تربیت ہوئی اور ان کے فیضانِ عقل سے یورپ میں روشنی آئی۔

انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سرزمین ہسپانیہ کو سینچا تھا جس کے اثرات آج تک اندلس کے باشندوں کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اہلِ اندلس کی روشن پیشانی

سادگی، خوش دلی، محبت و اخوت، ان کا دل آویز حسن، غزالاں جیسی آنکھیں، دلنشیں ناز و انداز سب سے اُن گزرے ہوئے اہلِ دل کی خوشبو آ رہی ہے۔

اسپین کے رنگ و روپ میں یمن کی 'خوبو' اور خوش گفتاری میں حجازی لہجہ آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ ہر زوال کے بعد عروج آتا ہے:

افسوس صدیوں سے اس کی فضا اذان و تکبیر کی گونج سے محروم ہے۔ خدا جانے مردانِ خدا کا آبلہ پا کارواں جو عرب سے اسپین پہنچا تھا کون سی وادی میں جا کر کھو گیا اور کون سی منزل میں جا کر ٹھہر گیا!

المانیہ کے فکری انقلاب نے یورپ کو نشأۃ ثانیہ سے روشناس کرایا، اصلاحِ دین کی تحریک نے وہاں کلیسا کی بساط الٹ دی، روایت کے جمود نے وہاں دم توڑ دیا اور فکر کی کشتی نازک رواں ہو گئی، اس کے بعد فرانس میں یہی کیفیت ہوئی جس کا اثر پوری عیسائی دنیا پر پڑا اور انگلستان تجدید مذہب اور تجدید علوم و فنون سے جگمگا اٹھا۔ روم جیسی قدامت پرست قوم نے بھی انگڑائی لی اور حیاتِ نو سے سرفراز ہوئی۔ اب کیا عالمِ اسلام کی باری ہے!

راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے آسمان کیا رنگ بدلتا ہے،

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

۸۔ مستقبل کا خواب:

منظر:

دور پہاڑ کی وادی میں سرخیٔ شفق نے بادلوں کو رنگ میں ڈبو دیا ہے، جیسے سورج جاتے جاتے لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا ہو۔ (باقی صفحہ ۵۶ پر)

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں

ملک فیصل ایوارڈ:

ماہ شعبان کے وسط میں سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ملک فیصل ایوارڈ کی تقسیم کا گیارہواں شاندار اجلاس منعقد ہوا، جس میں انعام یافتگان کے علاوہ ممتاز علمار، مملکت کے سربرآوردہ اشخاص، اعیانِ شہر اور ریاض میں مقیم سفراء اور شہزادگان عالی مقام شریک ہوئے، ملک فہد بن عبدالعزیز کی نیابت ولی عہد، مجلس وزرار کے نائب صدر اور سعودی فوج کے سربراہ شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے کی، اور انعام یافتگان میں ایوارڈ تقسیم کیے۔

ادارہ ملک فیصل عالمی ایوارڈ ایک عالمی ادارہ ہے جو ملک فیصل شہید کی یادگار کے طور پر ۱۳۹۹ھ میں قائم ہوا، اس وقت سے ہر سال اہل علم اور اہلِ ہنر کی قدر افزائی کے طور پر ایوارڈ دیتا ہے، ایوارڈ کے لیے پانچ شعبے متعین ہیں: (۱) خدمتِ اسلام (۲) دراساتِ اسلامیہ (۳) ادب عربی (۴) طب اور (۵) سائنس، ان میں سے ہر شعبہ میں ساڑھے تین لاکھ سعودی ریال کی رقم متعین ہے۔ یہ رقم محض ایک رمز ہے ورنہ مقصود اہلِ علم کی ہمت افزائی اور قدردانی ہے۔

۱۹۸۹ء کے لیے خدمت اسلام کے شعبہ میں مشہور مصری عالم شیخ محمد الغزالی کو ایوارڈ دیا گیا ہے۔
۱۹۷۹ء میں جب اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تو خدمت اسلام کے شعبہ میں پہلے سال کا انعام جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو ملا، دوسرے سال ۱۹۸۰ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اور انڈونیشیا کے ڈاکٹر محمد ناصر کو دیا گیا، ان کے علاوہ جن ممتاز افراد کو خدمتِ اسلام کے شعبہ میں انعام سے نوازا گیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) ملک خالد بن عبدالعزیز مرحوم (۲) شیخ عبدالعزیز بن باز (۳) شیخ حسنین محمد مخلوف (مصر)
(۴) ملک فہد بن عبدالعزیز (۵) عبدرب الرسول سیاف (افغانستان) (۶) استاد احمد دیدات (جنوبی افریقہ)
(۷) ڈاکٹر رجا رجارودی (فرانس) اور (۸) شیخ ابوبکر محمود جومی (منیجر) (۹) ٹنکو عبدالرحمٰن (ملیشیا)

سال رواں میں دراسات اسلامیہ کے لیے عراقی عالم ڈاکٹر صالح احمد العلی کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ گزشتہ برسوں میں اس شعبے میں (۱) ڈاکٹر فواد سزگین (ترکی) (۲) ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمی (ہندی نژاد سعودی) (۳) ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی (ہندوستانی) (۴) شیخ محمد عبدالخالق عضیمہ (مصری) (۵) شیخ مصطفےٰ زرقا (شامی) (۶) ڈاکٹر محمد رشاد سالم (سعودی) (۷) ڈاکٹر فاروق احمد الدسوقی (مصری) ڈاکٹر مصطفےٰ محمد سلیمان (مصری) (۹) ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالکریم الدوری (عراق) (۱۰) استاذ محمد قطب شاذلی (مصری) (۱۱) اور ڈاکٹر مقداد یالجن محمد علی (ترکی) کو انعام سے نوازا گیا۔

اس سال ادب عربی کا انعام شام کے ڈاکٹر شاکر الفحام اور مصر کے ڈاکٹر یوسف خلیف کو نصف نصف دیا گیا ہے، گزشتہ برسوں میں جن لوگوں نے یہ انعام حاصل کیا ان کے اسمار گرامی یہ ہیں:
(۱) ڈاکٹر احسان عباس (فلسطینی) (۲) ڈاکٹر عبدالقادر القط (مصری) (۳) عبدالسلام محمد ہارون (مصری) (۴) ڈاکٹر ناصر الدین الأسد (اردنی) (۵) ڈاکٹر احمد شوقی ضیف (مصری) (۶) ڈاکٹر محمود محمد شاکر (مصری) (۷) پروفیسر محمد بہجۃ الأثری (عراقی) (۸) ڈاکٹر محمد بن شریفہ (مراکشی) (۹) ڈاکٹر محمود یوسف علی مکی (مصری)۔

سال رواں میں طب کا انعام برطانیہ کے ایڈورڈ رابرٹ جیفری اور امریکہ کے لوئیگی ماسٹریونی نے نصف نصف حاصل کیا ہے، جب کہ سائنس کا انعام جرمنی کے ڈاکٹر تھیوڈر ہنریٹ اور مصری نژاد امریکی ڈاکٹر احمد حسین زدیل نے نصف نصف حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسین زدیل پہلے مسلمان سائنسداں ہیں جنھیں لیزر کی شعاعوں کے سلسلے میں تحقیق پر ملک فیصل عالمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، یہ گزشتہ ۱۶ برسوں سے اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں اور امریکہ، جرمنی اور دیگر ممالک سے عالمی سطح کے ۱۶ ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں، ڈاکٹر زدیل اصلاً مصری ہیں لیکن اس وقت امریکہ میں مقیم ہیں اور امریکی شہریت کے حامل ہیں، مصر کو چھوڑ کر امریکہ میں قیام کرنے کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ مصر میرا وطن ہے اس سے محبت اور تعلق خاطر فطری ہے لیکن امریکہ

میں مجھے تحقیق و ریسرچ کا کام کرنے کی جو سہولت اور آزادی حاصل ہے، مصر میں اس کا امکان نہیں تھا۔ ایک تو اس کے وسائل محدود ہیں، دوسرے وہاں بیوروکریسی کا تسلط ہے، ایسی فضا میں تحقیقی کام آزادی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ تعلیم کے بعد اگر مصر جاتا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کسی یونیورسٹی میں ملازمت مل جاتی اور طویل عرصہ کی محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد ممکن تھا کہ پروفیسر بن جاتا لیکن وہ کام نہیں ہو پاتا جس کے مواقع مجھے امریکہ میں ملے ہیں۔

ڈاکٹر احمد زویل نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ جدید ٹکنالوجی میں لیزر کی شعاعوں کی بڑی اہمیت ہے، کمپیوٹر کی ایجاد نے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ طب، زراعت، صنعت، فوجی امور اور اسٹاروار میں اس کا استعمال بکثرت ہونے لگا ہے، روز بروز اس کے استعمال کے میدان میں وسعت ہوتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر احمد زویل نے کہا کہ جب مسلمانوں کے دلوں میں حوصلہ اور ولولہ تازہ تھا تو انھوں نے سائنس اور طب کے میدان میں گراں قدر اضافے کیے اور سائنس کی تاریخ میں اپنا نام ثبت کر دیا، جابر بن حیان اور حسن بن ہیثم کے کارناموں کو دنیا نظر انداز نہیں کرسکتی۔ کیمیا اور الجبرا کے الفاظ خالص عربی ہیں لیکن دوسری زبانوں میں بلا تکلف مستعمل ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ دونوں مسلمانوں اور عربوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ ڈاکٹر احمد زویل کی یہ بات آب زر سے لکھے جانے کی لائق ہے کہ سرمایہ سے ٹکنالوجی خریدی نہیں جاسکتی ہے، اس کے لیے محنت جاں فشانی اور عرق ریزی کی صفات پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر مسلمان آج بھی اپنے اندر یہ صفات پیدا کرلیں تو سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اپنا نام روشن کرسکتے ہیں۔

جنوبی افریقی ممالک میں رابطہ ادب اسلامی کی شاخ:

۲۸ فروری ۱۹۸۹ء کو جنوبی افریقی ممالک میں (جنھیں Southern Africa کہا جاتا ہے) رابطہ ادب اسلامی کی شاخ کا افتتاح ہوا۔ ان ممالک میں زمبابوے، زمبیا، ملاوی، موزمبیق، بوتسوانہ، سوازی لینڈ، لسوتو، نمبیا اور جنوبی افریقہ شامل ہیں۔ رابطہ کا افتتاح ماہنامہ 'ذکر و فکر' کے رکن ادارت جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی نے کیا۔ افتتاحی تقریر میں موصوف نے اسلامی ادب کے فروغ اور اس کی ترویج و تشجیع پر زور دیا۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی

رابطہ کے ٹرسٹی بھی ہیں۔ بہ حیثیت ایک ذمہ دار رکن کے انھوں نے رابطہ کی تاسیس کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ادب کے ذریعہ ملحدانہ افکار کی تبلیغ سارے عالم میں ہو رہی ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے ادب کی حفاظت کریں اور اس میں اسلامی عناصر کو داخل کریں۔ انھوں نے پروفیسر سید حبیب الحق صاحب ندوی کا جو جامعہ ڈربن میں شعبہ عربی، اردو اور فارسی کے صدر ہیں، تعارف کراتے ہوئے کہا کہ رابطہ کے مرکزی دفتر نے پروفیسر ندوی کو ساؤدرن افریقہ کے لیے مدیر عام (ڈائرکٹر جنرل) مقرر کیا ہے۔ پروفیسر حبیب الحق اس علاقہ میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کر رہے ہیں اور اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں اس لیے رابطہ ادب اسلامی کی نظر انتخاب اُن پر پڑی۔ امید ہے کہ یہ انتخاب اسلامی ادب کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔

رابطہ کا افتتاح کرنے کے بعد مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی نے مدح نبویؐ پر تقریر کی جو ان کا میدان اختصاص بھی ہے۔ کعب بن زہیر کی بانت سعاد اور بوصیری کے قصیدہ بردہ کا تعارف بھی کرایا۔ ادب کو لامقصدیت اور فلسفہ التذاذ وحظ سے نجات دلا کر بامقصدیت کا حامل تیار کرنے پر زور دیا اور دانشوروں کو مغرب کی مرعوبیت اور احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تلقین کی۔ مدیر عام پروفیسر حبیب الحق ندوی نے مغربی ادبیات پر تقابلی مطالعہ کی سرپرستی شروع کرنے کی یقین دہانی کرائی تاکہ ادب اور دانشوروں کو مغرب کی مرعوبیت سے آزاد کرایا جا سکے۔

بیت الزّکاۃ کویت:

'ذکر و فکر' کے گزشتہ شماروں میں کویت کے بعض اداروں کا تذکرہ آچکا ہے۔ کویت کا ایک مشہور اور مقامی ادارہ بیت الزکاۃ بھی ہے۔ اس کی سرگرمیاں کویت سے باہر تک وسیع ہیں، ابھی حال ہی میں کویت کے بعض پرچوں میں اس کی ایک اجمالی رپورٹ شائع ہوئی ہے اس کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے اس کی کارگردگی پر روشنی پڑتی ہے، یہ ادارہ مخیر حضرات سے زکاۃ کی رقم جمع کرتا ہے اور ضرورت مند افراد اور دینی و رفاہی اداروں کی مدد کرتا ہے۔

رپورٹ کے مطابق یہ ادارہ کویت کے اندر ماہانہ ۱۱۷۰ خاندانوں کو مالی امداد فراہم

کرتا ہے۔ یکمشت جن خاندانوں کی مدد کی ہے ان کی تعداد ۹۴۵۵ ہے، ۱۰۲ خاندانوں نے اس سے قرض حسنہ لیا ہے۔ ۲۲ مقامی تنظیموں کی امداد کی ہے، اسی طرح ۱۹ زکاۃ کمیٹیوں کے ساتھ تعاون کیا ہے اور ان کو مالیات کی فراہمی میں مدد کی ہے، سامان کی شکل میں جن افراد کی مدد کی ہے ان کی تعداد ۲۶ ہزار ہے، ۴۳ طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دوسرے ممالک روانہ کیا اور ان کے مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے، جامعہ ازہر میں زیر تعلیم ۱۳۴ افریقی طلبہ کی کفالت کر رہا ہے، اب اس نے اپنی خدمت دائرہ مزید وسیع کیا ہے اور ضیوف الرحمٰن (حج کرنے والے افراد) کی خدمت بھی شروع کر دی ہے یعنی ایسے افراد جو حج کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن بروقت مالی پوزیشن خراب ہونے کے سبب حج کے مصارف برداشت کرنے سے قاصر ہوں ایسے افراد کے ساتھ یہ ادارہ تعاون کرتا ہے چنانچہ گزشتہ سال اس نے ۴۴ حجاج کے مصارف سفر برداشت کیے اور انھیں حج سے مشرف ہونے کا موقع فراہم کیا۔

مذکورہ بالا اعداد شمار کویت سے متعلق ہیں یعنی مقامی طور پر اس کی کارکردگی کا اجمالی خاکہ ہے، کویت سے باہر کے مسلمان بھی اس ادارہ سے مستفیض ہو رہے ہے، رپورٹ کے مطابق ۲۱۱ رفاہی اداروں اور مسلم تنظیموں نے اس سے امداد حاصل کی ہے، بیرون کویت مساجد کی تعمیر، شفاخانوں کے قیام، کنوؤں، ٹیوب ویلوں اور مدارس کے ۴۴ منصوبوں پر سرمایہ لگا رہا ہے، ان میں سے ۲۵ منصوبے ۱۹۹۷ء میں پایہ تکمیل کو پہنچے۔

قربانی کا گوشت ضرورت مند ممالک بھیجنے کے پروگرام میں بھی اس نے حصہ لیا ہے۔ ۲۲ ممالک میں موجود ۵۷۵۱۲ یتیموں کی کفالت کر رہا ہے ان کے علاوہ تقریباً ۶ ہزار یتیموں کی کفالت میں دوسرے اداروں کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ قرآن مجید کے ۶۵ ہزار نسخے طبع کرا کر پاکستان، نیجر، فلپائن اور بعض دوسرے ممالک میں تقسیم کیے ہیں، ہندوستان کے بھی کچھ ادارے بیت الزکاۃ کویت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ کویت کے صرف ایک ادارے کی کارکردگی کا اجمالی خاکہ ہے، اس طرح کے دوسرے ادارے بھی ضرورت مند افراد، رفاہی تنظیموں اور دینی اداروں کو تعاون پیش کر رہے ہیں، اخبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان رفاہی اداروں کا رخ زیادہ تر افریقہ کی طرف ہے کیونکہ وہاں جہالت بھی ہے اور غربت بھی، جس کی وجہ سے عیسائی مشنریاں موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں، ان کی روک تھام متبادل سرگرمیوں

کے ذریعہ ہی کی جاسکتی ہے چنانچہ بعض اداروں نے انفق دینارًا وانقذ مسلمًا کو اپنا شعار بنایا ہے، یعنی ایک دینار خرچ کرو اور ایک افریقی مسلمان کو عیسائیت کے دام تزویر کا شکار ہونے سے بچاؤ۔

رسول اکرمؐ کی پیشین گوئیوں پر ریسرچ :

مصری اخبارات کے مطابق ایک ہندوستانی نژاد اسکالر نے اپنے ماجستر (ایم اے) کے مقالہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کو موضوع بنایا اور تقریبًا چار سو صفحات پر مشتمل مقالہ تیار کیا۔ جس کا گزشتہ دنوں جامعہ ازہر کی کلیہ اصول الدین میں مناقشہ ہوا۔ مقالہ نگار نے دکھایا ہے کہ حضور کی پیشین گوئیوں کی تعداد جو مختلف صحابہ کرام سے مروی ہیں اور ذخیرۂ احادیث میں مذکور ہیں [illegible] ہیں اور یہ ساری پیشین گوئیاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق حرف بحرف پیش آچکی ہیں، ان کے علاوہ ۲۸ پیشین گوئیاں ایسی ہیں جو قرب قیامت اور علامات قیامت سے تعلق رکھتی ہیں، جن کے بارے میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ وہ صادق ومصدوق کی فرمودہ ہیں اس لیے وہ ضرور وقوع پذیر ہوں گی۔

مقالہ نگار کا نام محمد ولی ہے، یہ بمبئی کے مشہور تاجر صوفی عبدالرحمٰن صاحب کے فرزند ارجمند ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں اور اب انھوں نے جامعہ ازہر سے حدیث میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔

بقیہ صفحہ (۵۰) معارف مسجد قرطبہ

اِدھر گاؤں کی سمت سے ایک سادہ رنگین صدائے نغمہ جگر کے زخم کریدر رہی ہے۔

جوانی کا عالم کیسا روح افزا ہوتا ہے۔

دریائے کبیر کے کنارے ایک شخص تصوّرات میں کھویا ہوا کھڑا ہے گویا کسی اور زمانے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ اس کے تصوّر میں آنے والا ایک نیا دور ہے جو ابھی پردۂ تقدیر میں ہے لیکن اس شخص کی نگاہوں میں اس کی سحر کا منظر القا ہو چکا ہے، اس کے خیالات سے اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو زمانہ تلملا اٹھے گا۔

اس کے تصور میں ایک انقلاب ہے، وہ انقلاب جس کے بغیر حیات موت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس کے وجود سے مُردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔

جو قوم ہر لمحہ اپنا محاسبہ کرتی رہے وہ دستِ قدرت میں تلوار رہے۔ اس انقلاب کا خلاصہ ہے قربانی اور خونِ جگر :

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

ماہنامہ

ذکر و فکر

دہلی

جلد (۶) ــــــ ماہ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

شمارہ (۳) ــــــ ماہ جولائی ۱۹۸۹ء

ترتیب

افتتاحیہ	۱۔ مذاکرات	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲
	۲۔ خطبۂ استقبالیہ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۷
مقالات	۳۔ فوائد الفواد	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۱۸
جائزے	۴۔ اسلام کیا ہے؟	ترجمہ مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی	۲۵
تحقیقات	۵۔ فنونِ لطیفہ کی شہ رگ	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی	۲۵
	۶۔ عہد سعادت	پروفیسر اختر اقبال کمالی	۴۴
ادب	۷۔ معارف ذوق و شوق	خالد جاوید شمسی	۴۵
ادبیات	۸۔ عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں	ترتیب: مولانا شفیق الرحمن ندوی	۵۲

۲

مولانا عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

یہ بات مشکل سے سمجھ میں آئے گی کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام دشمنی نے ایک وبائی شکل کیونکر اختیار کرلی ہے، مسیحیت کے مبلغ، یہودی سیاستداں اور منعصب مستشرقین اگر اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں تو اس کے اسباب ہیں، کچھ ایسے لوگ جنھوں نے تاریخ عالم اور مذاہب کی تاریخ کا خاص زاویے سے مطالعہ کیا ہے ان کے آباء واجداد نے ترکوں کے ہاتھوں زک اٹھائی ہے، وہ اگر اپنی موروثی عداوت کا اظہار کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس معاندانہ ماحول میں ان کی ذہنی پرورش ہوئی ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ اسلام کو اپنا حریف اول سمجھیں کیونکہ اسلام کا مطالعہ انھوں نے ایک تنگ دائرے میں رہ کر کیا ہے اور اسلام کے بارے میں ان لوگوں کی تحقیقات پر اعتماد کیا ہے جو ان کے تسلیم شدہ دانشور ہیں اور وہ بحث وتنقیح کے اسلوب میں اسلام اور سیرت نبویؐ کو پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم کو ترجمہ کے پردے میں مسخ کرکے دکھاتے ہیں، نیز یہ کہ مسلمانوں نے کوئی سنجیدہ اور ٹھوس کام اس طرح کا نہیں کیا کہ اہل یورپ اور امریکہ کو اسلام کا صحیح رُخ دکھا سکیں، اور اگر چند افراد ایسے ہوئے بھی جنھوں نے ان معاندانہ تحقیقات کا مطالعہ کیا تو اس کا جواب اس طرح نہیں دیا جس سے ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا، ان کے مغالطوں کا تجزیہ کرکے بتایا ہوتا کہ مقدمات کی ترتیب میں انھوں نے کس طرح دجل وفریب سے کام لیا ہے، مسلمانوں کی جن کتابوں اور تفسیروں کے حوالے دیے ہیں ان کا علمی پایہ کیا ہے، جن احادیث سے استدلال کرتے ہیں ان کا محدثین کے یہاں کیا درجہ ہے۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو اپنی مقامی زبان میں لکھا اگر بعض عرب فضلاء نے ان کا احتساب بھی کیا تو عربی میں لکھا اور اس کا حلقۂ اشاعت عربی دانوں تک محدود رہا۔ سید قطب، محمد قطب، محمد الغزالی، انور الجندی، مصطفی السباعی، اور ان سے پہلے عباس محمود العقاد، احمد امین، مصطفی صادق الرافعی نے ان کا تعاقب کیا بھی تو اس کا فائدہ اس حد تک تو ضرور ہوا کہ بہت سے عرب نوجوانوں کے ذہن میں اسلام کے متعلق کوئی بدگمانی نہیں رہی اور جب انھوں نے

اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے مغربی ممالک کا سفر کیا تو وہ مستشرقین کی تحقیقات سے مرعوب نہیں ہوئے، جبکہ برصغیر ہند و پاک کے متعدد دانشور آسانی سے ان کا شکار بن گئے کیونکہ ان کی معلومات اسلام سے متعلق صفر کے برابر تھیں، انھوں نے قرآن کریم کو بھی انگریزی ترجموں کی مدد سے پڑھا تھا، ان کو اسلام سے بے تعلق یا برگشتہ دیکھ کر مغربی ممالک کی ان درسگاہوں میں جہاں انھوں نے آنکھیں کھولیں اعلیٰ علمی اسناد سے نوازا گیا، محقق و مبصر کا خطاب دیا گیا، ان کا پروپگنڈہ کیا گیا، تاکہ ان کی تحقیقات کو اہلِ مشرق وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔

راقم جس زمانہ میں لیڈز یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے لیے وقت گزار رہا تھا، آکسفورڈ کے ایک پروفیسر جن کا موضوع مذاہب کا تقابلی مطالعہ تھا تشریف لائے ۔ کسی چرچ میں ان کی تقریر کا پروگرام تھا، دعوت نامہ مجھے بھی ملا۔ موصوف نے دینی مسائل اور مذاہب کے مطالعہ کے سلسلہ میں اس بات پر زور دیا کہ تحقیق کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جس کے اندر علمی ذوق ہو، وسعت قلبی ہو، مطالعہ غیر جانبدارانہ ہو۔ خالص علمی انداز کا لکچر تھا، کہیں سے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسلام یا کسی مذہب کے خلاف جذبۂ عناد رکھتے ہیں، مگر وقفۂ سوالات میں ایک پاکستانی طالب علم نے دریافت کیا کہ آپ کی نظر میں ہمارے ملکوں میں کوئی ایسا صاحب علم، ذہین اسکالر ہے جس کی تحقیقات قابلِ اعتبار ہوں ؟ پروفیسر موصوف نے صرف ایک پاکستانی محقق کا نام لیا جنھوں نے اس زمانہ میں اسلام کے نظام زکوٰۃ پر تنقید کی تھی اور اپنی شاذ و انفرادی رائے کو برملا پیش کر رہے تھے، حکومت پاکستان نے ان کو اپنے سرکاری مرکز تحقیقات کا سربراہ بنا دیا تھا اور صرف وہی ان کو اول و آخر تنہا ذہن رسا، فکر بلند، اور علم و تحقیق کے جویا نظر آئے۔

لیکن یہ سب باتیں خالص علمی حلقوں اور درسگاہوں کی ہیں، عوام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، جہاں تک نوجوانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایک مذہب سے نہیں بلکہ جملہ مذاہب سے بیزار ہیں، "راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا" کے نظریہ کے علاوہ کوئی نظریہ مقبول عام نہیں ہے، اسکولوں میں یا کسی مذہب کے خلاف اس طرح دل و دماغ نہیں ڈھالے جاتے جس طرح ہمارے سیکولر ملک میں بچے بچے کے دماغ میں اسلام دشمنی کے تخم بوئے جاتے ہیں اور جس طرح یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی پائی جاتی ہے اور

فرقہ وارانہ قتل عام ہوتا رہتا ہے وہ بھی وہاں نہیں ہوتا، پھر کہاں سے اور کس طرح اسلام دشمنی کے جراثیم عوامی سطح پر پھیلتے ہیں؟

اس کا جواب تصورات و تخیلات کی بنا پر نہیں، خالص واقعاتی دنیا کے مشاہدات کی روشنی میں ڈاکٹر ابراہیم امام (مصری) کے ایک مضمون میں ملا جو ۲۵ رمضان ۱۴۰۹ھ کے 'الشرق الاوسط' میں شائع ہوا ہے۔ مضمون طویل ہے، خلاصہ یہ ہے کہ موصوف گزشتہ ۳۰ سال سے وہاں کی ایک مقتدر یونیورسٹی میں مڈل ایسٹ سکشن میں لکچرر تھے، ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کو عوامی سطح پر بدنما، خونخوار، اور انسان دشمن مذہب دکھانے کی منظم سازش یہودیوں کی طرف سے ہوتی ہے' وہ ٹیلی ویژن کے ان سنجیدہ پروگراموں کے اندر جن میں اعلیٰ درجہ کی علمی تحقیقات اور سائنس کی معلومات' ریاضیات کی بحثیں پیش کی جاتی ہیں اسلام کا کردار ایک بھیانک اور خوفناک دشمن انسانیت کی شکل میں پیش کرتے ہیں' یہ ٹیلی ویژن پروگرام بظاہر بہت اصولی اور با مقصد ہوتے ہیں، اور عام طور پر مشہور یونیورسٹیز کے ماہرین فن کو دعوت دی جاتی ہے کہ کسی خاص موضوع پر اظہار خیال کریں۔ موضوع بھی اس طرح کا ہوتا ہے جس سے کسی کو گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مذہب یا مدرسۂ فکر کی مخالفت کے لیے تیار کیا گیا ہے، مثلاً "اورنٹیل اسٹڈیز" کا ایک سلسلہ (SERIES) چل رہا ہے جو پرنسٹن یونیورسٹی (PRINCETON U.) کے ماہر مشرقیات اساتذہ کی سرپرستی میں جاری ہے۔ واضح رہے کہ امریکہ کی چار مشہور یونیورسٹیز کالفورنیا، ہارورڈ، ویل، اور پرنسٹن کا درجہ امریکہ میں وہی ہے جو فرانس میں سوربن اور برطانیہ میں کیمبرج اور آکسفورڈ کا ہے، جن کا عوام و خواص بلکہ حکومت پر بھی رعب ہے' ان درسگاہوں کے قدیم تجربہ کار اساتذہ کی تحقیقات کو لوگ آنکھ بند کر کے تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے ان کو ایک طرح کا تقدس حاصل ہوتا ہے، ان کا فرمایا ہوا واقعی 'مستند' سمجھا جاتا ہے۔ پرنسٹن میں اورنٹیل اسٹڈیز کے اخراجات 'فورڈ کمپنی' دیتی ہے، جو خود ایک وقیع بات ہے' وہاں مشرقیات کے مطالعہ کے متعدد حلقے (اسٹڈی گروپ) ہیں، ایک کا موضوع علم النفس (سیکالوجی) ہے، دوسرے کا اقتصادیات' تیسرے کا علم الاجتماع (سوشیولوجی) ظاہر ہے یہ مضامین بھی وقت کے اہم مضامین ہیں اور بے رنگ و بو ہیں، کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ علم النفس کے موضوع پر جو سیمینار ہوگا اس میں دو تہائی بحثیں ایسی ہوں گی جن کی زد اسلام پر پڑے گی، اور دکھایا جائے گا کہ مڈل ایسٹ میں جو صحرائی جزیرے ہیں ان کی نفسیات'

اُن علاقوں سے مختلف ہے جہاں برف باری ہوتی ہے اور جہاں قدرتی پیداوار زیادہ ہے۔صحرائی جزیروں کے رہنے والوں میں نخوت اور منافقت، شہوت پرستی خود غرضی زیادہ ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ 'اسلام' کی دعوت کے لیے یہ خطۂ زمین سازگار ثابت ہوا۔

لُطف یہ ہے کہ ان سیمناروں میں کسی مسلمان اسکالر کو دعوت نہیں دی جاتی حالانکہ خود اس یونیورسٹی کے اندر اور باہر امریکہ کے ہر صوبہ بلکہ ہر شہر میں بے شمار مسلم اسکالرس موجود ہیں۔کیونکہ اگر وہ ان مباحث میں شریک ہونے تو بتا سکتے تھے کہ اسی سنگلاخ زمین میں اسلام نے اخلاص عمل، فداکاری، دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پیدا کیا، نیز یہ تجزیہ کہ اس علاقہ کے رہنے والے سب کے سب ان امراض کے شکار تھے جن کا دعویٰ کیا گیا تاریخ سے ثابت نہیں، عرب شعراء کے یہاں مروّت، انسانیت، جوار کا حق، گرتے پڑتے انسان کی مدد کا شعور عام نظر آتا ہے، ایک تو تجزیہ غلط دوسرے اگر کسی حد تک کوئی ایک گوشہ یا خوشہ صحیح بھی ہے تو یہ دیکھا جائے کہ اسلام نے ان عیوب کو کس طرح دھو دیا، سیکڑوں مثالیں دی جا سکتی تھیں، مگر ان محققین (جن کو اقبالؒ کی زبان میں 'شیشہ گر' یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعبیر میں 'اشباہ الرجال' (مردوں کی مشابہت رکھنے والے کہنا مناسب ہوگا) کی سیاہ عینکوں میں ہر چیز سیاہ نظر آئی۔قاتلھم اللہ انی یؤفکون[1]

اقتصادیات کی بحث میں ذرائع آمدنی پر گفتگو لازمی ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ عربوں کی قدیم اقتصادیات کیا تھی یہ بھی ایک ضمنی بحث ہے، اور تسلیم شدہ ہے، یہاں یہ دکھایا جاتا ہے کہ جزیرۂ عرب کے باشندوں کا ذریعہ آمدنی، لوٹ مار، ڈاکہ زنی، چوری، گداگری تھا۔اس کے ثبوت میں عربی شاعری کے مدحیہ قصائد اور قرآنی آیات سے دلیلیں دی جاتی ہیں، اور نتیجہ یہ دکھانے کے بجائے کہ اسلام نے ان کو ختم کیا اور ان کی جگہ پر بلند سیرت اور اعلیٰ کردار کی تعمیر کی، دکھایا یہ جاتا ہے کہ اسلام نے ان خصائص کو ترقی دی اور ان بدوؤں کی اسلام سے دلچسپی کا سبب یہی تھا کہ وہ جن باتوں کے خوگر تھے اسلام نے ان کو قانونی حیثیت دے دی۔

علم الاجتماع میں خاص بحث غلامی (استعباد) ہے اور محققین یک طرفہ فیصلہ دیتے ہیں کہ اسلام نے اس کو باضابطہ ایک 'انسٹی ٹیوشن' کی شکل دی اور اس پروگرام کو بہت وسیع پیمانے پر اسٹیج کیا جاتا ہے اس کو ڈراموں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، انتہائی گھناونے اور بھیانک انداز میں دکھایا جاتا ہے کہ کس طرح ایک عرب مسلمان پچاس پچاس باندیاں رکھتا ہے، غلاموں کو مار مار کر لہولہان کرتا ہے، قیدیوں کو کتوں کے ساتھ کھانا دیتا

---

[1] خدا ان کو ہلاک کرے یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔ (سورۂ توبہ آیت ۳۰)

ہے، غرض ایسے مناظر دکھائے جاتے ہیں جس کے ایک جزر کو بھی صحیح مانا جائے تو آدمی ہمیشہ کے لیے عرب اور مسلمان کے تصور سے نفرت کرنے لگے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ افریقہ کے مسلمان جو اسلام کے اصولِ مساوات کو دیکھ کر اس سے قریب آرہے ہیں ان کو اسلام سے متنفر کیا جائے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ امام نے صحیح لکھا ہے کہ علم اور تحقیق کے نام پر ظلم وجہالت کی یہ نمائش آئے دن ٹیلی ویژن کے پردۂ مختصر پر جاری ہے، اور کوئی بتانے والا نہیں ہے کہ اسلام نے غلامی کے نظام کو ترقی نہیں دی بلکہ اسی نے اس کو ختم کیا ہے، سوائے جنگ اور میراث کے تمام صورتوں پر پابندی لگادی اور آزاد کرنے کے بے شمار راستے کھول دیے، جب کہ رومن امپائر میں جو غلام تھے آٹھویں صدی (دوسری صدی ہجری) تک وہ عربوں سے تین گنا زیادہ تھے، یونانیوں کے یہاں عربوں سے چار گنا زیادہ غلام تھے اور آج تک نیگروز کے ساتھ جو سلوک ہے ان کی نسبت عربوں کے غلام ہزار درجہ بہتر پوزیشن رکھتے تھے اور یہ جو قیدیوں کے ساتھ سلوک کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسلام پر بہتان لگاتے ہیں کہ اس نے ان کے ساتھ جانوروں کا معاملہ کیا کاش کوئی مسلمان اسکالر ہوتا تو بتاتا کہ مسکین و یتیم اور اسیر کے ساتھ اسلام نے جو رواداری، شفقت، اور احترام انسانیت کا معاملہ کیا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کہیں کسی مذہب میں نہیں کیا گیا اور نہ آج تک کیا جارہا ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی کہ اسٹالن گراڈ میں جرمنی کے ایک لاکھ چھ ہزار جنگی قیدی تھے، جن میں ۵۵ ہزار ایک ہفتہ کے اندر بھوک اور پیاس سے مر گئے، اور جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی ہے تو جو جنگی قیدی جرمنی واپس گئے ہیں ان کی تعداد صرف چھ ہزار تھی، وہ بھی ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔

مگر ان یہودی اور یہود نواز دانشورانِ علم و تحقیق کو ایک ہی بات یاد رہ گئی ہے کہ اسلام نے غلامی کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان "تحقیقات" کو امریکہ کے پرائیوٹ ٹیلی ویژن کے ادارے مختلف پروگراموں میں پیش کرتے ہیں، چند مزاحیہ اور تفریحی پروگرام ہوتے ہیں جن میں رقیب روسیاہ (ویلن) کا پارٹ ایک ترکی ٹوپی پہنے ہوئے (مسلمان) کو دیا جاتا ہے، لوٹ مار اور دھوکہ سے قتل کی وارداتیں میں جو مجرم دکھایا جاتا ہے وہ بھی یہی مسلمان ہوتا ہے۔ ان حالات میں آپ کیا توقع کر سکتے ہیں کہ اسلام کے لیے کسی کے دل میں نرم گوشہ پایا جاسکتا ہے؟

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ۔

اور انھوں نے (بڑی بڑی) تدبیریں کیں اور ان کی سب تدبیریں خدا کے یہاں لکھی ہوئی ہیں۔ گو وہ تدبیریں ایسی غضب کی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

خطبۂ استقبالیہ

دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ لکھنؤ

دینی تعلیمی کنونشن کا یہ خطبۂ استقبالیہ اپنی معنویت، وسعت نظری اور دوربینی کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ تمام مسلمانانِ عالم اس سے مستفید ہوں اور ہندوستان کی علمی و دینی جد و جہد اور اس راہ کی دشواریوں سے آگاہ ہوں، اس لیے 'فکر و نظر' ایک علمی و دینی جائزہ کی حیثیت سے اس کو مکمل شائع کر رہا ہے۔ (ادارہ)

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

حضرات!

میں آپ کا اس قدیم علمی و تعلیمی شہر لکھنؤ میں مسلمانانِ شہر، مُحبّانِ علم، اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے ارکان، کارکنوں اور داعیوں کی طرف سے پُر خلوص طریقہ پر استقبال کرتا ہوں، آپ ایک اہم اور نازک، ملت اسلامیہ ہندیہ کے علم و دین سے ربط و تعلق اور ملی تشخص کے دوام وبقا، یا (خدانخواستہ) زوال و فنا کے ایک فیصلہ کُن مرحلہ پر یہاں جمع ہوئے ہیں، میں اس نازک مرحلہ اور اس وقیع اور بیش قیمت اجتماع کے موقع پر (جو بار بار اور جلد جلد میسر نہیں آتا) حقائق و واقعات، ماضی کے تجربات، اور مستقبل کے کُھلے اشارات کی روشنی میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سماعت اور ان پر غور و فکر فرمائیں گے کہ

مسئلہ کی نزاکت، حقائق کی سنگینی اور زمانہ کی تیز رفتاری ایسی ہے کہ اندیشہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے ایک قدیم شاعر کا بیان کیا ہوا تجربہ حقیقتِ حال نہ بن جائے :

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علم و تعلیم کی اشاعت و عمومیت کی تحریک اور اس کی سعی و جد و جہد تقریباً ہر ملک میں اور تاریخ کے ہر دور میں، کسی نہ کسی درجہ میں خلوص و ایثار، سادگی اور جفاکشی اور عملی نمونہ و کردار کے ساتھ منسلک و مربوط رہی ہے، اور اسی میں ناسازگار حالات، سلطنت و معاشرہ کے انقلابات، جابر حکومتوں کی موجودگی، طبعی مرغوبات، معاشی ضروریات، اور ہر زمانہ میں "معیارِ زندگی" کی بے رحم فرماں روائی کے باوجود تعلیم اور ثقافت (کلچر) کا ہر دور میں کام ہوتا رہا، نوشت و خواند کا دائرہ وسعت اور ترقی اختیار کرتا رہا، اور زندگی اور مذہب کی بہت سی حقیقتیں اور صداقتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں، اس تاریخی حقیقت کے امتحان و تصدیق کے لیے کہ تعلیمی خدمت کا ہر ملک اور ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں خلوص و ایثار اور سادگی اور جفاکشی سے ربط و تعلق اور باہمی رفاقت رہی ہے، روایتی و عرفی (TRADITIONAL) تاریخوں کے بجائے جو سرکار دربار، جنگوں اور انقلاباتِ سلطنت اور (سیاسی و انتظامی طور پر) سربرآوردہ اشخاص سے تعلق رکھتی اور انھیں کے گرد گھومتی ہیں، ماہرینِ علم و فن اور سماجی خدمت گاروں اور مذہبی پیشواؤں کی سوانح حیات اور تذکرے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہزاروں برس سے انسانی نسلوں میں (زبان و تہذیب اور مذاہب و عقائد کے اختلاف کے باوجود) جو احساسات و تأثرات نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں، ان میں ایک "پیشہ ور" (PROFESSIONAL) اور "غیر پیشہ ور" (NON-PROFESSIONAL) میں فرق و امتیاز ہے، آخر الذکر (غیر پیشہ ور) کے ساتھ ہمیشہ احترام و اعتراف اور عقیدت و محبت کا تأثر اور تقلید و اتباع کا (خواہ اس پر عمل نہ ہو سکے) جذبہ اور شوق وابستہ رہا ہے، فطرتِ انسانی کے اسی دائمی تأثر و ردِّ عمل اور مسلّمہ حقیقت کے پیشِ نظر، ہر دور اور ہر اُمّت میں مبعوث کیے جانے والے پیغمبر نے اپنی قوم میں ہدایت و تبلیغ کا کام شروع کرتے وقت اس کی وضاحت ضروری سمجھی کہ وہ کسی دنیاوی منفعت، مال و دولت اور معاوضہ و اُجرت کا طالب نہیں، قرآن مجید کی سورۂ شعرا میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ میں سے کسی کے تذکرہ میں بھی ان کے

اس بیان اور اطمینان دہانی کو نظر انداز نہیں کیا گیا کہ "میں تم سے کسی دنیاوی منفعت کا امیدوار نہیں" ہر ایک کے تذکرہ میں اس کا بیان و اعلان نقل کیا گیا ہے کہ؛[1]

وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ	میں تم سے (اس دعوت ونصیحت اور محنت
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ	وسعی پر) کسی معاوضہ ومنفعت کا طالب نہیں، میرا
الْعٰلَمِيْنَ ۝	معاوضہ وانعام ربُّ العالمین کے ذمہ ہے۔

پھر جب خدا کا آخری دین اسلام دنیا میں آیا تو اس نے صحیح تعلیم کے کام کو اعلیٰ درجہ کی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور اس کو انبیار کی نیابت کا منصب قرار دیا؛[2] اس کے نتیجہ میں پورے عالم اسلام میں آزاد دینی تعلیم کا نظام جاری ہوا اور آزاد دینی مدارس و مکاتب کا ایک جال بچھ گیا، عالم اسلام کے چپّہ چپّہ، شہر، قصبات اور دیہاتوں میں مدرسے اور مکتب قائم ہوئے، اور بالعموم مسجدیں قرآن مجید اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا مرکز بن گئیں، سلاطینِ وقت کی علمی قدردانی و سرپرستی اور شوق وکوشش کے باوجود اکثر یہ مدارس اور تعلیمی مراکز آزاد رہے اور ان کا براہ راست عوام سے ربط و تعلق رہا، اور عوام سے ربط و تعلق کا گہرا نفسیاتی اثر اور فائدہ ظہور میں آیا جو بالکل قدرتی و منطقی ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی ادارہ یا تحریک کی امداد میں براہ راست حصہ لیتا ہے (خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو) تو اس کو اس سے ایک نفسیاتی اور جذباتی تعلق اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ مستحکم اور طویل المیعاد اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور شاہانِ وقت کی فیاضی اور بعض اوقات دینداری کے باوجود، اس تحتی برّاعظم کے مسلمانوں کی اسلام سے ارادی وشعوری وابستگی، بقدرِ ضرورت دینی معلومات اور دینی احکام پر عمل کرنے کا جذبہ، اس آزاد دینی نظام تعلیم اور انھیں آزاد مدارس کے ایثار پیشہ اور مخلص فضلاء کی سعی وجہد کا نتیجہ ہے، جس میں مسلم سلطنتوں اور فرماں رواؤں کا تقریباً کچھ حصہ نہیں، تاریخ وحقائق کی روشنی میں بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک نہ صرف اس برصغیر کے مسلمانوں کا بلکہ بیشتر یا تمام تر مسلم حتیٰ کہ عرب ممالک تک کے مسلمانوں کا، دین و شریعت

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ شعراء رکوع ۶ - آیت ۱۰۹، رکوع ۷ - آیت ۱۲۷ - رکوع ۸ آیت ۱۴۵، رکوع ۹ - آیت ۱۶۴ رکوع ۱۰ - آیت ۱۸۰،

[2] ملاحظہ ہو "تعلّم وتعلیم کے فضائل، صحاح وکتب حدیث میں۔

سے ربط و تعلق اور ان کی دینی باخبری، اور اسلامی ثقافت و تہذیب سے نہ صرف واقف ہونا، بلکہ اس کا حامل اور پُرجوش حامی ہونا، انھیں ایثار پیشہ، رضاکار، اور کسی حد تک زاہد و متوکل فضلائے مدارس اور ناشرین علم و دین کا رہین منّت ہے۔

ان مدارس کے اساتذہ و فضلاء میں سے متعدّد اگرچہ اپنے فن کے ماہر اور یگانۂ روزگار عالم ہوتے تھے، لیکن وہ پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ یہ کہنے کے اہل تھے کہ:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں   غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن   کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

اِس آزاد دینی تعلیم کا ایک فائدہ یہ تھا کہ سلاطینِ وقت کے غلط اور بعض اوقات مخالفِ اسلام اور ماحیِ دین رجحانات، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دین کی بیخ کنی اور استیصال کی باعزم اور منظم کوششوں کا اثر مسلم معاشرہ پر بالکل نہیں پڑسکا، اور درباریوں اور خوشامدیوں کے ایک مختصر حلقہ میں محدود ہو کر رہ گیا، اس کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کی (جو سلطانِ ترکی کے بعد اپنے وقت میں دنیائے اسلام کا سب سے طاقت ور اور وسیع المملکت بادشاہ تھا) تحریک وحدتِ ادیان، تعطیل شریعت اسلامی، بلکہ نسخ دین محمدیؐ کی منظم اور منصوبہ بند کوشش جس میں اس عہد کے بعض ذکی ترین بلکہ عبقری (GENIUS) افراد شریک تھے، مسلم معاشرہ پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈال سکی، اور جیسا کہ بعض یورپین مؤرخین نے اعتراف کیا ہے، وہ چند درباری اشخاص تک محدود رہی، اور مسلمان عوام اس سے کلی طور پر غیر متأثر رہے، اور یہ نتیجہ ان حقانی، ربّانی علماء و مصلحین اور داعیانِ دین کا فیض تھا، جن کا اثر عامّۃ المسلمین پر نہ صرف سرکاری درباری علماء سے زیادہ، بلکہ سلاطین و حکام سے بھی زیادہ تھا، اور جن کے بعض افراد کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

جہانے را دِگر گوں کرد یک مردِ خود آگاہےؔ[1]

حکومت سے اسی بے نیازی، عامّۃ المسلمین سے ربط و تعلق اور ایثار و جذبۂ قربانی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گُل ہوا، اور مسلمان اقتدار اور اس کے منافع و مواقع سے محروم

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم السطور کی تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" کا حصہ چہارم و پنجم مشتمل بر تذکرۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ و حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

ہو گئے، تو اس دینی تعلیم کے نظام و مراکز پر کوئی گہرا و انقلاب انگیز اثر نہیں پڑا، بلکہ ان میں مدارس کے قیام کا ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا، جو نہ صرف مسلمانوں کو دینی، ذہنی و تہذیبی ارتداد سے محفوظ رکھ سکیں، بلکہ (ملک کو چھوڑ کر) ہر طرح سے اسلامی سلطنت کی قائم مقامی کر سکیں[1]

انگریزی حکومت نے اپنے اقتدار و تسلط اور تعلیمی نظام اور سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی مراکز کے بقا و حیات کے سرچشموں کو خشک کرنے کی ایسی منظم کوشش کی جس کے بعد ان مدارس اور اس دینی تعلیم کے نظام کا باقی رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں، اور وہ (تاریخی تجزیہ اور فلسفۂ حیات کی رو سے) محض مسلمانوں کے عزم و قوتِ ایمانی، اور شروع سے دینی تعلیم کے آزاد رہنے کا نتیجہ تھا، انگریزی حکومت کے ان انتظامات اور اقدامات کی بعض کڑیاں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طویل اور آہنی زنجیر کا جزو ہیں، جو کسی نظامِ تعلیم کے ختم کرنے کے لیے بھی کافی ہے۔

۱۸۱۲-۲۶ء میں آنریبل مسٹر الفنسٹن اور ایف وارڈن نے مسئلۂ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی، جس میں حسب ذیل اعتراف موجود ہے؛

> "ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے، اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی، بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے، اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیاً منسیاً ہوئے جاتے ہیں"[2]

ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر (W. W. HUNTER) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (THE INDIAN MUSALMANS) میں ہندوستانی مسلمانوں کی جائز شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے اور ان کو بجا قرار دیا ہے:

> "ان کو (مسلمانوں کو) شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لیے، اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرہ میں ڈال دیا، ہمارا بڑا جرم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے"

---

[1] ملاحظہ ہو دارالعلوم دیوبند کے قیام کے مقاصد کے بارہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مطمحِ نظر کی ترجمانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی زبانی، مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی کتاب "سوانح قاسمی" حصہ دوم میں، ص ۲۲۳-۲۲۴

[2] "حکومت خود اختیاری" از مولوی سید طفیل احمد صاحب منگلوری علیگ ایم۔ ایل سی ص ۹۵

ان کے سب سے بڑے تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا۔[1]

مسٹر ولیم ہنٹر نے اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و مدارس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے، وہ ملک کی سیاسی ہی نہیں، بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کیے جاتے تھے، اس ہندوستانی مدبّر کے الفاظ میں، جو ان سے بخوبی واقف تھا، ان کا تعلیمی نظام اگرچہ اس نظام تعلیم کے مقابلہ میں کم درجہ پر ہے جسے ہم نے رائج کیا ہے، لیکن پھر بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا غلطی ہے، کیونکہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی تعلیم و تربیت کا اہل تھا، اس کی بنیادیں بالکل ہی ناقص اصولوں پر نہ تھیں، گو ان کے پڑھانے کا طریقہ بہت پُرانا تھا، لیکن یقینی طور پر وہ ہر اس طریقہ سے برتر تھا جو اس وقت ہندوستان میں رائج تھا، مسلمان اس طریق تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیاوی برتری حاصل کرتے تھے"[2]

ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد اور غیر سرکاری تعلیم گاہوں کا ذریعہ آمدنی کیا تھا، اور وہ کیوں ہر طرح کے ناسازگار حالات کے باوجود نہ صرف زندہ بلکہ مفید اور کارآمد ہے وہ لکھتا ہے:

"ہم نے ان کے (مسلمانوں کے) طریقہ تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا جس میں اس کی بقا کا دار و مدار تھا، مسلمانان بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے، جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا، یہ خاندانی اسکول کم ہوتے گئے، اور ان کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے......

زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لیے زمین کے قطعات وقف کر دے"[3]

حکومت برطانیہ کی اس منظم و مسلّح معنوی و ثقافتی نسل کشی (CULTURAL GENOCIDE)

---

[1] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین صاحب مطبوعہ اقبال اکیڈمی لاہور ص ۲۱۹

[2] ایضاً ص ۲۵۹ [3] ایضاً ص ۲۶۷

اوقاف کی ضبطی، سرکاری ملازمتوں کے لیے فضلائے مدارس کی نااہلی کے قانون، اور اس سب سے بڑھ کر قدیم دینی تعلیم کے متوازی پرائمری اور ہائی اسکولوں کی سطح سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ملک گیر نظام کے قائم کرنے اور ان میں ہر طرح کی کشش اور ترغیب کے پہلو کے موجود ہونے کے باوجود مسلمان اپنے دین اور اس کی ثقافت (کلچر) اور تہذیب و معاشرہ سے وابستہ ہیں، اور وہ کسی بڑے پیمانہ پر بلکہ قابل ذکر سطح پر بھی دینی، تہذیبی و ثقافتی ارتداد کا اس طرح شکار نہیں ہوئے، جس طرح اسپین کے مسلمان زوال حکومت اسلامی کے بعد شکار ہوئے، یہ تنہا آزاد دینی تعلیم اور آزاد مدارس و مکاتب اور ان کے فضلاء، وہاں سے تعلیم پاکر نکلنے والے مفتیوں، قاضیوں، واعظوں اور ائمۂ مساجد کا فیض تھا، اور انھیں کی وجہ سے نہ صرف علوم دینیہ بلکہ قرآن مجید پڑھنے اور یاد کرنے کی صلاحیت، اردو میں نوشت و خواند کی قابلیت اس نسل تک باقی رہی، اسی بنا پر عہدِ جدید کے نامور ترین مفکر اور ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے مدارس عربیہ و دینیہ پر تنقید کرنے والے ایک مسلمان صاحبِ قلم کی تنقید پر یہ فرمایا کہ: "ان دینی مدارس کو کچھ نہ کہو، اگر یہ باقی نہیں رہے تو ہندوستان بھی اسپین بن جائے گا۔"

ان مدارس اور ان کے فضلاء کی اس خصوصیت اور اس ملک میں اسلام سے واقفیت اور وابستگی کے تسلسل و بقا میں ان کے عظیم کارنامہ کا بقدر ضرورت اور اضطراراً تذکرہ کرنے کے بعد، ہم ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی سامعین و قائدین اور حقیقت پسند اور منصف مزاج محبانِ وطن کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں، اور وہ یہ کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا حصہ اسی قدیم نظامِ تعلیم کے ساختہ پرداختہ فضلاء اور علمائے دین کا تھا، آزاد مسلم مفکرین و قائدین میں سرفہرست علمائے دین ہی تھے، جو سیاسی اور قومی تحریکات میں حصہ لینے کے نہ صرف قائل بلکہ داعی تھے اور سیاست کو مسلمانوں کے لیے (بعض جدید تعلیم یافتہ قائدین کی طرح) "شجرۂ ممنوعہ" نہیں سمجھتے تھے، انھیں علماء نے برطانوی حکومت کی مخالفت اور اس کے خلاف جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے نتیجہ میں مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صادق پوری اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کو پورٹ انڈمان روانہ کر دیا گیا، مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صاحب کا انڈمان میں انتقال ہو گیا، اور مولوی محمد جعفر اٹھارہ سال کی قید بامشقت اور جلاوطنی کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے، ان کے علاوہ دوسرے ممتاز اور جلیل القدر علماء کو بھی انڈمان میں جلاوطنی کی سزا دی گئی، جن میں مولانا فضل حق

خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی مظہر کریم دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں، مولانا فضل حق خیرآبادی کا وہیں انتقال ہوا، اور بقیہ دو عالم طویل عرصے کے بعد وطن واپس ہوئے۔

پھر جب ہندوستان میں تحریک خلافت اور اس کے ساتھ آزادیٔ ہند کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں بھی علما ہی پیش پیش تھے، اس طویل و نورانی فہرست میں یہاں صرف شیخ الہند مولانا محمود حسن، قیام الدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا نام لینا کافی ہے، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین، اور مولوی سید وحید احمد کو سنہ ۱۹۱۷ء میں مالٹا جلاوطن کر دیا، یہ جماعت سنہ ۱۹۲۰ء تک وہیں رہی۔

انگریزوں سے نفرت اور حکومت انگریزی کی مخالفت میں ہر طرح کی سختیاں اور مصائب کے برداشت کرنے کی جس صلاحیت اور ہمت کا ثبوت جماعت علماء نے دیا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہر طرح سے حق بجانب ہوگا کہ دینی تعلیم اور آزاد مدارس میں قربانی و ایثار کا جذبہ، عزیمت و عالی ہمتی اور بلند نگاہی پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے، اور ملک و قوم کو درپیش مصائب و خطرات کے موقعہ پر یہی جماعت (جو مادی ترقیات، معاشی آسودگی اور عزت و اقتدار کے حصول سے زیادہ آسانی کے ساتھ صرف نظر کر سکتی ہے) زیادہ کام آنے والی ہے۔

اس کے ساتھ ضمناً اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کی آبرو، ذوق مطالعہ اور علم و تصنیف کی راہ میں خود فراموشی اور محنت کوشی انھیں عربی و دینی مدارس سے قائم ہے، ان میں سے ایک ایک آدمی نے اکیڈمی کا کام کیا ہے، اس سلسلہ میں ان مصنفین کے تصنیفی کارناموں کا ذکر موجب طوالت و ملال طبع کا باعث ہوگا۔[1]

ان آزاد دینی مدارس و مکاتب کا یہ احسان اور کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اس دور میں

---

[1] اس کے لیے راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" جو اس کی عربی تصنیف "المسلمون فی الهند" کا ترجمہ ہے، کا باب "علمائے ہند کے علمی کارنامے" ص ۵۲۔۵۰ ملاحظہ فرمایا جائے۔

اب اردو انھیں کے ذریعہ نئی نسل کی طرف منتقل ہو رہی ہے، اور اس نسل میں اردو نوشت و خواند اور قدیم دینی و علمی ذخیرہ سے ربط و تعلق و استفادہ کی صلاحیت انھیں مدارس و مکاتب کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، ورنہ جدید تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والے (اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی کے طلبہ تک) اردو میں تحریر و تصنیف کا کیا ذکر؟ اردو پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں، اور اپنے والدین اور سرپرستوں سے ہندی یا انگریزی میں خط و کتابت کرنے پر مجبور رہیں۔

حضرات!

گزشتہ بیان اور معروضات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کسی ملک میں دین سے وابستگی اور ملت کے تشخص کا بقا دینی تعلیم کے حکومت کی ان پابندیوں سے آزاد رہنے اور ان قوانین سے مستثنیٰ ہونے میں مضمر ہے، جو ملک کی مادّی ضرورتوں کی تکمیل اور عام نظم و نسق کے شعبوں کے لیے ضروری یا مفید ہو سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر ذمہ داران حکومت صحیح معنی میں حقیقت پسند اور محبِ وطن ہوں تو ان کو ہر ایسی کوشش اور ہر ایسے ادارہ کو نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دینی چاہیے، بلکہ اس کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرنی چاہیے، جو ملک میں علم و خواندگی، اور ثقافت و تہذیب کی اشاعت و ترقی اور ان کی توسیع میں مدد دے، کہ اس وسیع، طویل و عریض، اور کثیر آبادی کے ملک میں اگر کوئی شخص درخت کے نیچے بیٹھ کر جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے والی خوراک اور بقدر ستر پوشی پوشاک پر قناعت کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کا کام کرے تو ہر محبِ وطن انسان اور علم کے ہر قدر دان کو اس کا نہ صرف خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ اس کا شکر گزار ہونا اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ تمام تر سرکاری وسائل اور زیادہ سے زیادہ تعلیم گاہوں کے قیام اور ان کے لیے اساتذہ کی فراہمی کے باوجود اس ملک کی آبادی کے بڑے حصہ کو خواندہ و تعلیم یافتہ نہیں بنایا جا سکتا، چہ جائیکہ اخلاق و سیرت کی تعمیر ہو، اور باکردار شہری پیدا ہوں۔

اسی بنا پر ہم حکومت کے ان قوانین و ضوابط کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہیں، جو آزاد دینی تعلیم اور آزاد مدارس و مکاتب کے قیام اور ان کے آزادی سے تعلیمی خدمت اور علم و ثقافت کی اشاعت اور مسلمانوں کو اپنے دین سے اس درجہ واقف کرانے کے کام میں خلل انداز ہوں جو ان کے لیے مذہبی طور پر ضروری ہے، اور وہ تعلیم گاہیں یا تو قائم نہ ہو سکیں، یا اگر قائم ہیں تو باقی نہ رہ سکیں، مثلاً کم سے کم تنخواہ و معاوضہ MINIMUM WAGE کا قانون، یا مدارس و مکاتب کے لیے اپنے قیام و جواز

کے لیے لائسنس لینے کی پابندی، جو حکومت کے دوسرے شعبوں جن کا نظم ونسق ADMINISTRA TION- یامحنت LABOUR سے تعلق ہے، کے لیے موزوں ہیں، لیکن دینی مدارس و مکاتب کے لیے جن کا شعار اور طاقت وخصوصیت زمانہ قدیم سے لے کر اس وقت ایثار و قناعت رہی ہے، اور ہمیشہ رہنا چاہیے، ناموزوں اور سخت مضرت رساں ہیں، ہم اپنا جمہوری، مذہبی، اخلاقی اور شہری حق سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف آواز بلند کریں کہ ملک کے دستور نے ہر اقلیت اور ہر اکائی کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مدارس قائم کرے، اور اپنی پسند اور صوابدید کے مطابق ان کو چلائے، ہم خالص حُبّ الوطنی اور ہندوستان کے لیے اس کو باعثِ فخر سمجھنے کی بنا پر بھی یہ کہتے ہیں کہ تعلیم وتربیت اور ثقافت وتہذیب کے پھیلانے میں ایثار و قربانی کی اس روایت کو جو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا بھی طرۂ امتیاز رہا ہے، باقی رہنا چاہیے۔

آخر میں بڑی معذرت کے ساتھ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان مدارس ومکاتب کے سرکاری امداد قبول کر لینے کے بعد یہ اندیشہ ہے (جو واقعہ بن کر سامنے آگیا ہے) کہ ان مدارس کا عوام سے رابطہ بھی ٹوٹ جائے، اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لیے سرکاری امداد اور ایڈ قبول کیا گیا ہے، کچھ عرصہ پہلے پٹنہ کے ایک جلسہ میں شرکت کے موقع پر جو امارت شرعیہ بہار کے قائم کردہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کی یادگار میں اسپتال کے افتتاح کے لیے منعقد کیا گیا تھا، اور جس میں بہار کے چیف منسٹر بھی شریک تھے، ایک عربی مدرسہ کے ذمہ دار نے تقریر میں کہا کہ چھ مہینے سے ہم کو سرکاری امدادی رقم نہیں ملی، ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں، یہ بہار کا حال تھا جہاں اکثر مدارس عربیہ سرکاری امداد قبول کر چکے ہیں، ابھی چند ہی دن پہلے ۱۳ مئی کے "قومی آواز" (لکھنؤ) میں جانسی کے ایک دینی مدرسہ کے صدر مدرس یا مہتمم صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے، اس میں صاف لکھا گیا ہے کہ پانچ مہینے سے ہم کو سرکاری امداد نہیں ملی، اور ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں، ایسی حالت میں بڑے ٹوٹے کا سودا ہوگا کہ ہمارا رشتہ عوام سے بھی ٹوٹ جائے اور ہم ان کی ہمدردی اور اعانت سے بھی محروم ہو جائیں، اور حکومت کے تغافل یا اس کے نظم ونسق کی طوالت کا بھی شکار ہوں، اس طرح (بہت معذرت کے ساتھ) صرف اس مصرعہ پر اکتفا کروں گا کہ:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

میں ایثار و قربانی کی اس دعوت کے ساتھ جو کسی نہ کسی درجہ میں دینی تعلیم کے بقاء و ملت کے تشخص کی حفاظت کے لیے ضروری ہے، حقائق اور زندگی کی طبعی و فطری بلکہ شرعی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا، مدارس و مکاتب کے اساتذہ و منتظمین کے لیے بقدر ضرورت و باعزت معاشی انتظام کی بے شک ضرورت ہے، مدارس کے ذمہ داروں کو اس پر ہمدردانہ غور کرنا اور اس تقاضہ کو اپنے وسائل اور دائرۂ اختیار میں رہ کر پورا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور مدارس و مکاتب کے کارکنوں اور خدمت گزاروں کو کسی نہ کسی درجہ میں ایثار و قناعت سے کام لینے اور ایمان و احتساب (اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے اجر و ثواب کی امید میں کام کرنے) کے ساتھ اس چراغ کو روشن رکھنے اور اس کی روشنی دور دور اور دیر دیر تک پہنچاتے رہنے کی کوشش و جاں نشانی بھی جاری رکھنی چاہیے کہ اس دین کا ماضی، حال اور مستقبل، ایمان و یقین، ایثار و توکل اور عزم و ہمت سے وابستہ رہا ہے اور رہے گا، اور یہی جوہر ہر طرح کے بدلے ہوئے حالات اور تیز و تند آندھیوں میں بھی اس چراغ کو گل ہونے سے بچاتا رہا ہے، اور بچاتا رہے گا:

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

میں اقبالؒ کے ان اشعار پر گزارش کا اختتام کرتا ہوں:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

پروفیسر خلیق احمد نظامی

فوائد الفواد

۱۳۰۸ء تھا اور جنوری کی ۲۸ تاریخ۔ دہلی سے چند میل دور، غیاث پور میں حضرت محبوب الٰہی شیخ نظام الدین اولیاءؒ حاضرینِ مجلس سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک با اخلاص مرید، حسن علا سجزیؒ، جن کو شیخ سے گہری عقیدت تھی اور جو دینی جذبات کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے بھی حامل تھے، ایک کونے میں بیٹھے، ہمہ تن گوش، شیخ کے ارشادات سُن رہے تھے۔ نہ معلوم کیا خیال آیا کہ خاموشی کے ساتھ شیخ کی گفتگو کو قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ پھر جب بھی مجلس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، شیخ کی گفتگو کو قیدِ کتابت میں لاتے رہے۔ ایک سال سے زیادہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن شیخ کو مائل بہ کرم پایا تو عرض کیا کہ اپنے لیے ایک دستور العمل تیار کرنے کی نیت سے انھوں نے شیخ کی گفتگو کو قلمبند کرنا شروع کر دیا ہے۔ شیخ نے دلچسپی سے سنا اور خود اپنے مرشد کے ملفوظات کی ایسی ہی یاد داشت تیار کرنے کی سرگزشت بیان کی۔ پھر حسنؒ سے وہ صفحات لے کر نظر ڈالی اور فرمایا:
"اچھے لکھے ہیں!"

اس طرح ملفوظات کی وہ کتاب وجود میں آئی جو 'فوائد الفواد' کے نام سے مشہور ہے اور پچھلے ساڑھے چھ سو سال سے چشتیہ سلسلہ کے لیے دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ امیر خسرو جنھوں نے بقول ضیا برنی خود ایک کتب خانہ تصنیف کیا تھا، کہا کرتے تھے کہ کاش فوائد الفواد ان کی تصنیف ہوتی اور اُن کی ساری کتابیں حسنؒ سے منسوب ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حسنؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی جاں نواز مجالس کو زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد کر کے زندۂ جاوید بنا دیا ہے، اور اگر تصور ساتھ دے تو ہم اسی ماحول میں پہنچ سکتے ہیں جو حضرت محبوب الٰہی کے نفسِ گرم سے "فردوسِ گوش" اور "جنتِ نگاہ" بنا رہتا تھا۔

حسنؒ نے صرف شیخؒ کے ملفوظات ہی جمع نہیں کیے بلکہ ایک ایسی عظیم الشان علمی روایت کی بنیاد ڈالی

جس سے ایک نئے طرز کا تاریخی اور ادبی سرمایہ جو ملفوظات کے نام سے شہرت رکھتا ہے، وجود میں آگیا۔ ہندوستان کی کوئی خانقاہ اور صوفیہ کا کوئی سلسلہ ایسا نہ رہا جہاں اسی طرز پر ملفوظات کو جمع کرنے کی طرف توجہ نہ کی گئی ہو۔

ہمارے پاس سیاسی عروج و زوال کی داستانوں اور بادشاہوں کی بزم آرائیوں سے متعلق لٹریچر کی فراوانی ہے، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ عوام کس طرح سوچتے اور کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں خوشی اور بے چینی، امید و یاس، کامیابی اور ناکامی کے سوتے کہاں پھوٹتے تھے اور زندگی کے میدان میں اُن کی ہار جیت کہاں اور کیسے ہوتی تھی ــــ اس عوامی زندگی کے نقوش اگر کہیں نظر آتے ہیں، تو صرف ملفوظات میں یا فوائد الفواد میں قرون وسطیٰ کی تمدنی زندگی کی ایک متحرک تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

حسن سجزیؒ نے یہ ملفوظات ۳ شعبان ۷۰۷ھ کو لکھنے شروع کیے تھے۔ آخری مجلس جس کا حال اس مجموعہ میں درج ہے وہ ۱۹ شعبان ۷۲۲ھ کی ہے۔ مجلسیں مسلسل نہیں ہیں، اور پندرہ سال کی خاصی طویل مدت میں صرف ۱۸۸ دنوں کا حال جمع کیا گیا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ شیخ کی عظیم الشان زندگی کا ایک بہت ہی مختصر اور محدود حال ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کم و بیش ۲۰ ہزار شب و روز دہلی میں انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے اور خالق کائنات سے اُن کا رشتہ قائم کرنے میں بسر کیے تھے۔ ابن بطوطہ نے دمشق کے ایک وقف کا ذکر کیا ہے جس کی آمدنی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور غم حیات سے تھک جانے والے انسانوں کی مدد کے لیے مخصوص تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذات خود ایک ایسا وقف بن گئی تھی، جس سے ہزاروں دلوں کو راحت پہنچتی تھی اور بیمار دل شفا پاتے تھے۔ امیر خسرو نے اسی لیے اپنے شیخ کو "دلوں کا طبیب" کہا ہے اور حسن سجزیؒ نے اسی لیے ان ملفوظات کا نام فوائد الفواد یعنی دل کے فائدے رکھا ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے جب دہلی میں ارشاد و تلقین کی مسند بچھائی تھی وہ عہد وسطیٰ کی تاریخ میں بے پناہ سیاسی سرگرمیوں کا دور تھا۔ خلجی سلطان، علاء الدین کی فتوحات نے مادیت کے جذبات اور ملک گیری کی ہوس کو تیز تر کر دیا تھا۔ سیاسی ہنگامہ آرائی کے اس دور میں حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی علمبردار اور انسانیت اور اخلاق کے بنیادی تصورات کی ترجمان تھی۔ عوام میں اس کی مقبولیت کا عالم معاصر مورخ ضیاء برنی کی زبانی سنیے، لکھا ہے:

"معتقدین نے شہر سے غیاث پور تک مختلف مواضعات میں چبوترے بنوا کر ان پر چھپر ڈال دیے تھے اور کنویں کھدوا کر وہاں مٹکے، کٹورے اور مٹی کے لوٹے رکھ دیے تھے۔ بورے بچھے رہتے تھے۔ ہر چبوترہ پر حافظ اور خادم نصب تھے تاکہ آستانہ شیخ پر آنے جانے والے وضو کر کے نماز ادا کر سکیں۔ ہر چبوترہ پر جو راہ میں بنا ہوا تھا، نوافل پڑھنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔"

اگر فوائد الفواد میں شیخ کی مجلسوں اور ان کے مباحث کو ان سیاسی واقعات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے جو اس وقت رونما ہو رہے تھے تو فکر و نظر کی ایک نئی دنیا سامنے آجائے۔ ایک مثال سُن لیجئے۔ ۲۴ محرم کو ملک کافور اپنی دکن کی مہم سے واپس آیا، اور بے پناہ دولت، زر و جواہر کے خزانے اپنے ساتھ لایا۔ دہلی میں چبوترہ ناصری پر یہ دولت، عوام کے نظارہ کے لیے سجا دی گئی۔ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ اگلے دن یعنی ۲۵ محرم کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنی مجلس میں دولت، اس کے اثرات، اس کے استعمال پر گفتگو فرمائی اور بتایا کہ روپیے کا صحیح استعمال یہ ہے کہ عوام کو اس سے فائدہ پہنچے۔

"از جمع زر و سیم کار آنست کہ از دیگرے منفعتے برسد"۔

اسی طرح فوائد الفواد میں شیخ کی ہر گفتگو کا ایک پس منظر ہے جس کی تفصیل اگر مل جائے تو ان ملفوظات سے تمدّنی زندگی اور سماجی جد و جہد کے نئے پہلو سامنے آجائیں۔ اگر فوائد الفواد کا مطالعہ سمجھ سمجھ کر اس طرح کیا جائے کہ ہر گفتگو کے پیچھے جو سماج سانس لے رہا ہے، اور آدم گری کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ پیش نظر ہے تو یہ ملفوظات قرون وسطیٰ کی زندگی کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن جائیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ "آدم گری" کو زندگی کا سب سے اہم فریضہ سمجھتے تھے۔ خود ان کے روز و شب کے مشاغل، زبان حال سے پکارتے تھے؛

میرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

اس "آدم گری" کا کام انھوں نے جس طرح انجام دیا اس کی تصویر فوائد الفواد کے ہر ہر صفحے پر دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے نظام اصلاح و تربیت کا ایک نفسیاتی اصول یہ تھا کہ نصیحت کے لیے حکایات کا ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ اس طرح بات سننے والے کے دل و دماغ کا ریشہ ریشہ اثر قبول کرلیتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانی ہمدردیوں پر مذہبی اختلافات کی پرچھائیاں بھی نہ پڑیں۔ اس کو سمجھانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا یہ دستور تھا کہ جب کھانا کھاتے تو ضرور کسی کو شریک طعام کرتے۔ بعض اوقات مہمان کی تلاش میں دو دو میل نکل جاتے۔ ایک دن ایک مشرک ان کا مہمان ہوا۔ اس کو کھانا دینے میں ان کو تامل تھا۔ فوراً حکم خداوندی پہنچا: "اے ابراہیم! ہم اسے جان دے سکتے ہیں لیکن تم اسے روٹی نہیں دے سکتے۔"

استغنا اور توکل کی زندگی کی اہمیت واضح کرنا چاہتے ہیں تو یہ حکایت بیان کرتے ہیں:

"ایک بزرگ شیخ علی درویش اپنے پاؤں دراز کیے، اپنا خرقہ سی رہے تھے۔ اتنے میں خلیفہ ان سے ملنے کے لیے آ پہنچا۔ وزیر نے آگے بڑھ کر کئی بار شیخ علی سے کہا کہ پیر سکیڑ لو خلیفہ تشریف لاتے ہیں۔ انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور سنی ان سنی ایک کردی۔ جب خلیفہ آن پہنچا تو وزیر کا ہاتھ پکڑ کر کہا: میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لیے ہیں اس لیے پیر پھیلا سکتا ہوں۔"

حضور قلب کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو شیخ حسن افغان کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ:

"وہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید تھے۔ بازار میں کسی جگہ اذان سنی، نماز پڑھنے کے لیے رُک گئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو امام کے پاس آئے اور آہستہ سے پوچھا کہ جب تم نے نماز شروع کی تو میں تمھارے ساتھ تھا۔ تم یہاں سے دہلی پہنچے، وہاں تم نے غلام خریدے، پھر واپس ملتان آئے۔ پھر ان غلاموں کو ساتھ لے کر خراسان گئے۔ میں اس طرح مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے آخر کہاں چھوڑ دیا!"—

غیر حق میں مشغولیت سے خبردار کرنا چاہتے ہیں تو میرک نامی درویش کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص ان سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ اس میں یہ خصوصیت تھی کہ جو خواب دیکھتا تھا وہ سچ ہوتا تھا۔ جب میرک درویش سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا تو راستہ میں خواب دیکھا کہ میرک کی وفات ہو چکی۔ بہت رنجیدہ ہوا لیکن اس خیال سے کہ جب اتنا لمبا سفر کیا ہے تو اس کی قبر ہی کی زیارت کرتا چلوں۔ وہاں پہنچا اور میرک درویش کی قبر کو دریافت کیا۔ لوگ حیران ہوگئے اور کہا کہ وہ تو زندہ اور صحیح سلامت

ہیں۔ اور تم قبر پوچھتے ہو۔ حیرت میں پڑ گیا کہ میرا خواب جھوٹا کیسے ہو گیا۔ جب میرک کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا: تمھارا خواب صحیح تھا۔ میں ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہا کرتا تھا۔ اس دن کچھ دیر کے لیے غیر حق میں مشغول ہو گیا تو سارے جہاں میں ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا کہ "میرک گرامی مر گیا۔"
اور ایسے ہی کتنے قصے ہیں جن سے شیخ نے انسانی دلوں تک اپنی آواز پہنچائی ہے۔ اور ان کی فکر و نظر کی دنیا کو بدل دیا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ مذہب کی حقیقت و غایت کے متعلق بڑے انقلابی نظریات رکھتے تھے۔ ان نظریات کا اظہار فوائد الفواد میں متعدد جگہ اور بڑی وضاحت سے ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ طاعت لازمی اور طاعت متعدی۔ طاعت لازمی تو وہ ہے جس کا نفع کرنے والے کو پہنچتا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، اور اوراد و وظائف۔ طاعت متعدی وہ عبادت ہے جس سے دوسروں کو راحت ملتی ہے۔ جیسے دوسروں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا، اُن کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنا، ان کے دُکھ درد میں شریک ہونا۔۔۔ اس طاعت کا ثواب طاعت لازمی سے زیادہ ہے۔"

پھر اس کی وضاحت میں ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔ گجرات میں دو درویش جن میں ایک مجذوب تھا، ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ درویش صبح سویرے تالاب پر وضو کے لیے گئے۔ وہاں بہت سی عورتیں پانی کے برتن لیے کھڑی تھیں۔ اُن کو براہ راست تالاب سے پانی لینے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس کو کسی نے نہیں روکا۔ اس نے عورتوں کے برتن بھر بھر کر اُن کو دینے شروع کیے اور بہت دیر تک یہ کام کرتا رہا۔ جب واپس کمرے آیا تو زور زور سے ذکر و تکبیر میں مشغول ہو گیا۔ مجذوب نے کروٹ لی اور کہا: "کام تو وہی تھا جو تم تالاب پر کر رہے تھے، یہ کیا شور مچانا شروع کر دیا۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مریدین کے ذہن پر یہ بات نقش کر دی تھی کہ:

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اللہ تک پہنچنے کا راستہ اس کے بندوں کے دکھ اور درد میں شرکت کی راہ سے ہو کر گزرا

ہے۔ جو شخص تمام انسانی برادری کو "الخلق عیال اللہ" نہیں سمجھتا وہ خالق کائنات سے محبت کا رشتہ قائم نہیں کر سکتا۔

اگر فوائد الفواد کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حضرت محبوب الٰہی کے تصورات کی دنیا کیا تھی، ان کی نظر میں عبادت کا کیا مقصد تھا، وہ خدمت خلق کو روحانی ترقی کے لیے کتنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی فکر و نظر کے پیمانے عام پیمانوں سے کتنے مختلف تھے۔ معاصر مورخوں نے التمش کی عظمت و شہرت کا راز اس کی فوجی کامیابیوں میں تلاش کیا ہے، لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ کے بقول اس کی بخشش حوض شمسی کی تعمیر کی وجہ سے ہوئی جس سے ساری دلی کو پانی پہنچا تھا۔

فوائد الفواد میں اصلاح و تربیت کے بعض اہم نکتے بڑے دل کش انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں اصلاح خطرہ کی منزل پر کرنی چاہیے۔ عزیمت و فعل تک معاملہ پہنچ جائے تو کوشش زیادہ سودمند نہیں ہو سکتی۔ جدید علم نفسیات کی روشنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ Knowing کی منزل پر ہی اصلاح مؤثر ہو سکتی ہے، ورنہ Feeling اور Willing تک پہنچ کر معاملہ دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ عورت اور مرد دونوں کی مساوات کے قائل تھے۔ فرماتے ہیں کہ اصل بزرگی عمل سے ہے، جنس سے نہیں۔

شیخ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم فوائد الفواد میں عملی حیثیت سے ظاہر ہوئی ہے۔ کس طرح وہ انسان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور خود تکلیف اٹھاتے تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ اُن کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ فرمایا کرتے تھے:

> "جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے، کسی کو اس جہاں میں نہ ہوگا۔ اس واسطے کہ اتنی مخلوق میرے پاس آتی ہے اور اپنے رنج و تکلیف بیان کرتی ہے۔ ان سب کا بوجھ میرے دل و جان پر پڑتا ہے۔"

فوائد الفواد کے صفحات میں ان کے بے چین قلب کی دھڑکنیں سُنی جا سکتی ہیں، بشرطیکہ کانوں میں اُن کے سننے کی صلاحیت ہو۔

فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو نیک و بد دونوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا چاہیے۔ اگر ایک شخص نے تمہاری راہ میں کانٹا رکھا اور تم نے ایک اور کانٹا اس کی راہ میں رکھ دیا تو دُو

کانٹے ہو گئے۔ کوئی بُرائی سے پیش آئے تو اس سے بدلہ لینے کی کوشش کرنے کے بجائے اسے معاف کر دینا چاہیے۔ بُرا کہنا بُرا ہے، بُرا چاہنا اس سے بھی زیادہ بُرا۔ خود بینی سے بچنا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا بدبینی سے پرہیز۔ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ انسان بُرا کب ہوتا ہے؟ فرمایا: جب اپنے تئیں نیک خیال کرنے لگے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے نفس گرم سے اخلاق کے بے روح تصورات میں جان ڈال دی۔ وہ اپنی زندگی میں اخلاقی تعلیم اور روحانی تربیت کا ایک روشن مینارہ تھے جس سے انسانی زندگی کی تاریک راہوں میں اُجالا ہوگیا تھا۔ ان کی جدوجہد کا مرکز و محور اخوت کی جہاں گیری اور محبت کی فراوانی تھا۔ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کی یہ رباعی اکثر اُن کی زبان پر رہتی تھی:

ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد
و آنکہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ او در راہ ما خارے نہد از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

جو راہ میں کانٹے بچھانے والے کے لیے دعا کرے کہ اس کی زندگی کے باغ میں جو پھول بھی کھلے وہ بے خار ہو، اس کی اخلاقی اور روحانی بلندیوں کا اندازہ لگانے کے لیے قلب و نظر کی اور ہی وسعت درکار ہے۔ فوائد الفواد میں ایک عظیم الشان روحانی شخصیت کی تصویر متحرک نظر آتی ہے۔

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو

تہذیب و ترجمانی: مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی

اسلام کیا ہے؟

جس طرح لفظ "اسلام" کا کسی زبان میں ایسا ترجمہ نہیں ہو سکتا جس سے پورے مفہوم کی ایک لفظ میں وضاحت ہو سکے اسی طرح اسلام کی کسی مذہب یا نظام حیات یا نظریہ سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی ہے، وہ آپ اپنی تفسیر ہے۔ قرآن کریم کے بہت سے الفاظ زکوٰۃ، تقویٰ، خشیت، توفیق کی طرح ایسے ہیں جن کا ترجمہ جو بھی کیا گیا ناقص ہی رہا، خود اسم جلالہ (اللہ) کا ترجمہ 'گوڈ' سے کیا جاتا ہے جو چھوٹے حرف جی سے ہو یا بڑے حرف سے، اللہ کا مفہوم نہیں ادا کرتا، اس لیے محتاط ماہرین السنہ نے ترجمہ میں بھی بعینہٖ یہی الفاظ رکھ دیے ہیں۔

"اسلام کیا ہے؟" ایک اچھا جائزہ ہے جس میں تمام ممکن و موجود نظام حیات سے تقابل کر کے دکھایا گیا ہے کہ اسلام اپنے مفہوم کے لحاظ سے منفرد ہے۔

اصلاً یہ مقالہ انگریزی میں ہے، مقالہ نگار کا نام مذکور نہیں، البتہ اس کو اردو کا خلعت مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی نے پہنایا ہے۔ [ادارہ]

عام طور پر اس سوال کا سرسری و سطحی جواب تو یہی دیا جائے گا کہ "اسلام دنیا کے پانچ بڑے زندہ مذاہب میں سے ایک ہے، اور باقی چار مسیحیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ مت ہیں۔"

اس جواب کی ساخت بتاتی ہے کہ اس میں "ریلی جن" کے معنی ہیں "عقیدہ و عبادت کا ایک نظام"۔

حالانکہ اسلام نے اپنے آپ کو یہیں تک محدود نہیں رکھا کہ عقیدہ و عبادت کا ایک نظام مرتب کر کے دے دیا اور بس۔

وہ مسیحیت کی طرح امور مملکت سے مستعفی ہو کر کسی قیصر کے حق میں دستبردار نہیں ہو جاتا، بلکہ خلافت کے نام سے اپنا ایک عالمگیر سیاسی اقتدار خود قائم رکھنے کا عزم رکھتا ہے۔

وہ ہندوازم کی طرح، اپنے وابستگانِ دامن کو کسی دوسری معاشیات سے رشتہ جوڑنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ اس کو اپنا لیں اور متبنٰی بنالیں، بلکہ خود اپنا ایک نظامِ اقتصادان پر عاید کرتا ہے جس کے اندر سود خواری و ربا کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

وہ یہودیت کی طرح، صرف ایک ہی قوم (نسل) کے فلاح و بہبود کی فکر نہیں رکھتا، بلکہ عالمگیر ہے اور اپنی عالمی حیثیت اور بین الاقوامی اقتدار کا دعویدار رہے۔

وہ بدھ مت کی طرح، فوجی قوت کے استعمال سے روکتا نہیں، اس کی اجازت دیتا ہے اور فوجی نظم و نظام اور اس کے استعمال کے اصول و قواعد بھی عطا کرتا ہے۔

لہٰذا اسلام صرف "نظام عقیدہ و عبادت" نہیں ہے، وہ سیاسی نظام بھی ہے، معاشی نظام بھی ہے، عالمی و بین الاقوامی تعلقات کا نظام بھی ہے اور عسکری نظام بھی ہے، اور یہیں سے واضح ہے کہ اسلام انگریزی لفظ "ریلی جن" کے مفہوم میں "صرف مذہب" نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے بلکہ اسلام اس سے زیادہ کچھ ہے۔

اچھا، تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "اسلام ایک قانون (Law) ہے"؟ یہاں قانون (Law) کے معنی ہیں "ضابطۂ اعمال"۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے، بہ ایں مفہوم کہ وہ زندگی کے تمام مراحل و منازل اور تمام احوال و اشکال کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کرتا ہے، اور تمام انسانوں کے لیے مقرر کرتا ہے۔ لیکن وہ اسی حد تک آکے تھم نہیں جاتا۔ اسلام جہاں ضابطۂ حیات ہے وہیں وہ ایک فلسفۂ حیات بھی عطا کرتا ہے۔ وہ ایک خاص طرزِ فکر کا مبلّغ و ترجمان بھی ہے، مزید براں اپنے فلسفے، اپنے قانون اور نفسیات کو روبہ عمل لانے کے لیے اپنے مادی (فزیکل) اور اخلاقی (مارل) اقتدار کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام صرف ایک قانون ہے۔

تو کیا اسلام کوئی فلسفہ ہے؟ فلسفہ کے معنی ہیں "حقیقت آخریں کی تلاش و جستجو کے لیے خصوصی طریقے اختیار کرنا اور ان طریقوں کی مدد سے حقیقت آخریں کا کوئی تصور قائم کرنا"۔ یقیناً اسلام اس وجود حقیقی یا حقیقت آخریں کو جاننے پہچاننے کے واضح اور متعین طریقے پیش کرتا ہے اور اس حقیقت آخریں کے بارے میں اپنا ایک جامع تصور بھی رکھتا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام محض ایک فلسفہ ہے، اسلام نے ایک ثقافت و تہذیب اور ایک تمدّن کی تخلیق بھی اپنے اسی فلسفے کی بنیاد و اساس پر

کی ہے، اسلام کے ان مادّی مظاہر کو اس کے فکری نظریات وتصوّرات یا اس کے روحانی تجربات سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔

اچھا اگر اسلام ایسا ہی جامع نظریہ اور ہمہ گیر تصوّر ہے جو مذہب — اور قانون — اور فلسفے کے مجموعے سے بھی زیادہ کچھ ہے تو کیا ہم اس کے لیے جرمن زبان کی وہ اصطلاح استعمال کریں جو اپنی وسعتِ مفہوم اور زبردست ہمہ گیری کی وجہ سے اب دوسری زبانوں میں بھی جوں کی توں لے لی گئی ہے، یعنی کیا ہم یہ کہیں کہ اسلام ایک" ویلٹا نشا اُونگ" ہے؟ اس جرمن اصطلاح کے لفظی معنی ہیں "عالمی نظریہ"۔ اور اصطلاحی طور پر یہ لفظ سب کو سمیٹے ہوئے ہے، مذہبی نظریے کو بھی، سیاسی نظریے کو بھی۔ معاشی نظریے کو بھی اور اس نظریے کو بھی جو آرٹ سے متعلق ہو۔

لیکن اسلام اس زبردست تصوّر سے بھی زیادہ عظیم ہے قدآور ہے، اسلام کا نقطۂ نظر صرف اسی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا جو اس زمین پر ملتی ہے وہ دوسری دنیا کی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے بلکہ آخرت کی زندگی پر اس کا اصرار اور بھی زیادہ ہے۔ اسلام کا تصوّرِ مرگ اس کے نظریۂ حیات سے کم طاقت ور نہیں ہے۔ ویلٹا نشا اونگ موت کے صرف انھیں تصورات کو اپنے دائرے میں لیتا ہے جو دنیاوی نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی تعلق اُن مسائل سے یقیناً نہیں ہے جو دوسری دنیا کے ہیں، اور اس زمین کی زندگی میں ان کی اہمیت نظر نہیں آتی۔ ویلٹا نشا اُونگ کا انطباق واطلاق ایسے دنیاوی نظریات وتصوّرات پر ہوتا ہے۔ جیسے کمیونزم، فاشزم، نازی ازم اور کیپٹلزم کے ہیں اور یہ سب کے سب مادّی زندگی تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ ان کو اگر خدا کی صفات سے یا فرشتوں کی دنیا سے یا جنّت وجہنم کے مسائل سے کچھ دلچسپی ہے بھی تو صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ امور دنیاوی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لیکن اسلام کی نظر میں موت ایک منزل ہے انسانیت کے ارتقا کی۔ اسلامی تعلیمات میں شہادت کا مرتبہ یا صوفیوں کا روحانی مشاہدۂ حق، نہ صرف یہ کہ بذاتِ خود مقصود ہیں بلکہ حیاتِ فانی کے معاملات وامور سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔

اور اگرچہ ویلٹا نشا اونگ عالمی نقطۂ نظر کو اپنے دائرے میں سمیٹتا ہے لیکن یہ مشکوک ہی ہے کہ وہ اس عالمی نقطۂ نظر کو روبہ عمل لانے کے لیے کسی واقعی اور حقیقی نظام کے قیام اور اس کے

مسائل سے بھی کوئی تعلق رکھتا ہے۔ ویلٹانشا اونگ میں اس قسم کے نظم و نظام کے اصول بھی شامل ہو سکتے تھے اگر قوتِ تخئیل کو تھوڑی سی وسعت اور دی جاتی۔ لیکن بذات خود ایسی کسی تنظیم کا قیام اور عملی کارروائی اور اس کے ٹھوس نتائج و اثرات، ویلٹانشا اونگ کے احاطے میں نہیں آتے۔ اس کے برخلاف اسلام اپنے ادارات و تنظیمات پر اسی طرح حاوی ہے جس طرح وہ اپنے ذہنی و فکری اور روحانی واخلاقی نقطۂ نظر پر حاوی ہے بلکہ یہی نقطۂ نظر ہے جو اس کے ان تمام ادارات و تنظیمات کی تہ میں کارفرما رہتا ہے۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اسلام صرف ایک ویلٹانشا اونگ ہے۔ اسلام اس سے بھی زیادہ ہے۔

اگر اسلام اتنا ہی جامع ہے اپنے اصولوں کا بھی اور اپنے ادارات و تنظیمات کا بھی، تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اسلام ایک نظامِ معیشت اور نظام الاقتصاد ہے"؟ یہاں نظامِ معیشت کے معنی ہیں" اصولوں اور اعمال کا وہ نظام جو کسی منظّم انسانی معاشرے کے اندر تمام ضروریاتِ زندگی کی پیداوار اور اس کے صَرف کو کنٹرول کرتا ہو۔"

یقیناً اسلام، اس مفہوم میں ایک نظامِ معیشت اور نظامِ اقتصاد ہے کیونکہ وہ ان اقدار و اعتبار کو اور اصول و قواعد کو جن پر کسی نظام الاقتصاد کی بنیاد رکھی جاتی ہے خواہ وہ مجرّد ہوں خواہ موجود، ایجابی اور سلبی تمام صورتوں میں اپنے کنٹرول کے اندر رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ اسلام اس لحاظ سے ایک نظام الاقتصاد ہے، وہ صرف نظام الاقتصاد بھی نہیں ہے۔ اسلام اپنا ایک نظامِ عقیدہ و عبادت بھی رکھتا ہے اور تنظیمِ مملکت کا ایک ایسا سیاسی نظریہ بھی سکھاتا ہے جو صرف معاشی و اقتصادی مفادات ہی تک محدود نہیں ہے، یہ اسلام کے مختلف پہلو ہیں باہمد گر بستہ و پیوستہ جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنے سے پوری صداقت کبھی آشکارا نہیں ہوگی کہ اسلام ایک نظامِ معیشت اور نظام الاقتصاد ہے۔

تو کیا یہ کہنے سے بات پوری ہو جائے گی کہ "اسلام ایک ثقافت ہے تہذیب ہے"؟ یہاں ثقافت و تہذیب کے معنی ہیں: "ذہنی و فکری شائستگی اور لطافت احساس و نزاکت ذوق کے ساتھ انسانی معاشرے کی ایک خاص طرز اور خاص ڈھنگ پر نشوونما اور توسیع وارتقا۔" بلاشبہ اسلام اس مفہوم میں ایک ثقافت ہے تہذیب ہے۔ اسلام کا مرتب کردہ انسانی معاشرہ،

فرق و تمیز کا، ارتقا کا، اور ذہنی و فکری نظم و ترتیب کا اور اس کی رفتار کا ایک خاص رُخ اور مخصوص قالب بھی رکھتا ہے جو اسی عالم میں اُبھرتا بھی جاتا اور ترقی کی جانب ابھارتا بھی جاتا ہے۔ یہ سب سہی لیکن اسلام اس قسم کے ذہنی ارتقا تک ہی محدود نہیں ہے وہ انسانی معاشرے کے اخلاقی اور مادّی عوامل کو بھی متاثر کرتا ہے مزید براں حیات بعد الممات کا اور انسان اور خدا کے باہمی ربط کا جو تصوّر و تعلق ہے، وہ ایسی چیز ہے جو فقط ثقافت و تہذیب کے دائرے سے ماوراء ہے۔ لہذا اسلام فقط ثقافت و تہذیب سے کہیں زیادہ کچھ ہے۔

تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اسلام ایک تمدّن ہے؟"۔ تمدّن کے معنی ہیں "وہ طرزِ خاص اور وہ مخصوص نمونہ جو انسانی معاشرے کے مرتب نشو و نما کی صورت میں نظامِ جسمانی کی طرح صحتمندانہ اُبھر کر سامنے آئے اور اس کی ترقیاں مادّی شکلوں میں نمایاں ہوں۔ ہاں اس مفہوم میں اسلام ایک تمدّن ہے کیونکہ اسلامی بنیادوں پر جو معاشرہ تشکیل پا کر اُبھرتا ہے وہ اپنے داخلی نشو و نما اور خارجی نظم و انتظام کا ایک واضح متعین اور باقاعدہ نمونہ رکھتا ہے اور ایسے معاشرے میں اس کے خارجی کمالات اور مظاہرِ اعمال جیسے فنِ تعمیر اور نظامِ خانوادہ اور مذہبی مناسک اور دنیاوی تقریبات تک سبھی نمایاں اوصاف اور خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، لیکن اسلام پھر بھی تمدّن سے کہیں زیادہ ہے، اسلام کو جتنی فکر فرد کی رہتی ہے اتنی ہی فکر معاشرے کی رہتی ہے۔ اسلامی ہدایات کا اطلاق کائنات کے ان تمام پہلوؤں پر بھی ہوتا ہے جو انسانی معاشرے کے مسائل اور ان کے دائرے میں آتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات جو حیات بعد الممات سے تعلق رکھتی ہیں وہ بعض اعتبارات سے معاشرۂ انسانی بلکہ خود انسانیت سے بھی آزاد و مستقل اور مستغنی ہیں۔ اسلامی ہدایات کا اطلاق مخلوقات کی اُن دوسری صورتوں اور شکلوں پر بھی ہوتا ہے جیسے جن ہیں اور فرشتے ہیں، اس لیے اسلام، تمدّن کے تصوّر سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم و معنیٰ کا حامل ہے۔

تو کیا ہم یہ کہیں کہ "اسلام ایک نظامِ سیاستِ مدن ہے؟"۔ نظامِ سیاست کے معنی ہیں، "وہ تمام شعوری و غیر شعوری، انسانی اور طبیعی قوتیں اور ان کی کارفرمائیاں جو کسی متمدن متجانس و مربوط خطے میں آباد متعین و متمیز گر[illegible]

کے ساتھ بسر کرتا ہو، ایک دوسرے سے قریب تر کریں اور مربوط و مرتبط رکھیں"۔ اس مفہوم میں اسلام یقیناً ایک نظامِ سیاست ہے کیونکہ وہ اپنے ماننے والوں کو ایک گروپ کی صورت میں یکجا کر کے ایک دوسرے سے جوڑتا ہے اور جوڑ کے رکھتا ہے۔ اور ممکن ہو تو وہ ان کو ایک ہی مربوط اور متجانس خطے میں آباد بھی کرتا ہے اور ان کے اندر امداد باہمی کا جذبہ اور تعاون کی روح بھی پھونکتا ہے، لیکن اسلام صرف اسی قدر نہیں کرتا۔ یہ نظامِ سیاست سے بھی بہت زیادہ کچھ ہے۔ اس کی فکر صرف اسی حد تک نہیں رہتی کہ افراد کو سمیٹ کر کسی خاص گروہ یا جماعت یا قوم کی صورت میں ڈھال دے اور پھر ایک قوم کی صورت میں اس کو چلاتا رہے۔ اسلام بین الاقوامی تعلقات کی ایک ایسی تنظیم کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیتا ہے کہ وہ گروہ اور وہ جماعتیں اور وہ اقوام جو اس کے اپنے نظامِ سیاست سے باہر ہوں ان کے لیے بھی سودمند ثابت ہو اور ان کو بھی فائدے پہنچائے اس لیے کہ وہ ساری انسانیت اور تمام ابنائے آدم کی حریت و آزادی اور نجات کا یکساں ترجمان اور علمبردار ہے۔ مزید برآں اسلام کے یہ تمام پہلو، جو اوپر بیان ہوئے ایسے اشخاص و افراد سے بھی تعلق خاص رکھتے ہیں جو ماورائے حدود انسانی ہیں، اور ظاہر ہے کہ نظامِ سیاست کا کوئی تصور ان کو اپنے دائرے میں نہیں سمیٹ سکتا۔ حتیٰ کہ انسان اور خدا کا وہ رشتہ و ربط بھی جو کسی کمیونٹی اور قوم کی زندگی، اس کی قوتوں اور کارروائیوں کی حدود سے باہر اور آزاد ہو اور مادی طور سے ان پر اثر انداز بھی نہ ہو، تو یہ سب بھی نظامِ سیاست سے پرے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام صرف ایک نظامِ سیاست ہے۔

تو کیا ہم یہ کہیں کہ "اسلام ایک مملکت ہے؟" یہاں مملکت کے معنی ہیں: "سیاسی، انتظامی، عدالتی اور قانون سازی کے اداروں کو برسرِ عمل لانا اور ان کو قائم و برقرار رکھنا جن کے ذریعے کسی واضح اور متعین خطے یا خطوں کے اندر بسنے والا کوئی آزاد گروہ انسانی اپنے معاشرتی و اجتماعی وجود کو قائم رکھتا ہے اور اسے ترقی دیتا ہے"۔ تو اس بات کے اقرار و اعتراف میں بھی کوئی پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ اس مفہوم میں اسلام ایک مملکت ہے، اسٹیٹ ہے لیکن اس قسم کی مملکت یا مملکتوں کی تخلیق اور ان کا قیام و بقا بھی اسلام کا صرف ایک پہلو ہے۔ ورنہ بحیثیت نظامِ عقیدہ و عبادت، بحیثیت تمدن، بحیثیت ثقافت و تہذیب، حتیٰ کہ بحیثیت نظامِ معیشت

واقتصاد بھی (خواہ اس کی صورت کتنی ہی منتشر و پراگندہ کیوں نہ ہو) اسلام آج بھی زندہ ہے حالانکہ اسلام کی مملکتِ خلافت کا وجود گزشتہ ربع صدی سے ختم ہو چکا ہے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ اسلام کی عالمی مملکت ختم ہو گئی لہذا اسلام بھی ختم ہو گیا، اس کے علاوہ یہ تاریخ کا پہلا موقع بھی نہیں ہے کہ اسلام کو اپنی مملکت کے بغیر بھی رہنا پڑا ہو۔ اسلام ارتقائی قوت بھی ہے اور انقلابی قوت بھی ہے۔ عالمی صورتِ حال اجازت دے تو اسلام کی مملکت پھر چل پڑے گی۔ عالمی حالات اسلامی مملکت کا خاتمہ کر دیتے ہیں تو اسلام پھر اپنی مملکت کے قیام کا کام شروع کر دیتا ہے۔ بہرکیف یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام صرف ایک مملکت ہے۔

تو کیا یہ درست ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ "اسلام ایک نسل و قوم (ریس) ہے؟" یقیناً اسلام نے ایک نسل و قوم بھی پیدا کی ہے اور اسے برقرار بھی رکھا ہے۔ "ایک مختون قوم، گوشت خور نسل، جنگجو، دلیر اور مجاہد امت۔ جو اپنی لڑکیاں اپنے دائرے اور حلقے سے باہر بیاہنا کبھی پسند نہیں کرتی"۔ لیکن اس کے باوجود اسلام اس مفہوم میں ریس نہیں ہے جو عام طور پر اس اصطلاح سے سمجھا یا مانا جاتا ہے، کیونکہ وہ قبولِ دین کے ذریعے دوسری نسلوں کے افراد کو اپنی قرابت نسلی اور اپنے رشتۂ خون میں برابر داخل کرتا رہتا ہے۔ اسلام کا خدا کسی نسلِ خاص کا خدا نہیں ہے بلکہ ربّ العالمین ہے، عالمگیر ہے کائناتی ہے۔ اس لیے اسلام ایک نسل (ریس) کی تمام ایجابی و اثباتی اور قطعی واضح اوصاف وصفات کا حامل ہونے کے باوجود نسلیت و نسل پرستی کی تمام سلبی و منفی حد بندیوں کے روگ سے یکسر محفوظ ہے، لہذا اسلام نسل (ریس) سے بھی کہیں بالا ہے۔

اچھا اگر اسلام خون کے رشتے کا قائل نہیں ہے تو کیا ہم یہ کہیں کہ اس کا رشتہ ذہن و فکر سے ہے؟ — کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اسلام ایک تصوّرِ حیات اور ایک نظریہ (آئیڈیالوجی) ہے؟" نظریہ حیات کی دوسری مثالیں اور نمونے ہیں کیمونزم، کیپٹلزم، فاشزم اور نازی ازم۔ اس لیے اسلام آئیڈیالوجی بھی نہیں ہے کیونکہ اسلام وہیں تک محدود نہیں ہے جس کو ذہنی و فکری صداقتوں کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام مادّی حقیقت کے ایک تصوّر کا ترجمان بھی ہے اور مادی احوال و کوائف کو سبکدستی و سلیقہ مندی کی تدبیروں سے اپنانے اور استعمال کرنے کا خواہشمند بھی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ کیمونزم، کیپٹلزم اور اس قسم کے دوسرے نظریات بھی صرف ذہنی و فکری صداقتوں تک محدود نہیں ہیں۔ ان کی بیشتر کارفرمائیاں اور حاصلاتِ کمال، مادّی

دنیا کے اندر رونما ہیں بلکہ یہ بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ ان نظریات کی عمارتیں عقلی تجربات پر اٹھائی گئی ہیں، جبکہ دوسری طرف اسلام کی اساس و اقدار کا منبع و سرچشمہ وحی الٰہی ہے، لہٰذا یہ مذکورہ نظریات اور "آئیڈیالوجیاں" موضوعی ہیں اس مفہوم میں کہ ان نظریات کی قوتِ محرکہ اور ان سے حاصل ہونے والی آسودگی سب مبنی و منحصر ہیں اس نقطۂ نظر پر جو حقیقت کے بارے میں اختیار کر لیا گیا ہے اور جس کی بنا پر نیچر کو ایسا انفعالی و دوامی عنصر سمجھ لیا گیا ہے جس کو انسانی اغراض و خواہشات جیسے چاہیں استعمال کریں اور کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف اسلام کا نقطۂ نظر حقیقت کے بارے میں واقعیت پسندانہ اور "معروضی" ہے، یعنی اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر نیچر منشائے الٰہی کا فقط ایک میکانیکی کارگزار ہے اور انسانیت کو بھی اس واجب التعمیل خدمت گزاری میں نیچر کی ہمدمی و ہمرنگی اختیار کرنی ہوگی۔ اس نقطۂ نظر کا تقاضا یہ ہے کہ نیچر کو جو زیرِ نظر ہے سہارا دیا جائے، فائدہ پہنچایا جائے۔ اس پر اپنی من مانی نہ تھوپی جائے۔ مادی احوال و کوائف کو برتنے اور استعمال میں لانے کا یہ اسلامی طریقہ تعلیلِ عقلی کا نہیں، تعمیلِ اخلاقی کا ہے، تصرفِ عقلی کا نہیں، تعرفِ اخلاقی کا ہے۔ یہ طریقۂ عمل مبنی ہے خود نیچر کے اُن اصولوں پر جو وحیِ خداوندی سے معلوم ہوئے ہیں۔ سطحی اور من موجی ترنگوں اور علتہائے عقلی کے اثرات کا حاصل نہیں ہیں۔ لہٰذا اسلام محض ایک آئیڈیالوجی بھی نہیں ہے اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ وہ خود اپنی ایک آئیڈیالوجی بھی رکھتا ہے۔

تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ "اسلام ایک سائنس ہے؟" یہاں سائنس کے معنی ہیں: "وہ باقاعدہ تجربی دنیاوی علم جو حوادثِ فطرت کے کسی واضح کردہ حلقے اور شعبے کی نسبت حاصل ہو۔" ہر سائنس اپنے مطالعہ و مشاہدہ کے طریقے خاص رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم میں اسلام ایک سائنس ہے کیونکہ وہ فطری حوادث و واقعات کا ایک منظّم و مرتّب تجربی دنیاوی علم پیش کرتا ہے۔ اور اس قسم کا علم حاصل کرنے کے طریقے اور وسیلے بھی اس کے خاص ہیں۔ لیکن بیان کردہ اور واضح کردہ حقائقِ فطرت کے کسی ایک حلقے یا شعبے یا جنس و نوع میں بھی وہ اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا۔ بلکہ دوسری جانب اس کے علم نے فطرت و حوادثِ فطر[illegible] حلقوں اور شعبوں اور انواع کو سمیٹا ہے اس لیے اسلام اگرچہ تمام سائنسوں کے موضوعات و مضامین کے بارے میں اپنی قطعی رائے رکھتا ہے۔ تاہم یہ کہنا غلط ہوگا کہ اسلام فقط ایک سائنس ہے۔ اسلام کو صرف علم ہی سے دلچسپی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی دلچسپی ہے کہ علم کا اطلاق و انطباق صحیح طور پر ہو۔ مزید براں تجربی دنیاوی علم کے علاوہ اسلام وحی و تنزیل کے

علم سے بھی کام لیتا ہے۔ لہٰذا سائنس ہونے کے باوجود اسلام سائنس سے زیادہ کچھ ہے۔

اچھا تو پھر شاید یہ کہنا ٹھیک ہو کہ اسلام ایک آرٹ ہے؟ آرٹ کے معنی ہیں: "انسانی مساعی کے کسی خاص دائرے کے اندر استعمال کردہ مشق و مہارت کے واضع کردہ اصولِ عامّہ"۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم میں اسلام یقیناً ایک آرٹ ہے کیونکہ انسانی مساعی کی بہت سی جولانگاہوں میں عملی افادیت کے عمومی و کلّی اصول و قواعد اس نے مرتب کیے ہیں۔ مثال کے طور پر فن تعمیر ہے، خطاطی اور خوش نویسی ہے، اور عرفانِ حقیقت کا صوفیانہ تجربہ و علم ہے، خطابت ہے، تعلیم ہے اور طبّاخی (کھانے پینے کی چیزیں تیّار کرنے میں جدّت طرازیاں وغیرہ) ہے . . . پھر بھی اسلام آرٹ سے بھی کہیں زیادہ ہے کیونکہ ایسی مشق و مہارت کے اصولوں کے علاوہ فلسفہ جیسے نظری و فکری و علمی موضوعات سے بھی بحث کرتا ہے اور انسانی مساعی کے ساتھ وہ اس علم و معرفت کو بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ کائنات کے اندر خداوندِ قادر و حکیم کس قدر دخیل ہے، کار فرما ہے۔

المختصر، ان تمام امور کی یہ چھان بین اور یہ تحقیق و تفتیش، ہمیں اس لازمی نتیجے کی طرف لے جاتی ہے کہ اسلام بہت ہی بڑی کُلّیت کا نام ہے اور انگریزی زبان میں بلکہ دنیا کی کسی زبان میں بھی، بجز عبرانی کے، ایسا کوئی تصوّر سرے سے پایا نہیں جاتا کہ وہ اپنے کسی ایک لفظ میں بلکہ ایک فقرے میں بھی اس کلّیت کے مفہوم کو ادا کر سکے۔ اسلام نہ تو "ریلی جن" ہے نہ "قانون"، نہ "فلسفہ" ہے نہ "ویلٹانشاونگ"، نہ "نظام معیشت و اقتصاد" ہے، نہ "ثقافت"۔ نہ "تمدن" ہے نہ "نظامِ سیاست"، نہ "مملکت" ہے نہ "نسل"، نہ "ایڈیالوجی" ہے نہ "سائنس" اور نہ "آرٹ"۔ ان میں سے کوئی اصطلاح بھی نہ تو علیحدہ علیحدہ اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے نہ بحیثیت مجموعی سب مل جل کر بھی اس کی تذکیر و تلقین کا مفہوم پورا کرتی ہیں حالانکہ اسلام خود ان تمام اصطلاحوں پر اچھی طرح حاوی ہے بلکہ ان تمام اصطلاحوں کے مفہوم و معنے کے ساتھ وہ دوسرے مفہوم و معنے بھی اُس کے اندر موجود ہیں جو ان میں سے کسی ایک کے اندر بھی شامل نہیں ہیں، لہٰذا اسلام کی صحیح تعریف و توضیح کے لیے واحد عملی صورت ہمارے سامنے یہی رہ جاتی ہے کہ ہم انگریزی میں عربی زبان سے ایک لفظ مستعار لیں (ویسے بھی عربی وہ زبان ہے جس کو اسلام نے اپنے پیغام کا واسطہ بنانے کے لیے شروع ہی سے منتخب کیا ہے) پھر اس درآمد کردہ عربی لفظ کی حتی الامکان پوری پوری تشریح انگریزی زبان

میں کریں۔

اسلام، زندگی سے بھی زیادہ جامع اور عظیم ہے، بلکہ خود کائنات سے بھی زیادہ، کیونکہ اس کے اندر ذات واجب الوجود کا صرف پیغام ہی شامل نہیں ہے بلکہ کچھ اس کی معنویت و عظمت و تقدیس بھی اس داخل ہے۔ اسلام ایک "کُل" ہے (سالم و ثابت، کامل و اکمل، ہمہ جہت و ہمہ گیر) اپنے اصل مفہوم و معنے میں ہر طرح جامع و مانع۔ وہ کسی تخمین عقلی، کسی تعلیل ذہنی، اور کسی جزئی تقسیم و تحویل اور تجزیہ و تحلیل سے متاثر و مجروح نہیں ہوتا۔ اسلام کی صاف و صریح ترجمانی سے غیرسامی زبانوں کی رمزیت و اشاریت، یکسر عاجز و قاصر رہی ہے۔

لہذا ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اسلام ایک دین ہے" (کائناتی و ابدی، پائدار و لازوال ہدایتِ ربانی، جو تمام مخلوقات و موجودات کے لیے ہے، ہستی و عدم کے تمام پہلوؤں پر مشتمل، اور انسانی و غیرانسانی افراد و اشخاص کی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں پر حاوی، جو اس ہدایتِ ربانی کے مطابق، اپنی تکمیلِ ذات کریں۔)

ایک فرنچ فلسفی کا مقولہ

ترجمان مولانا عبدالماجد دریابادی

یورپ کی اب تک سب سے بڑی غلطی یہی رہی ہے کہ اس نے بجائے اس اندرونی انقلاب کے باطنِ انسان میں اس تغیر و اصلاح کے ہمیشہ صرف ظاہری، خارجی تغیرات کو کافی سمجھا، ہیگ میں 'مجلس صلح' کی عدالت و مجلس اقوام کا قیام وغیرہ سب سطحی و نمائشی تدابیر ہیں، جب تک انسان کی روح (اسپرٹ) نہ بدلی جائے گی جب تک انسان کے باطن میں نہ اصلاح ہو گی جب تک قلب انسان کی گہرائیوں سے ضد و عناد، مخالفت و منافست کی جڑیں نہ کاٹی جائیں گی، اوپر کی شاخوں کی کاٹ چھانٹ قیامت تک حصول مقصد میں ناکام رکھے گی۔

(منقول از پیام امن ص ۱۲۶)

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی

فنونِ لطیفہ کی شہ رگ

[فاضل مقالہ نگار نے اس مقالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ماورائی، روحانی، اور اخلاقی قدریں فنونِ لطیفہ اور فلسفہ جمالیات کی شہ رگ ہیں۔ انھوں نے پلیٹو (PLATO) سے برنارڈ شا تک نقدِ ادب کے عمودی اور مرکزی مضمون کا علمی انداز میں جائزہ لیا ہے۔]

[ادارہ]

مثالی کامن ولتھ سے شعراء کا اخراج اور اس کے اسباب :

آج جس طرح سائنسی اختراعات و ایجادات کو انفرادی اور قومی ذہنی ارتقاء کا میزانیہ تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی فنون لطیفہ بالخصوص شعر و شاعری کو قومی انسانی قوت کا پیمانہ تسلیم کیا جاتا تھا اور اسی کے ذریعہ کسی قوم کی تہذیبی ترقی و سربلندی کا اندازہ بھی لگایا جاتا تھا۔ آج بدقسمتی سے شعر و شاعری، فلسفہ جمالیات اور دیگر اصناف فنون لطیفہ کو ملّی ترقی کے لیے نہ صرف غیر ضروری، بلکہ مہلک بھی تصور کیا جاتا ہے۔ انھیں افیم یا نیند آور دوا سے تعبیر کر کے ان سے گریز کی تلقین کی جارہی ہے۔ سائنسی علوم کے ان جارحانہ اقدامات کی وجہ سے شاعری کے نازک آبگینہ کو صدمات پہنچ رہے ہیں۔ لیکن شعر چونکہ ایک لازوال وہبی نعمت اور ماورائی عطیہ ہے، اس لیے یہ زندہ ہے، اور زندہ رہے گا۔ انسان جب تک کرۂ ارضی پر آباد ہے اور جب تک اس کے پہلو میں دھڑکتا ہوا دل ہے، اس کے قلب سے اشعار اسی طرح پھوٹتے رہیں گے جس طرح سورج سے کرنیں، چاند سے چاندنی، پھول سے خوشبو، آبشار سے پانی اور طائر غرد سے سحر انگیز نغمے! انسان ازل سے غیر مرئی اور ماورائی حسن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال اس کے

فلسفہ جمالیات کی اساس ہے۔ فنونِ لطیفہ کی جو شاخ بھی اس ماورائی جمالیات کے ادراک سے معرا اور مبرا ہوگی وہ خشک ہو کر سوکھ جائے گی اور رزم روح انسانی (Epic of Human soul) کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ فلسفہ جمالیات کا ادراک ماورائی حقیقت کے وجود کو تسلیم کیے بغیر اور اس کے روحانی و اخلاقی نظام کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں۔ اس ادراک و عرفان کی طلب بقدر پیمانہ تخیل مغرب و مشرق کی ہر قوم کے اندر پائی جاتی ہے۔ نادان ادیب و ناقدین ادب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ادب میں اخلاقیات اور روحانیت کا ذکر بے ادبی ہے۔ ادب، ادب ہے، تبلیغ دین نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ نادان ادیب و شاعر اور ناقدین انسانی جوہر کھو بیٹھے اور تنویر افکار و تولید شاہکار سے بھی محروم ہو گئے۔ بعض فنکار اشتراکی یا مارکسی ادب کے جال میں اس طرح پھنسے کہ ماورا نام کی کوئی چیز ان کے ہاں باقی نہ رہی۔ ادب و فن کو روٹی، کپڑا اور مکان کے مثلث میں محصور کر ڈالا۔ بعض احباب فرائڈ کے غلام ہو کر اس کے افکار کی گاڑی کو بیل کی طرح ڈھونے لگے اور قاری کے اعصاب پر جنسی آسیب کو مسلط کر ڈالا۔ بعض نادان دوست وجودی فلسفہ کے مجاور بن گئے۔ اس طرح فن و ادب، شعر اور نقد شعر کو بازیچۂ اطفال بنا ڈالا۔ ادب اور معاشرہ (Sociology of literature) پر جلدوں کی جلدیں سیاہ کر ڈالیں اور ادب کو سماجی زندگی کا آئینہ دار قرار دے کر معاشرہ کی خدمت کا آلۂ کار قرار دیا۔ لیکن ان بلند دعووں کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ روحانی اور اخلاقی قدریں بھی اسی معاشرہ کی جان ہیں۔ ادب کے واجبات میں یہ امر داخل ہے کہ وہ ان فرائض کی ادائگی میں کوتاہی نہ کرے۔ اشتراکی نظام فکر ستّر سالوں میں جانکنی کا شکار ہے۔ خود روسی سرزمین میں اس کی جڑیں گھر نہ کر سکیں۔ آج ایک متبادل نظام کی تلاش ہے۔ کامریڈ اسٹالن کو مانسٹر (Monster) قرار دے کر انسان کشی کا مجرم قرار دیا جا رہا ہے۔ وجودی فلسفہ بھی یادِ ماضی بن چکا ہے البتہ فرائڈ کا جنسی آسیب ہنوز ہمارے اعصاب پر سوار ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے نادان ادیب و شعرا سفلی تحریکات سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور مغرب سے اٹھنے والی ہر تحریک سے مرعوب ہو کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ مغرب میں بھی صالح افکار کے پیش رو ادبا، شعرا اور ناقدین کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں کہ مغربی افکار سے استفادہ ممنوع ہے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر (اچھی چیزوں کا اختیار کرنا اور بُری اشیا سے اجتناب) کا آفاقی فارمولا، رہنمائے اصول کی حیثیت سے ہماری ہدایت کے لیے کافی ہے۔ پھر

الحکمۃ ضالۃ المومن (حکمت و دانش امت مسلمہ کی متاع گم شدہ ہے) اسی فارمولے کی تائید مزید ہے۔ فضائل حسنہ اور خصائل حمیدہ کا اظہار ہمیشہ روحانی اور اخلاقی قدروں کے فروغ کا سبب رہا ہے، کلاسیکی ادب۔ جو وقت و زمانہ کی گرفت اور پابندیوں سے بالاتر ہے ہمیشہ اقدار عالیہ کا ترجمان رہا ہے۔ خیر و شر کے تصادم میں اسی کلاسیکی ادب کو حیات جاوداں نصیب ہوئی ہے۔ اس کی بالادستی کبھی زیر نہیں ہو سکی۔

وثنی یونان میں فلسفہ التذاذ و حظ اور فلسفہ اخلاقیات کی کش مکش:
پلیٹو (افلاطون) کی مثالی ریاست سے شعراء کا اخراج اور اس کے اسباب:

مغربی ادبیات کی تاریخ چار صدی قبل مسیح شروع ہوتی ہے، جب پلیٹو (Plato) اور اس کے شاگرد رشید ارسطو (Aristotle) کے درمیان فلسفہ جمالیات، شعر و ادب اور روحانیات و اخلاقیات کے مسائل پر تصادم شروع ہوا۔ یہ تصادم آج تک جاری ہے۔ پلیٹو نے شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی دوسری شاخوں میں، حقیقت نگاری اور روحانی و اخلاقی قدروں پر زور دیا، جب کہ ارسطو نے فنون لطیفہ کو محض لطف اندوزی اور حظ اور التذاذ کا ذریعہ قرار دیا۔ پلیٹو کے خیال میں شعراء و ادباء اور فنکاروں پر اخلاقیات کی پابندی لازمی ہے۔ اس نے یونان کے نظام تعلیم کا جائزہ لیا تو مایوس کن حالات نظر آئے۔ شعر و ادب، تھیٹر اور ڈرامے یونانی نسل کی اخلاقیات اور عقائد کو فنا کرنے کے درپے تھے۔ شعراء و ادباء بداخلاقی اور ہیجانی ادب کے فروغ دینے میں مصروف تھے (جس کی سچی مثال آج کے معاشرہ میں بھی مل سکتی ہے، جہاں نائٹ کلب اور کسینو (casino) کے ساتھ ساتھ پورنوگرافی کا پلندہ تیار کر کے تہذیب نو کی جڑوں کو کھوکھلا کیا جا رہا ہے)۔ یونان کے اس نظام تعلیم سے مایوس ہو کر پلیٹو نے ایک متبادل اور صالح معاشرہ کا خاکہ اپنے مثالی کامن ویلتھ میں پیش کیا۔ اپنی تالیف (The Republic) میں اس نے اپنے مثالی معاشرہ کا نقشہ پیش کیا۔ جس کے قائدین صلحاء اور خدا ترس ہوں گے اور جہاں صرف صالح ادب کو فروغ ہوگا۔ ایسا ادب جس میں دیوی دیوتاؤں کے افسانوں کے بجائے، حمد باری تعالیٰ ہوگا اور صلحاء اور نیک سیرت افراد کے کردار کی ترجمانی ہوگی، اس ریاست کے چلانے والے بھی خدا ترس صلحاء

ہوں گے۔ اس ریاست میں صرف ایسے فن کاروں، ادبا، شعرا کو رہنے کی اجازت دی جائے گی جو اقدار عالیہ کے فروغ میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔ چنانچہ اسی پالیسی کے ماتحت پلیٹو نے ان شعراء و ادبا کو اپنی کامن ولتھ سے دربدر کر دیا جو بد اخلاقی کے معلم تھے اور فحشیات یا فسق و فجور کے مبلغ تھے۔ وہ یونانی نسل کو ہیجانی، جنسی تہذیب کا عادی بنا رہے تھے۔ ایسے بدکار ادبا و شعرا کو صرف ریاست بدر ہی نہیں کیا بلکہ کامن ولتھ کی شہریت سے بھی محروم کر دیا۔ ان کو اس وقت تک داخلہ کی اجازت نہیں تھی جب تک تائب ہو کر وہ صالح ادب و فن کے فروغ کی قسم نہ کھائیں۔ پلیٹو نے اپنے کامن ولتھ میں ان فن کاروں کو آباد ہونے کی عام اجازت دے دی جو صالح ذوق کے مالک تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مبلغ بھی۔ جو جھوٹ، کذب بیانی، اشتعال انگیزی، نفاق، مبالغہ آمیزی، بدکاری وغیرہ امراض سے پاک تھے۔ اپنی تالیفات میں پلیٹو نے بکثرت ان شرائط کا ذکر کیا ہے۔ اپنی تالیفات مکالمات (ڈائیلاگ) اور ریاست (The Republic) میں اس نے اپنے انھیں افکار کا اعادہ و تکرار کیا ہے۔ اس نے فن الشعر کی دو قسمیں کر ڈالیں، ایک تو جنونی شاعری تھی، جو شعر کی دیویاں (Muses) شاعر پر مسلط ہو کر کہلوایا کرتی تھیں۔ مکالمہ، فیڈرس (Phaedrus) میں سقراط کی زبانی اس نے انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے پلیٹو نے مکالمہ کے دوسرے حصہ میں اعلیٰ اور کلاسیکی شعراء کو فلسفی کا درجہ عطا کیا ہے۔ اس کے خیال میں ہر وہ شاعر، مقرر، قانون داں اور دیگر دانشور جو اپنی تخلیق کی بنیاد حق گوئی و بیباکی پر رکھتا ہے، وہ فلسفی کہلانے کا مستحق ہے۔ فلسفی کا خطاب معاشرہ کے دانا و فرزانہ ہی کو عطا کیا جاتا تھا۔ مکالمہ آیون (Ion) میں بھی شعر و شاعری کا ذکر موجود ہے، مجلس مذاکرہ (Symposium) کے زیر عنوان مکالمہ (ڈائیلاگ) کا موضوع حسن و عشق (Love) ہے۔ اگا تھان کی زبانی پلیٹو اپنے افکار کی ترجمانی کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ عشق کا خدا (دیوتا) صرف منصف، عاقل اور بہادر ہی نہیں بلکہ شاعر بھی ہوتا ہے، بلکہ شاعروں اور فن کاروں کا خالق ہوتا ہے، سقراط کی زبانی وہ اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "عدم سے وجود میں لانے والا ہر انسانی عمل شعر ہے اور ہر فن کا خالق شاعر ہوتا ہے۔

یونانی وثنی عقائد کے مطابق چونکہ دیوتا اپنے پیغامات یا الہامات عوام تک شعر و شاعری کے ذریعہ ہی پہنچایا کرتے تھے اسی لیے شعر کی بڑی سماجی (Social) اہمیت تھی۔ معاشرہ کی تخلیق بھی

شاعری کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ شعر کی اس اہمیت کا اندازہ کرنے کے بعد پلیٹو نے اصلاح ادبیات (شعر و شاعری) کی مہم چلائی، اور حقیقت نگاری کو اساس شعر قرار دیا۔ شعر و شاعری چونکہ یونانی نظام تعلیم کے نصاب میں شریک تھی۔ اور اسکول کی تعلیم کا جزء اعظم بھی، اس لیے اس کا طاہر مطہر ہونا ضروری تھا۔ خدا کے متعلق فاسد و باطل عقائد کی آمیزش غلط تھی۔ ایتھنز (Athense) کے بچے الہائیات کا یہی مسخ شدہ تصور لے کر پروان چڑھ رہے تھے۔ ہومر (Homer) اور ہیسوڈ (Heseod) عظیم رزمیہ نگار شعرا نے علم الہائیات کو بیہودہ عقائد کے ساتھ ملوث کر دیا تھا۔ ہر قسم کی بداخلاقی خداؤں کی طرف منسوب تھی۔ دیوی دیوتاؤں کے شرمناک باہمی معاشقے، بغض و عناد کی گھناونی کہانیاں، باہمی لڑائیاں وغیرہ یونانی شاعری کا خام مواد تھیں۔ یہی کذب آمیز اور باطل شاعری طالب علموں کی سیرت و کردار کو غارت کر رہی تھی۔ خدا کے متعلق غلط تصورات، ان کے جنسی معاشقے کی داستانیں اس نودمیدہ نسل کی نفسیات میں ہیجان پیدا کر کے ان کو ناکارہ بنا رہی تھیں اور شجاعت و بطالت سے محروم کرتی جا رہی تھیں۔ اس فاسد نظام تعلیم کے بالمقابل پلیٹو نے اپنا نظام تعلیم پیش کیا اور اس نظام کو اپنے مثالی کامن ولتھ یا ریپبلک میں نافذ کرنے کی سفارش کی، تاکہ اس کی ریاست میں بہادر، شہسوار اور اعلیٰ کردار کے دانشور پیدا ہو سکیں اور اس مثالی ریاست کے محافظ اور رکھوالے (Guardians of the Republic) ثابت ہوں۔ اصلاح ادبیات کی تحریک یونان میں پلیٹو سے سو سال قبل شروع ہو چکی تھی اکزنوفینس (Xenophanes) اس کا سرخیل تھا۔ لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کی ذہنی فضا تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہو رہی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہنوں میں دیوی دیوتاؤں کے افسانوں کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ مثلاً اب زیس (Zeus) ایتھنا (Athena) اور اپولو (Appolo) کی شخصیات اور داستانوں کو شک کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا[1]۔

اصلاح ادبیات کے سلسلہ میں پلیٹو نے فلسفیانہ طرز استدلال اختیار کیا۔ اس کے خیال میں عالم منظور، عالم بالا (عالم غیر منظور) کی نقل (Mimicry) ہے۔ چونکہ ان مرئیات کی اصل عالم بالا میں موجود ہیں، اس لیے نقل کو اصل سے قریب ہونا چاہیے۔ اصل کی تمسیخ جائز نہیں ہے۔ اس عالم سفلی میں شاعری بھی عالم بالا کی شاعری کی نقل ہے۔ اصل اور نقل میں زیادہ بُعد قابلِ قبول نہیں ہے۔ بدقسمتی سے یونانی شعرا اس کو مسخ کرتے جا رہے تھے۔ شعر کو عقل کی رہنمائی کے بجائے جذبات کی

آبیاری اور پرورش کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ شاعری ہیجانی کی غذا بنتی جارہی تھی جذبات فاسدہ پر قابو پانے کے بجائے ان کو اشتعال دیتی تھی، ان کو گدگدا گدگدا کر ابھارتی اور نفس لوامہ کو بھڑکاتی تھی۔ اس فرسودہ روایت کی وجہ سے انسانی جوہر سرد پڑتے جارہے تھے۔ شعر کا مواد اور اسلوب دونوں باطل تھے۔ پلیٹو کے ان نظریات اور انقلابی تحریک اصلاحات نے یونان میں بغاوت کی فضا پیدا کر ڈالی اور ایک جمے ہوئے نظام کو چیلنج کر ڈالا۔ اس کے مقابلہ کے لیے سب سے پہلے خود ارسطو نے اپنے نظریات پیش کیے۔ ارسطو کے خیال میں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، فنونِ لطیفہ اور شعرو شاعری کا مقصد محض لطف اندوزی اور التذاذ ہے، تبلیغ اخلاقیات نہیں۔ فن برائے فن کا یہ نظریہ پلیٹو کے فن برائے زندگی کے نظریہ سے ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ سے دو اسکول وجود میں آئے۔ ارسطو کے خیال میں شاعری ذہن انسانی کا ایک خود مختار عمل ہے۔ اس کو مذہب، سیاست اور اخلاقیات کا پابند نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ارسطو نے عالم منظور و غیر منظور کی بحث کو نظر انداز کر ڈالا۔ اس کے خیال میں شاعر اور مورخ میں صرف اتنا فرق ہے کہ آخر الذکر گزرے ہوئے حوادث کی تالیف و تدوین کرتا ہے اور اول الذکر مستقبل میں آنے والے حوادث کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ پلیٹو نے جن شعرا کی مذمت کرکے اپنی ریاست سے خارج کر دیا تھا، ارسطو نے ان شعرا کی تعریف کی اور ان کا دفاع بھی کیا۔ شاعری کا سب سے بڑا مقصد اس کے خیال میں قاری کے لیے لطف مہیا کرنا تھا، شعر جذبات کشی کا آلہ نہیں بلکہ اظہار جذبات کا آلہ ہے اور یہی اظہار جذبات روحانی صحت میں توازن پیدا کرتا ہے۔ فن ڈرامہ میں شاعری کے ذریعہ انسانوں کے دبے ہوئے محزون جذبات کی تطہیر (catharsis) ہوتی ہے یہی تطہیر تزکیہ نفس کی طرف رہبری کرتی ہے۔

پلیٹو کی ریپبلک کے مرکزی خیالات کا سرسری جائزہ:

شعروشاعری کا جو معیار پلیٹو نے قائم کیا اس کا ذکر اوپر گزر چکا۔ مخالفت کے باوجود اس کا نظامِ فکر، تعلیم و تربیت اور اخلاقیات کی قدریں اب یونانی فلسفہ کی اساس بن گئیں[۲]۔ ریپبلک کے حصہ چہارم میں پلیٹو نے اپنے نظام تعلیم، تدریس ادبیات (شعروادب ڈرامہ موسیقی وغیرہ)

کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی اور پانچویں حصہ میں فلسفہ اور شاعری کی باہمی مخاصمت پر بھی روشنی ڈالی۔ ادب میں حقیقت نگاری پر زور دیا۔ یونانی شاعری پر سخت تنقید کی۔ اس کے خیال میں انسانی کردار کی تشکیل میں ڈرامائی شاعری کا عظیم کردار ہے لیکن بدقسمتی سے یونانی شعراء نے شاعری کو اس کا اصل کردار ادا کرنے سے قاصر رکھا اور انسان اور خدا کے متعلق باطل تصورات شعر میں پیش کیے۔ پلیٹو نے شعراء کو متنبہ (warn) کیا کہ وہ خرافات لکھنا بند کریں اور پروٹیس اور تھیسس کے جھوٹے قصے گھڑنا چھوڑ دیں، خداؤں کو جھوٹ بولنے پر مجبور نہ کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی جھوٹی تصویریں پیش نہ کریں۔ شعراء، خواہ غزل نگار ہو خواہ رزم نگار ـــ الٰہیات کی سچی تصویریں پیش کریں ان کو مسخ نہ کریں۔ شعراء ہمیں جھوٹا درس نہ دیں کہ دیوتا بدیسی بھیس میں انسانی آبادیوں کا چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ عالم بالا لغویات سے پاک ہے۔ چونکہ فطرت میں خیر کا حصہ غالب ہے اس لیے اس کی ترجمانی اسی طرح ہونی چاہیے۔

a) The poet must not tell us that 'the gods go to and fro among the cities of men, distinguished as strangers of all sorts from far countries; nor must they tell any of those false tale of Proteus and Thetis

b) God, then have no motive for lying. There can be no falsehood of any sort in the divine nature.

c) A poet, whether he is writing epic, lyric or drama surely ought always to represent the divine nature as it really is. And the truth is that nature is good and must be described as such.[۵۳]

شعراء کو ایک کھلے چیلنج کے ذریعے پلیٹو نے متنبہ کر دیا کہ اگر وہ خداؤں کے بارے میں باطل افسانے اور داستانیں نظم کریں گے تو ان کے ڈرامے ضبط کیے جائیں گے اور ان کو پیش کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ہماری ریاست کے حکمراں خدا ترس اور امکانی حد تک قدسی کردار کے مالک ہوں گے۔ ہومر اور ان کے رفقاء کو بھی ملول خاطر نہ ہونا چاہیے اگر باطل حصے ان کی شاعری سے نکال دیے جائیں۔

'If a poet writes of gods in this way, we shall be angry and refuse him the means to produce his play. Nor shall we allow such poetry to be used in educating the young, if we mean our Guardians to be god-fearing and produce divine nature in themselves so far as man may ... we shall ask Homer and the poet in general not to mind if we cross out all such passages of this sort'[۵۴]

پلیٹو نے نوٹس جاری کر دی کہ ہر مخرب اخلاق فن اور فن کار کو در بدر کر دیا جائے۔ مثالی (Ideal) ریاست میں ہر قسم کے آرٹ اور کلا پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔ فن یا آرٹ کے نام پر خصائل رذیلہ، فحاشی، عریانی، بے حیائی اور بد اخلاقی کو، خواہ نقاشی کے ذریعہ ہو۔۔۔ خواہ سنگ تراشی کے ذریعہ پروان چڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جو فن کار ان احکام کی خلاف ورزی کرے گا اس کو کامن ولتھ میں فنکاری کی اجازت نہیں ہوگی۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس مثالی ریاست کے محافظین (نگارجین) اخلاقیات رذیلہ کے ترجمان بنیں۔

'we must also supervise craftsmen of every kind and forbid them to leave the stamp of baseness, licence, meanness, unseemliness, on painting and sculpture or building or any other work of their hands, and anyone who can not obey, shall not practice his art in our commonwealth. We would not have our guardians grow up among representation of moral deformity' ۵۳

پلیٹو نے صالح ادب کی حمایت کی۔ وہ نہ تو شعر کا من حیث صنف سخن مخالف تھا نہ ہی دیگر اقسام فن سے اسے کوئی پرخاش تھی۔ وہ تو کذب آمیز اور مخرب اخلاق آرٹ کا مخالف تھا۔ صالح ادب، صالح فکر کے شعراء کو اس نے فلسفی کا خطاب ہی نہیں دیا بلکہ اپنی ریاست میں آباد ہونے اور فن کو فروغ دینے کی اجازت بھی دی۔ یہ استثناء (exemption) قابلِ لحاظ ہے، اس نے حقیقت نگار شعراء کا احترام اور استقبال کیا۔

کلانسن (Clanson) کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے وضاحت کر دی کہ ہومر بلاشبہ یونان کا سب سے پہلا اور سب سے عظیم المیہ نگار شاعر ہے، لیکن ہمارا معیار مختلف ہے۔ ہم تو اپنی ریاست میں اسی شعر و ادب کو پروان چڑھنے کی اجازت دے سکتے ہیں جس میں خدا کی حمد و ثنا ہو، اور صالح بندوں کے محاسن کا تذکرہ بھی۔

اگر جذبات کو برانگیختہ کرنے والی رزمیہ یا غزلیہ شاعری ریاست میں گھس آئی تو نہ صرف قانون کی بالادستی جاتی رہے گی بلکہ اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار کی بالادستی بھی جاتی رہے گی۔

'If so Claucon, ... you may acknowledge Homer to be the first and greatest of the tragic poets; but you must be quite sure that we can admit into our commonwealth only the poetry which celebrates the

praises of gods and of good men. If you go further and admit the honeyed muse in epic or lyric verse, then pleasure and pain will usurp the sovereignty of law and of the principles always recognised by common consent at the best' [۶]

پلیٹو نے اس کی بھی وضاحت کر دی کہ در بدر شاعری کو دوبارہ ہم اپنی ریاست میں داخلہ کی اجازت اسی صورت میں دے سکتے ہیں، جب شاعری اپنا قابلِ قبول دفاع پیش کرے اور یہ ثابت کر دے کہ وہ محض جذبات کو برانگیختہ کرنے والا التذاذی آرکار نہیں بلکہ معاشرہ اور حیاتِ انسانی دونوں کے لیے مفید اور شفا بخش بھی ہے۔ اسی دفاع کو بہ نظرِ استحسان قبول کیا جائے گا، کیونکہ یہ سبھوں کے لیے نفع بخش ہوگا۔

'*It is fair, then, that before returning from exile poetry should* publish her defence in lyric verse or some other measure; and I suppose we should allow her. Champions who love poetry but are not poets to plead for her in prose, that she is not mere source of pleasure but a benefit to society and human life. We shall listen favourably; for we shall clearly be the gainers, if that can be proved.' [۷]

مصادر (حوالجات):

[۱] پلیٹو، ریاست ص ۶۵

The Republic of Plato by F.M. Conford 1951

[۲] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو پلیٹو کا نظریہ تعلیم اور اخلاقیات مولفہ آر، سی، لوج (R.C. Lodge)

[۳] ملاحظہ ہو ریاست کے صفحات ص ۱۹، ص ۵۳ اور ص ۶۹

[۴] ایضاً ص ۸۴

[۵] ایضاً ص ۸۷

[۶] ایضاً ص ۳۳۱

[۷] ایضاً ص ۲۴۲

پروفیسر اختر جمال کمالی

عہدِ سعادت

انسان کی معراج تھا وہ عہدِ سعادت — ہر سمت تھیں چھائی ہوئی رحمت کی گھٹائیں
ہر ذرّہ میں تھا پرتوِ خورشیدِ رسالتؐ — معمورِ تجلّی تھیں مدینہ کی فضائیں
گردِ مہِ کامل تھا ستاروں کا وہ جھرمٹ — شرماتی تھیں خورشید کو بھی جن کی فضائیں
ہر سانس میں وہ رائحۂ خلقِ مجسم — فردوس کی نکہت سے معطر تھیں ہوائیں
سینوں میں بھرے عشق کی دولت کے خزانے — آنکھوں میں بسی جلوۂ زیبا کی ادائیں
پُرسوز اذانیں وہ بلالِ حبشیؓ کی — تقدیس کے نغمات، عقیدت کی نوائیں
پُرکیف نمازوں میں حضوری کا وہ عالم — ملتی ہوں سجدوں میں عبادت کی جزائیں
وہ فقر کے آغوش میں سلطانیٔ جاوید — تقدیرِ الٰہی کی ادا فہم دعائیں
سرداریٔ کونین کے وہ خلعتِ پُرنور — کپڑوں کے وہ پیوند، وہ بوسیدہ قبائیں
لبیک پکار اٹھتی تھی خود رحمتِ باری — ہونٹوں پہ جب آجاتی تھیں نصرت کی دعائیں

اللہ رے ان خاک نشینوں کا مقدّر
خود خالقِ کونین نے کیں جن کی ثنائیں

خالد جاوید شمسی

معارف "ذوق و شوق"

(اس نظم کے اکثر اشعار علامہ اقبالؒ نے فلسطین میں لکھے تھے)

الہامِ ذوق و شوق کا پس منظر:

فلسطین میں کوہِ اضمؔ کا دامن، کاظمہؔ کا میدان۔

طلوعِ آفتاب کا وقت ہے۔ سورج کی کرنیں دشت و جبل پر نور کی ندیاں بہا رہی ہیں۔ رات کے بچے کھچے بادلوں کے ٹکڑے سورج کا عکس پاکر اضم کی پیشانی پر رنگ برنگا جھومر بن گئے ہیں۔

کھجوروں کے پتے رات کی بارش سے دُھل دُھلا کر صاف شفاف ہو گئے ہیں۔ ہوا نرم و نازک ہے۔

نواحِ کاظمہ کے ریگستانی میدان رات کی بارش کے بعد صبح کی نرم و نازک ہوا سے ریشم کی طرح ملائم ہو گئے ہیں۔

ماحول کچھ ایسا پُرکشش ہے گویا 'حسنِ ازل' بے نقاب ہوا چاہتا ہے۔ ایک ایک نگاہ دل کی گرہوں کو کھولنے کے لیے کافی ہے۔

میدان میں جابجا ٹوٹی ہوئی طنابیں اور بجھے ہوئے ویران چولہے اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ مردانِ خدا کے بے شمار قافلے یہاں پڑاؤ ڈال کر رخصت ہوئے ہیں۔

راہِ حق میں آبلہ پائی کرنے والے یہ قافلے جہاں جہاں اپنے نشانات چھوڑ گئے ہیں، وہ مقامات خدا کی چاہت رکھنے والے ہر انسان کے دل و نگاہ کی جنت ہیں۔

یہاں غیب سے صدا آ رہی ہے کہ ٹھہرو! کاروانِ اہلِ محبت کے ان نقوش سے درسِ ذوق و شوق حاصل کرو اور اپنے مُردہ دلوں کو زندہ کرو:

لہ کوہِ اضم

آئی صدائے جبرئیل، تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

ذوق و شوق کی کمی اور مُردہ دلی کا احساس:

عرصۂ سفرِ حیات میں 'محفل آرائی' کا تصوّر طالب حق کے لیے 'زہر' سے کم نہیں ——
سودائے محبت کی نظروں میں یہ 'بزم کائنات' بڑی 'فرسودہ' اور بوسیدہ ہے۔ وہ نئی جنتوں کی تلاش میں جادہ پیمائی کے لیے مجبور ہے۔

محمود غزنوی، کارگہِ حیات کا سودائے محبت تھا جس نے 'سومنات' کے پُرانے بتوں کو اپنی سرمستی سے پارہ پارہ کر دیا۔

افسوس کہ آج قافلۂ حرم بے روح و بے جان روایتی اعمال میں سرمست ہے، لیکن کوئی محمود غزنوی آ کر اس جمود کو نہیں توڑتا۔

زندگی کا پورا ڈھانچہ نمائشی اور روایتی ہو کر رہ گیا ہے۔ عرب کا ذکر 'عربی مشاہدات' سے اور عجم کا فکر 'عجمی تخیلات' سے عاری ہے۔

'دجلہ و فرات' کے 'گیسو' ابھی تک بڑے 'تابناک' ہیں لیکن پورا 'قافلۂ حجاز' حسینؓ سے خالی ہے۔

دراصل طلب حق کی والہانہ سرگرمی عمل مٹ جانے سے دین اور شریعت سب تصوّراتی چیزیں بن گئیں۔ روزمرّہ کے معمولات دین نظریاتی بن کر رہ گئے:

عقل و دل نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

ابراہیمؑ کی قربانیاں اور حسینؓ کی شہادت خدا کی محبّت اور عشق سے وجود میں آئے۔
بدر اور حنین کے معرکے صحابہؓ کے عشق کی سرگزشتیں ہیں۔

دل کی تڑپ کے لیے دعا:

عشق کا مرکز خدائے وحدہ لاشریک ہے اس کی ذات 'معنی کائنات' ہے۔ مجاہدین کے

قافلے اس کی تلاش میں کفن بردوش نکلے تھے۔ اس کی ذات سے تعلق کم ہونا دل کی موت ہے۔ 'اہلِ علم' کی کور نگاہی و مردہ 'ذوقی' اور اہلِ 'ذکر' کی بے نوری و کم ہمتی کا سبب اس کے تعلق کا کمزور ہوجانا ہے۔

افسوس کہ عشق کی یہ آگ ٹھنڈی ہوچکی ہے۔ اقبالؒ نے خدا سے دل کی تڑپ کے لیے دعائیں مانگی ہیں اس کے کلام میں مجاہدین سلف کی 'آتش رفتہ' کا نشان ملتا ہے وہ گم شدہ جذبۂ جہاد کا متلاشی ہے۔ وہ اپنے کلام سے مومن کی زندگی میں 'آرزو' کو زندہ کرنا چاہتا ہے:

بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار وخس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو!

ظاہر ہے کہ قربانی اور خونِ جگر کے بغیر کوئی داعی اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا:

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں نہاں صاحب ساز کا لہو

وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ اسے دل کی تڑپ نصیب فرمائے اور چین سے نہ بیٹھنے دے:

فرصت کشمکش مده این دل بے قرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوئے تابدار را

شوقِ دیدار:

تڑپ زندہ ہو تو ذوق و شوق کا عالم عجیب ہوتا ہے، حجاب اُٹھ جاتے ہیں اور اُس ذات ورا ءالورا سے خطاب ہوتے ہیں جو صاحبِ لوح وقلم ہے جس کی برہان "قرآن کریم" ہے، جس کے ظہور نے عناصر کو فروغ بخشا اور ذرّے کو آفتاب عالمتاب بنایا، اس کی ذات 'جلال وجمال' کی مظہر ہے۔ 'سنجر و رستم' کی شان وشوکت اس کے جلال کی اور 'جنید و بایزید' کا غنیٰ، اس کے جمال کی شہادتیں ہیں۔

اگر اس کا ذوق وشوق نصیب نہ ہو تو 'نماز' بے نور ہے، سجدہ اور قیام بے جان ہے اور پوری عبادت ایک 'حجاب' ہے۔

اگر وہ ملتفت نہ ہو تو 'عقل' بے کار بھٹکتی رہ جائے اور 'عشق' نامراد ہو جائے:

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب!

دل سمجھتا ہے کہ اس کائنات کو منور کرنے والی چیز آفتاب نہیں کوئی اور ہے۔ بے تابیٔ دل یہاں تک شوق بڑھاتی ہے کہ بندہ پکار اٹھتا ہے:

"رب ارنی انظر الیک"

(اے میرے رب! اپنے دیدار کی ایک جھلک دکھا دے)

"قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی"

(جواب آتا ہے کہ) "مجھے ہرگز نہ دیکھ پاؤ گے تاہم پہاڑ کی طرف نظر کرو اگر یہ تحمل کر سکا تو تمھارے لیے ممکن ہو سکتا ہے

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

فراق، وصل سے بڑھ کر ہے:

اس کی لامحدود ذات کی آرزو میں انسان کی لامحدود ترقی کے مدارج پوشیدہ ہیں، سائنس اور معقولات کی دوڑ 'قابلِ تسخیر' تک ہے اور خدا کی ذات ناقابلِ تسخیر ہے اس لیے علوم عقلی (علم تخیل) کا نتیجہ انجام کے اعتبار سے تحصیل حاصل ہے۔

اس کے بالمقابل 'عشق' اس 'لامحدود' کی آرزو ہے جس کے محیط میں گنبد آبگینہ رنگ، بھی حباب ہے اس لیے اس کے منازل کی کوئی انتہا نہیں اور اس کی فتوحات، کائناتیں اور جنتیں ہیں۔ لیکن یہ فتوحات 'فراق' سے سرہوتی ہیں کیونکہ وصل میں مرگ آرزو، اور

ہجر میں لذت طلب، پائی جاتی ہے۔

اقبالؒ کہتا ہے کہ اس کے گزشتہ ایام جو علم مخیل (علوم عقلی) کے حصول میں صرف ہوے بے رطب (بے نتیجہ) ثابت ہوئے۔ عقل ظاہر تک محدود ہے اور کبر کی طرف مائل ہے اس کا پیکر 'ابولہب' تھا، جب کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت 'سراپا عشق' اور سراپا عجز و نیاز ہے۔

عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب!

عشق کی ابتدا بھی عجیب ہے اور انتہا بھی عجیب ہے، کبھی یہ حیلہ سازی کر کے پھسلا کر آمادہ کرتا ہے اور کبھی قوت کے ساتھ (عمل کے لیے) مجبور کرتا ہے۔ عشق کے مراحل طے کرنے میں وصل سے زیادہ 'فراق' کارآمد ہے۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب!

وصل کی حالت میں باوجود کوشش کے 'حجاب نظر' حائل ہوجاتا ہے:

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

دراصل اس پوری کائنات کی سرگرمیٔ عمل کا راز گرمیٔ 'فراق' میں پوشیدہ ہے۔ آرزو میں شدت فراق سے آتی ہے۔ "تگ و دو اور شورش ہاؤ ہو' فراق سے عبارت ہیں۔

فراق ہی ہر 'موج' کی 'جستجو' اور ہر 'قطرے کی آبرو' ہے۔

وفیات

امام خمینی کی وفات :

ایران کے دینی و سیاسی پیشوا جناب آیت اللہ روح اللہ خمینی کی وفات دنیا کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اہل ایران کو ان کی ذات سے وہ وابستگی تھی جو کسی قوم کو اپنے ہیرو سے ہو سکتی ہے، خبر رساں ایجنسیوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صدر حکومت، قوم ساز لیڈر، روحانی پیشوا کو اتنی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی جو خمینی صاحب کو ایران میں حاصل ہوئی۔

عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر پہاڑ کو تنکہ اور آفتاب کو ذرہ نہیں کہا جا سکتا، شماتت موت کے باب میں بے عقلی اور ذہنی پسپائی ہے۔ شیخ سعدی اچھی بات کہہ گئے ہیں :

به مرگ عدو جائے شادمانی نیست
کہ زندگانی ما نیز جاودانی نیست

امام خمینی نے ۸۸ سال کی عمر پائی، دنیا جب ان کے نام اور کام سے واقف ہوئی اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، مگر عمر کے اس سوکھے ہوئے دریا میں روانی غضب کی تھی، کون تصور کر سکتا تھا کہ امام باڑوں کے چوبی منبروں سے ایک 'ذاکر' اٹھے گا اور ڈھائی ہزار برس کے تاج کیرو کو پیروں سے روند دے گا؟ امریکہ جیسی زبردست طاقت کو گھٹنوں کے بل گرنے پر مجبور کر دے گا، روس کو تحقیر کے انداز میں ٹھکرا دے گا۔ خمینی صاحب سے عقیدہ کا اختلاف اپنی جگہ پر ہے مگر ان کی بڑائی کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی تسخیر فضا کی مہم کو حقیر گردانے، سائنس کی ایجادات سے انکار کر دے، خمینی صاحب اپنے عقیدہ اور اصول کے پکے تھے انھوں نے مذموم ناول نویس سلمان رشدی کے ہلاک کرنے کا حکم دے کر دنیا کے سامنے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ برطانیہ کو دشمن بنا لیا، مشرقی یورپ کے تمام ملکوں نے اپنے سفیر بلا لیے، اس کی

پرواہ نہیں کی بلکہ سفارتی تعلقات خود بڑھ کر منقطع کر لیے، امریکہ کے صدر نے نمائش کی، یہودیوں نے ان کے ہزاروں کارٹون بنائے، اسرائیل نے ان کے پتلے جلائے، مگر ان کی بے عقلی کی اس بات نے بہت سے عقلمندوں کے چہرے سے نقاب بھی تو اٹھا دی۔ برطانیہ نے اپنے ایک تھرڈ کلاس شہری کی حمایت کا بہانہ کر کے دکھا دیا کہ آج بھی وہ وہی برطانیہ ہے جس کے سینے پر صلیبی جنگوں کا تیر نہیں نکلا ہے، اس کی نظر میں اسلام اور اسلام کا نام لینے والا سب سے بڑا مجرم ہے۔

خمینی صاحب کی قیادت کا ایک سیاہ کارنامہ قابل نفریں ضرور ہے، انھوں نے حرمین شریفین کی تقدس کا اتنا بھی خیال نہیں کیا جس قدر وہ اپنے امام باڑوں کا احترام ملحوظ رکھتے تھے، انھوں نے سرزمین حرم کو سیاسی اکھاڑے میں تبدیل کرنے کا عزم کر لیا تھا جس کو رب 'اصحاب الفیل' نے ناکام بنا دیا، انھوں نے عراق کے حملہ آور ہونے کی غلطی کو کسی حال میں معاف نہیں کیا۔ وفود اوران کی جمعیت کی اپیلوں کی پرواہ نہیں کی، ان کی اس ضد پر لاکھوں جانیں قربان ہوگئیں، نوجوانوں کو للکارا اور کمسن لڑکوں تک کی باری آگئی جو 'کاظمین' کو آزاد کرانے کے لیے جان دیتے رہے۔

حرم پاک کی قدسیت کو مجروح کرنے اور ارضِ حرم کو سیاسی اکھاڑہ بنانے کی کاوش مذموم تھی اور مذموم کہی جائے گی، ان کے نامۂ اعمال پر سیاہ دھبے نہیں بلکہ ایک سیاہ باب ہے۔

لیکن ان ستم رانیوں کے باوجود اس بات کا انکار کرنا کہ خمینی صاحب اس صدی کی تاریخ میں اہم حیثیت کے مالک نہیں ایسا ہی ہے کہ کوئی اس دور کی سائنسی ایجادات، تسخیر فضا، مواصلاتی سہولتوں کے موجدوں اور کمپیوٹر ساز دماغ کی عظمت سے انکار کرے۔

امام خمینی کا انتقال ہو چکا ہے، مگر خمینیت کی جڑیں بہت گہری جا چکی ہیں، جو لوگ منتظر ہیں کہ اب ایران پھر سے اس دور میں واپس آجائے گا جب شاہ کی حکومت تھی، یا اس کی پالیسی بدل جائے گی خواب و خیال کی بات ہے۔

(ع ح ن)

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالم اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیاں

کل ہند دینی تعلیمی کنونشن:

کل ہند دینی تعلیمی کنونشن کے لیے جون کی پہلی اور دوسری تاریخوں کا اعلان تھا، جون کا مہینہ ملک کے دوسرے صوبوں کے لیے بالعموم اور اتر پردیش کے لیے بالخصوص انتہائی گرم ہوتا ہے، اندیشہ کیا جارہا تھا کہ موسم کی سختی کنونشن پر اثر انداز ہوگی اور غالباً کل ہند سطح پر نمائندگی نہ ہوسکے یا نمائندگی ہو بھی تو تعداد محدود رہے، لیکن جن مسائل ومشکلات پر غور کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے یہ کنونشن طلب کیا گیا تھا ان کی نزاکت، سنگینی اور وسعت کا گہرا شعور اور ان سے دلچسپی، وابستگی اور ان کے حل کے لیے فکر، طلب اور تڑپ اور داعی کی شخصیت کی کشش ودل آویزی اور اس کے خلوص پر مکمل اعتماد، سفر کی دشواریوں اور موسم کی سختیوں پر غالب آیا، چنانچہ نمائندگی کل ہند سطح پر ہوئی اور بھرپور ہوئی، اتر پردیش کے مختلف اضلاع کے علاوہ آسام، بہار، پنجاب، دہلی، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش سے مندوبین شرکت کے لیے آئے، بعض حضرات تو بستر علالت کو چھوڑ کر، مرض کی نزاکت، احتیاط اور معالج کے مشورے کو نظر انداز کرکے شریک ہوئے اور کنونشن کے مقصد سے اپنی بھرپور وابستگی کا ثبوت دیا، میرا اشارہ مخدومی حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندوی مدظلہ کی طرف ہے، ان کی علالت اور مرض کی نزاکت سے سبھی واقف ہیں، باندہ سے لکھنؤ کا سفر کیا اور کنونشن کی تیسری نشست میں تھوڑی دیر کے لیے قدم رنجہ فرمایا، ان کی دلی اور روحانی ہی نہیں جسمانی شرکت نے کنونشن کے داعیوں اور کارکنوں کو حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کیا۔

کنونشن کی پہلی نشست علامہ شبلی نعمانی کے اسم گرامی سے موسوم کتب خانہ شبلی کے وسیع زیریں ہال میں ٹھیک ساڑھے دس بجے تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی، صدارت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

صاحب ندوی مدظلہ نے فرمائی، نظامت کی ذمہ داری دفترِ مجلس استقبالیہ کے سکریٹری ڈاکٹر مسعود الحسن صاحب عثمانی نے سنبھالی۔ یہ نشست مندوبین اور نمائندگان پر مشتمل تھی اور کنونشن طلب کرنے کی ضرورت، اہمیت، صورت حال کی نزاکت اور بعض قانونی پہلوؤں کی تشریح و تجزیہ کے لیے خاص تھی۔ ڈاکٹر مسعود الحسن صاحب عثمانی کے علاوہ دینی تعلیمی کونسل کے سکریٹری اور خازن ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی، کونسل کے جنرل سکریٹری جناب ریاض الدین احمد صاحب، عبدالمنان صاحب ایڈوکیٹ، اقبال حسین صاحب ایڈوکیٹ، افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی ہند، مولانا احمد علی صاحب قاسمی جنرل سکریٹری مسلم مجلس مشاورت، مولانا محمد رفیق صاحب قاسمی (مدرسہ مظاہر العلوم وقف) اور ملّی جمعیۃ العلماء کے مولانا سید احمد ہاشمی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کنونشن کی تاریخوں کے اعلان کے بعد جمعیۃ علمائے ہند اور اس کے ذمہ داروں نے آکر جوڈرامائی صورت اختیار کی اسے مولانا ہاشمی نے شب خون مارنے والی سیاست قرار دیا اور کہا کہ شب خون مارنے والی سیاست سے ممکن ہے کسی فرد یا جماعت کو وقتی طور سے کچھ فائدہ پہنچ جائے لیکن یہ سیاست ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے حق میں انتہائی ضرر رساں ہے۔ صدر جلسہ کی دعا پر ایک بجے پہلی نشست کا اختتام ہوا۔

دوسری نشست کا آغاز بعد نماز مغرب ہوا، یہ نشست اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل تھی کہ اس میں خطبۂ استقبالیہ، خطبۂ افتتاحیہ، سکریٹری رپورٹ، اور خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ خطبۂ استقبالیہ رسمی نوعیت کا نہ تھا بلکہ تاریخی، علمی اور واقعاتی تجزیہ پر مشتمل تھا، اصابت رائے اور سنجیدہ علمی اسلوب کے اعتبار سے ان تمام خصوصیات کا حامل تھا جن کی مولانا ندوی جیسے عالم دین، داعی اور رہنما سے توقع کی جا سکتی ہیں۔ سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جنھوں نے خطبۂ افتتاحیہ پڑھا ایک موقعہ پر کہا "ہمیں اپنی بات پوری قوت سے بھرپور انداز میں کہنی چاہیے لیکن اپنے لب و لہجہ پر کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہیں دینا چاہیے"۔ ان کا پورا خطبہ اسی اصول کا آئینہ دار تھا۔ توقع ہے کنونشن کے ذمہ دار اس کی طباعت اور اشاعت کا فوری اہتمام کریں گے۔ سکریٹری رپورٹ واقعات و مسائل کے تجزیہ اور سنجیدہ اسلوب پر مشتمل تھی، خطبۂ صدارت حسب توقع عالمانہ اور بصیرت افروز تھا۔

دوسری نشست میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جو کنونشن کے داعیوں اور کارکنوں کے لیے کدورت کا باعث بنا، صوبائی وزیر محنت جناب سید الحسن صاحب اس نشست میں شریک ہوئے اور سرکاری نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت چاہی، ذمہ داروں نے ان کی خواہش کا احترام کیا اور

اجازت دے دی۔ اس موقع پر کچھ مہمان اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور ان کی بات نہ سننے پر اصرار کیا۔ جن اسباب کی بنا پر کنونشن طلب کرنے کی ضرورت پیش آئی ان میں محکمہ محنت کے افسران کی چیرہ دستیاں بھی شامل ہیں، وزیر موصوف اس محکمہ کے سربراہ اور ذمہ دار ہیں ارباب مدارس و مکاتب کی آہ و فغاں ان کو متاثر نہ کرسکی، کونسل کے ذمہ داروں کی جانب سے پیہم کوشش درخواست اور التجا کے باوجود سرد مہری اور تغافل کا رویہ اپنائے رہے، حالانکہ اگر وہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے ایوان حکومت کو باخبر کرتے اور ان کو صحیح مشورہ دیتے تو ملت اسلامیہ جس کے وہ ایک فرد ہیں کے تئیں وفاداری اور حکومت کے لیے بہتر خدمت گزاری کا ثبوت دیتے اور بر ترصلۂ خدمت کے مستحق قرار پاتے۔ خلاصہ یہ کہ نوجوان مہمانوں کی خفگی اور برہمی کا پورا جواز موجود تھا لیکن کنونشن کی مقصدیت، جہاں یہ کنونشن ہو رہا تھا اس کی شاندار روایات اور سب سے بڑھ کر اسٹیج پر تشریف فرما بزرگان ملت کے احترام کا تقاضا تھا کہ صبر و تحمل اور درگزر سے کام لیا جاتا، سب جانتے ہیں کہ کنونشن کے داعی محاذ آرائی کے مقابلہ میں افہام و تفہیم کا طریقۂ کار اپناتے ہیں اور اسی کو پسند فرماتے ہیں۔ دارالعلوم کے طلبہ اور کارکنوں نے اس نازک موقع پر جس تحمل، بردباری اور سوجھ بوجھ سے کام لیا مزید بدمزگی پیدا ہونے سے جلسہ کو بچایا وہ ان کی شاندار روایات کے عین مطابق تھا۔

تیسری اور چوتھی نشستیں تجاویز کے لیے خاص تھیں، اس میں بھی مختلف جگہ سے آئے ہوئے مندوبین نے سرگرم حصہ لیا اور زندگی، حرکت اور نشاط کا پورا ثبوت دیا، مغرب بعد اجلاس عام تھا اس میں شرکت کے لیے دور دور سے ہزاروں کی تعداد میں شرکا آئے تھے، کئی اضلاع سے متعدد بسیں آئی تھیں، اجلاس عام ساڑھے گیارہ بجے شب تک جاری رہا اس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی، جناب سید حامد صاحب، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب (ناگپور) مولانا عبدالجلیل صاحب چودھری (آسام) جناب عبدالرحیم قریشی صاحب (جنرل سکریٹری مجلس تعمیر ملت حیدرآباد) مولانا سید احمد صاحب ہاشمی (جنرل سکریٹری ملی جمعیۃ علماء ہند) مولانا سید سلمان صاحب حسینی ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء اور صدر انجمن شباب اسلام نے خطاب کیا۔ سب سے اخیر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے تقریر فرمائی اور دور و نزدیک سے آئے شرکاء کو آخری پیغام دیا، توحید خالص کا پیغام اور آئندہ نسل کو مسلمان اور توحید کا پرستار باقی رکھنے کے لیے عزم و فیصلہ کرنے کا پیغام تھا، امیر شریعت بہار و اڑیسہ حضرت مولانا

سید منت اللہ صاحب رحمانی مدظلہ کی دعا پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

کل ہند دینی تعلیمی کنونشن میں متعدد قرار دادیں منظور ہوئیں ان میں سے کچھ کا تعلق حکومت سے ہے اور کچھ کا تعلق خود مسلمانوں سے ہے، ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ بیسک شکشا پرشید کی ۲۱ رمئی ۱۹۸۵ء کی اس تجویز کو مسترد کردے، جس کی رو سے تسلیم شدہ جونیر ہائی اسکولوں کو اقلیتی کردار دینے سے انکار کردیا گیا ہے، مطالبہ کیا گیا ہے کہ بیسک شکشا ایکٹ میں ایسی ترمیم کی جائے کہ پریشد کو اس طرح کے اقدام کا اختیار باقی نہ رہے، اس تجویز پر عمل درآمد سے اقلیتوں کے اس بنیادی حق کی نفی ہوتی ہے جس کے تحت ان کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا اختیار دستور نے دیا ہے۔

ایک دوسری قرارداد میں اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، کہ یوپی ویمن اینڈ چلڈرن انسٹی ٹیوشن کنٹرول ایکٹ ۱۹۵۶ء میں اس طور پر ترمیم کی جائے کہ دینی مدارس و مکاتب اس ایکٹ کے دائرہ اطلاق میں نہ آئیں۔

ایک اور قرارداد میں اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، جن تجاویز کا تعلق خود مسلمانوں سے ہے ان میں سے ایک تجویز میں مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری خود قبول کریں اور بچوں کو اپنی مذہبی اور ثقافتی تعلیمات سے آراستہ کریں تاکہ بچے ارتداد کے خطرے سے محفوظ رہ سکیں، کنونشن نے اس اعتماد اور یقین کا اظہار کیا کہ مسلمان بچوں کی دینی اور اخلاقی تعلیم ان کو بہتر شہری بنانے میں معاون ہوگی اور ملک کے سیکولر نظام میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں گے، اس سے قومی یک جہتی کو بھی تقویت پہنچے گی کیونکہ ایک اچھا مسلمان ایک بہترین شہری ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک تجویز میں کہا گیا ہے کہ جو مسلمان بچے آج کل عصری اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان کے لیے دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے، اور یہ خدمت خود مسلم تنظیمیں انجام دیں۔ اس مقصد کے لیے دینی تعلیمی کونسل سے کہا گیا ہے کہ وہ آسان زبان میں مختصر کتابچے شائع کرے، اس مقصد کے لیے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے جائیں جن میں شبینہ اور صباحی مکاتب بھی شامل ہیں۔

کنونشن نے اس نظریے کی حمایت کی کہ مسلمانوں نے ملک کے سماجی، معاشی، سیاسی، تہذیبی

علمی اور دینی ارتقاء میں شاندار حصہ لیا اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جدید آزادی میں ملت اسلامیہ کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔

کنونشن نے یہ بھی محسوس کیا کہ اسلام کے کلچر، اخلاقی اور دینی اقدار کو ملیامیٹ کرنے کی سازش چل رہی ہے جس میں سرکار، عوام، ذرائع ابلاغ، قومی پریس اور درسی کتابوں کا بڑا ہاتھ ہے، ایک خاص مذہبی فرقے کے مذہبی تصورات اور رجحانات کو مسلم اور دیگر اقلیتوں پر مسلط کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے قومی یک جہتی کی آڑلی جا رہی ہے۔

توقع ہے یہ کل ہند دینی تعلیمی کنونشن دوررس اثرات کا حامل ہوگا، ایک طرف خود مسلمانوں اور ان کی مختلف تنظیموں کے اندر جذبۂ عمل پیدا کرنے کا محرک بنے گا نیز اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی اصلاح پر آمادہ کرنے کا باعث ہوگا، تو دوسری طرف ذمہ داران حکومت کو اپنی پالیسیوں اور مسلم اقلیت کے تئیں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے میں ممد و معاون بنے گا۔

موسوعہ عالم اسلامی:

کویت سے آمدہ ایک اطلاع کے مطابق کویت کی وزارت منصوبہ بندی عالم اسلام سے متعلق ایک موسوعہ (انسائیکلو پیڈیا) تیار کر رہی ہے، جسے امیر کویت کی جانب سے تنظیم مؤتمر اسلامی کی چھٹی چوٹی کانفرنس کے شرکاء کو بطور تحفہ پیش کیا جائے گا، چھٹی چوٹی کانفرنس آئندہ جنوری میں افریقی ملک سنغال میں ہونے والی ہے اور حسب ضابطہ اس کی صدارت امیر کویت کریں گے، معلوم ہوا ہے کہ مذکورہ انسائیکلوپیڈیا میں مؤتمر عالم اسلامی کے رکن ممالک جن کی موجودہ تعداد ۴۵ ہے، کے جغرافیائی حالات، آبادی، غذا، صحت اور تعلیم سے متعلق مواد ہوگا، یہ موسوعہ تین جلدوں پر مشتمل ہوگا، اس کے صفحات کی تعداد تقریباً دو ہزار ہوگی۔ اس کی اشاعت عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہوگی، توقع ہے آئندہ اکتوبر تک اس کی تیاری اور اشاعت کا کام مکمل ہو جائے۔

موسوعہ کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ہوگا جس میں غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلم اقلیتوں کے حالات و کوائف نیز ان کے مسائل و مشکلات مذکور رہوں گے۔

ماهنامہ

ذکروفکر

دھلی

جلد نمبر: (۶) ـــــ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ

شمارہ نمبر: (۴) ـــــ ماہ اگست ۱۹۸۹ء

ترتیب

افتتاحیہ	۱۔ مذاکرات	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲
مقالات	۲۔ سید قطب شہیدؒ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۸
جائزے	۳۔ کتابیں اپنے آبا کی	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۲۰
تحقیقات	۴۔ عرضداشت بحضور خیرالانام	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲۵
	۵۔ فنون لطیفہ کی شہ رگ (۲)	پروفیسر حبیب الحق ندوی	۴۰
اور	۶۔ تعارف وتبصرہ	(ادارہ)	۴۸
ادبیات	۷۔ عالم اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیاں	ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی	۵۱

مولانا عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

اسلام کے خلاف عمومی بیزاری اور نفرت پھیلانے کی مہم صدیوں سے جاری ہے، کسی ایک سازش کا پتہ چل جاتا ہے تو ہم چونک پڑتے ہیں حالانکہ سازشوں کا جال پھیلا ہوا ہے، اور اس راہ کی ہر کاوش پہلے سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہے، الحادی ادب کے چند نمونے جب اردو میں منتقل ہوئے تو بعض حلقوں سے اس کا رد کیا گیا، مگر وہ رد بھی ایسا ہے جو لکھنے والے اور اس کے محدود حلقۂ احباب سے آگے نہیں بڑھتا، اس کے مقابلہ میں جو تخریبی کوشش اعدائے اسلام کی طرف سے ہوتی ہے اس کی گونج مشرق و مغرب میں ہر جگہ سُنائی دیتی ہے۔

مثال کے طور پر ایڈنبرہ یونیورسٹی کے پروفیسر مانٹ گمری واٹ سیرت نبویؐ پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں، ان کی تالیفات میں دو مشہور کتابیں "محمد ایٹ مکہ" اور "محمد ایٹ مدینہ" ہے، اس کو جس ادارۂ نشر و اشاعت نے شائع کیا ہے اس کی شائع کردہ کتاب دنیا بھر کی لائبریریوں، یونیورسٹیوں، علمی و تحقیقی اداروں میں پڑھی جاتی ہیں، لندن یونیورسٹی پریس کے ۲۵ ہزار ایسے خریدار ہیں جن کی طرف سے ادارہ کو ہدایت ہے کہ جو کتاب بھی چھاپیں اس کے دو نسخے بھیج دیں، یہ تعداد بھی سنہ ۱۹۶۰ء کی ہے، اب ممکن ہے ۲۵ ہزار سے بڑھ کر ۵۰ ہزار ہوگئی ہو۔ سیرت کے نام پر جو دو کتابیں نکلی ہیں ان میں مستشرقین کے خاص انداز میں واقعات سیرت کو ایک کو دوسرے سے مربوط کرکے تاریخی حوالجات سے پیش کیا گیا ہے، حوالجات بھی ہماری کتابوں کے ہیں جن میں ابن اسحاق، ابن ہشام اور واقدی کے نام بار بار آتے ہیں، صحاح کی احادیث اور خود آیاتِ قرآنی سے استدلال ہے اور سب معروضی انداز میں ہیں، چند جملے ایسے بھی ہیں جن میں اعتراف کا پہلو نمایاں ہے۔ لیکن پوری کتاب پڑھنے کے بعد جو تصوّر صاحب سیرۃ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق قائم ہوتا ہے اس کے بیان کرنے سے قلم عاجز ہے۔ یہ کتابیں اتنی مشہور ہیں کہ بہت کم ایسے پڑھے لکھے لوگ ہوں گے جنھیں

ان کا علم نہ ہو، اس کے مقابل میں ایجابی طور پر تحقیقی انداز اور سنجیدہ اسلوب میں پروفیسر محمد حمید اللہ صاحب کی سیرۃ النبیؐ ہے جو اصلاً فرنچ میں ہے، انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوا ہے مگر اس کی اشاعت بہت محدود ہے۔ حسین ہیکل مصری نے بھی سیرت پر اچھی کتاب لکھی ہے اور اس میں ضمناً ان باتوں کا جواب بھی ہے جو مستشرقین اعتراض و اتہام کے انداز میں کرتے آئے ہیں، حال میں مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہٗ کی سیرت النبیؐ کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس میں معاندین کے پیدا کردہ شبہات کا مسکت جواب ہے مثلاً بحیرہ راہب کے متعلق یہ لغویات کہ اس نے تمام آسمانی باتوں اور رازہائے نبوت چند منٹوں کی ملاقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیے تھے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ماونٹ گمری واٹ کے ہفوات کا مدلل جواب مثبت انداز میں مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت عائشہؓ میں موجود ہے مگر ان کتابوں کی خبر کیا ان لوگوں کو ہے جو اسلام پر تحقیقات کے لیے مغربی درسگاہوں اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے ہیں ؟ یوروپ، امریکہ کی بات چھوڑئے خود اسلامی ممالک اور یہاں تک کہ مکہ مکرمہ، جدہ، ریاض کی جامعات میں آپ کو شاخت کی مارگیلوتھ کی، واٹ کی کتابیں مل جائیں گی، مگر مسلمان علماء کی کتابوں سے واقف لوگ بھی شاذ و نادر ملیں گے، اس صورت حال میں آپ کیا توقع کر سکتے ہیں کہ دعوت اسلام کے لیے کسی صاحب نظر کو ہموار راہ مل سکتی ہے ؟

آج امریکہ کے ہر اسٹیٹ میں، یوروپ کے تمام بڑے شہروں میں اسلامک سنٹر قائم ہے۔ مختلف انداز کے نشریات بھی دیکھے جاتے ہیں، ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں، مگر ان میں شریک ہونے والے سب تارکین وطن ہی ہوتے ہیں، مقامی باشندوں میں دانشور تو الگ رہے عوام میں سے بھی شاذ و نادر ہی کوئی نظر آتا ہے اور وہ بھی کسی خاص شخص کی ذاتی دوستی یا کاروباری مصلحت اس کے پیچھے ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے یوروپ و امریکہ کے لوگ اچھی تعداد میں دوسرے ادیان کی دعوتوں سے مسحور ہو جاتے ہیں، جو لوگ اپنے موروثی مذہب میں علم و اخلاص کا سراغ لگانے میں ناکام ہو گئے، اور تمدن کی جکڑ بندیوں سے آزادی چاہتے ہیں، ان کو دیکھا گیا ہے کہ کسی مہارشی، جوگی کے دام تزویر میں آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی بات نہیں ہے کہ ڈھول باجہ جلوس

اور ناچ رنگ کا مذہب ان کو دلفریب معلوم ہوتا ہے، ان میں جویائے حق بھی ہوتے ہیں، جو اپنے باطن کو آراستہ کرنا اور اپنی حقیقت کا پتہ لگانا چاہتے ہیں مگر ان کو صداقت وحقانیت کے صاف اور رواں چشمے سے دور کرنے کے اسباب قدم قدم پر ملتے ہیں اور جن افسانوی مذاہب کی طرف وہ مائل ہوتے ہیں اس کی کسی میں مخالفت نہیں ہے۔

مسلمان جماعتیں ایک ایسی دعوت دیں جس میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں، اور اصولی بات کہیں جس پر سب کا اتفاق ہے تو اسلام کے لیے اب بھی برگ وبار لانے کی گنجائش ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہر گروہ ایک خاص نظریہ کا حامل ہے، اس کے نزدیک دینِ حق کا ایک ہی راستہ ہے جو اس نے اختیار کیا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دوسرے کام کرنے والوں کی تحقیر کرے، اور چاہتا ہے کہ سب اس "صراط" کو اختیار کریں جو اس کے نزدیک "مستقیم" ہے۔
لہٰذا اسلام کی راہ میں سنگِ گراں صرف اغیار کی سازش ہی نہیں بلکہ اپنوں کی نوازش بھی ہے۔

عراق، ایران کی جنگ ختم ہوئے کئی ماہ ہو چکے، جنگ کے زمانے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے ہر فریق اپنے پروپگنڈے کی مشین کو تیز کر دیتا ہے، اس لیے ایران کی طرف سے رنگ برنگ کے پمفلٹ، کتابیں اور رسائل نکلتے رہے اور گھر گھر پہنچائے جاتے رہے، یہ سلسلہ کئی سال سے جاری تھا، امید تھی کہ اب جنگ بندی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، مگر علامہ خمینی کی وفات کے بعد چند رسائل ایسے نظر آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی حکومت نے اب تک اس طرح کے پیشہ ور لکھنے والوں کو ریٹائرڈ نہیں کیا ہے جو اسی ساز پر اپنے نغمے سنا رہے ہیں جس کا سلسلہ کئی سال سے جاری تھا، اور یہ قلم کار اگر صرف مرثیہ خوانی پر اکتفا کرتے تو شکایت نہ ہوتی، مگر وہ تو اپنی طرف سے واقعات بھی تصنیف کرنے لگے ہیں۔ جنوبی ہند سے نکلنے والے ایک رسالے نے خمینی صاحب کی وفات پر اپنی مخصوص نثر میں ایک مرثیہ قلم بند کیا ہے، جس میں خمینی صاحب کی عظمت کا اظہار کرنے کے لیے ضروری سمجھا کہ دوسروں کے نام لے کر تنقیص بھی کرے اور اپنی طرف سے ایسے "حقائق" بیان کرے جن کے حدود بہتان تراشی سے مل جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عین ایمرجنسی کے زمانہ میں اندرا

نے جشن منایا اور آنجہانی اندرا گاندھی کو مدعو کیا۔ حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے، ندوہ نے ایمرجنسی کے زمانہ میں جشن منانا طے نہیں کیا تھا بلکہ دو سال پہلے سے اپنے اجتماع کی تاریخ مقرر کی تھی، اور ایمرجنسی اس وقت نافذ ہوئی ہے جب اجتماع کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے، مہمانوں کے پروگرام بن چکے تھے۔ اس افسانہ کا دوسرا جزء بھی غلط ہے۔ اندرا گاندھی تو ایک خاتون اور وہ بھی غیر مسلم تھیں، ندوہ نے اس وقت کے صدر جمہوریہ کو بھی دعوت نہیں دی جو مسلمان تھے، اور ندوہ کے سربراہ سے احترام و اخلاص کا تعلق رکھتے تھے۔

باوجود ایک ناپاک سازش کے جو ایامِ حج میں کی گئی ۲۰ لاکھ مسلمانوں نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ حکومت سعودی عرب سے خواہ کسی کو سیاسی عناد ہو، یا وہاں کے سربرآوردہ علماء کے حنبلی یا "وہابی" ہونے کی وجہ سے کد ہو، اس حقیقت کو دوست دشمن یکساں طور پر تسلیم کریں گے کہ حرمین شریفین اور حجاج کی جو خدمت آلِ سعود نے کی ہے اس کی تاریخ اسلام میں نظیر نہیں ملتی، حرم مکہ سے لے کر عرفات تک پیدل چلنے والوں کے لیے سائبان (شیڈ) کے بننے سے لاکھوں حجاج نے موسم کی سختی کے باوجود آسانی سے راستہ طے کیا، ہر چند قدم پر ٹھنڈے پانی کے ڈرم رکھ دیے گئے تھے، عرفات میں سربراہ مملکت (خادم الحرمین) کے ذاتی مصارف سے مفت ٹھنڈے پانی کی تقسیم عام تھی۔ مقامی اہلِ ثروت اور تجار کی طرف سے برف کی سلیں لیے ہوئے گاڑیاں جا بجا کھڑی تھیں جو مفت برف تقسیم کر رہی تھیں۔ بھولے بھٹکے حاجیوں کے لیے ایک وسیع پناہ گاہ تھی جہاں کھانوں کے طبق اس طرح پیش کیے جا رہے تھے جس طرح ہوائی جہاز کے مسافروں کو کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کے عمدہ پیکٹ، گلاس اور پانی کے تھیلے کے ساتھ لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے، تقسیم کا انداز اس طرح کا نہیں تھا جیسے فقیروں اور گداگروں کو دیا جاتا ہے، لیکن خود حجاج بے صبری کا مظاہرہ کر رہے تھے اس لیے تقسیم کرنے والوں کو دشواری پیش آ رہی تھی۔ گذشتہ بیس برس پہلے جتنی تعداد عرفات اور منیٰ میں ہوتی تھی اب سال بھر ہر جمعہ کو ہوتی ہے اس لیے حرمین شریفین کی ایک توسیع ختم نہیں ہوتی کہ دوسری توسیع شروع ہو جاتی ہے۔ بیس لاکھ سے زیادہ مسلمان دوسرے ملکوں سے آئے جو جدّہ اور مکہ مکرمہ میں موجود ہیں۔ ان سے بار بار کہا جاتا ہے

کہ وہ اگر حج کا فریضہ ادا کر چکے ہیں تو نئے آنے والے حجاج کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ اہلِ مکہ کا زمانۂ قدیم سے دستور چلا آ رہا ہے کہ حج کے موقع پر وہ حرم شریف کی حاضری کم کر دیتے ہیں تاکہ باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو جگہ مل سکے۔

جہاں تک ہر ملک سے آنے والوں کی تعداد کو متعین کرنے کا سوال ہے یہ وقت کا مطالبہ ہے، مواصلات کی کثرت و سہولت، اور دنیا میں ہر جگہ معیارِ زندگی کے بڑھنے اور آمدنی کے اضافے کی وجہ سے مسلمان بار بار حج کی نیت کر لیتے ہیں۔ حرم مکہ میں ۵ لاکھ نمازیوں کی جگہ ہے، اب مزید توسیع کے بعد مزید تین لاکھ کی گنجائش ہو جائے گی، لیکن حجاج کی تعداد بھی مسلسل بڑھ رہی ہے، اس لیے مؤتمر عالم اسلامی (مسلم وزرائے خارجہ کی انجمن) نے بالاتفاق یہ تجویز منظور کی کہ حکومت سعودی عرب کو چاہیے کہ ہر ملک سے آنے والوں کا ایک کوٹہ مقرر کر دے، اس تجویز کو ۴۵ ملکوں کے وزرائے خارجہ نے منظور کیا۔ ایران کو چھوڑ کر کسی ملک نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ ایران کی حکومت اس پر مُصر ہے کہ وہ مشاعرِ حج کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرے، حرم شریف کے اندر نعرے لگائے جائیں، جلوس نکلیں، زندہ باد، مُردہ باد کے نعرے لگائے جائیں، اور دلیل یہ ہے کہ حرم سب کا ہے، اور مسلمانوں کی ملی، اجتماعی، دینی ہر ضرورت کے لیے اس کو ہر ایک کے لیے کُھلا رہنا چاہیے۔ اگر ایران کی یہ منطق تسلیم کر لی جائے تو حرم پاک میں نہ تو کوئی طواف کر سکتا ہے اور نہ کوئی سکون کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے، ایران کی طرح دوسرے ممالک بھی اس آزادی کے طالب ہوں گے، اور ہر ملک اپنے لیڈر کا پروپگنڈہ کرنے کے لیے حجاج کا سکون غارت کر سکتا ہے۔

سعودی حکومت کا موقف یہ ہے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے، ہُلّڑ بازی اور نعرہ بازی کی جگہ نہیں ہے۔ بے شک مسجد پر ہر مسلمان کا حق ہے مگر یہ حق عبادت کے لیے ہے نہ کہ سیاسی نعرے لگانے کے لیے۔ افسوس کہ ایران کی حکومت نے حج کا مقاطعہ اس سال بھی قائم رکھا، مگر مسلمانانِ عالم کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ حرم پاک کی حرمت میں کوئی فرق نہیں آیا، ہاں ایران کے باشندے اس سعادت سے محروم رہے۔

یوں تو دنیا بھر سے مسلمان حج کے لیے جاتے ہیں مگر جس قدر نظم وضبط کے ساتھ ملیشیا کے مسلمان

اس فریضہ کو انجام دیتے ہیں وہ قابلِ تعریف بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ حج کے لیے جانے والوں کو مناسک کی ادائیگی کی تربیت دی جاتی ہے، ان کو حج کے مسائل، فریضہ کی ادائیگی کے آداب بتائے جاتے ہیں، حرمین شریفین میں وہ سب سے زیادہ منظم اور باادب دیکھے جاتے ہیں، ملیزیائی حکومت نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ہر شخص اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس کام کے لیے حکومت کے خزانہ میں جمع کرتا ہے، حکومت اس رقم کو زراعت و تجارت میں لگاتی ہے، اس کے منافع شرعی مضاربت کے اصول پر جمع ہوتے رہتے ہیں، اور جب جمع شدہ اور نفع کی رقم اس کے مصارف کے لیے کافی ہو جاتی ہے تو اس کو تربیتی کیمپ میں بلا لیا جاتا ہے، گھر سے روانگی کے دن سے لے کر واپسی تک کے جملہ مصارف، اور ضروریات کا بندوبست حکومت اسی رقم سے کر دیتی ہے، اس طرح کوئی شخص اس سعادت سے محروم نہیں رہتا اور اس پر یکبارگی بار بھی نہیں پڑتا۔ جو لوگ اس مد میں رقم جمع کرتے ہیں ان سے لازمی یا جبری ٹیکس کے طور پر رقم نہیں وصول کی جاتی، بلکہ اپنی مرضی سے اپنی سہولت کے مطابق وہ سالانہ یا ماہانہ قسط جمع کرتے ہیں، حکومت کوئی امدادی رقم نہیں دیتی، اس کی امداد صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیسوں کو تجارت میں لگا دے اور خود کوئی ٹیکس نہ لے، اگر اس طرح کا انتظام دوسری مسلم ریاستیں بھی کریں تو بہت سی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے!۔

یہ بات افواہ نہیں ہے کہ مشیل عفلق جس کا وجود ہی عربوں کے لیے ایک سرطان سے کم نہ تھا، وہ مرنے سے پہلے اسلام لے آیا تھا، اور اس نے اس کا اعلان کیا کہ عربوں کا اسلام کے بغیر کوئی وجود نہیں ہے، یہ خبر اس اعلانیہ موت میں بتائی گئی جو حزب البعث العربی اور الحزب العربی القومی کے بانی کمان نے ۲۱ جون کو جاری کیا۔

مشیل عفلق ۱۹۱۰ء میں دمشق میں پیدا ہوئے اور ۷۹ سال کی عمر میں فرانس کے ایک ہسپتال میں فوت ہوئے، ان کے اسلام لانے کی خبر کو جیسا کہ مصری اخبارات کا بیان ہے ان کی زندگی میں مخفی رکھا گیا تاکہ اس کی کوئی سیاسی توجیہ نہ کی جائے۔ ایسے سخت جاں کافر گر، مسلم کش، اسلام سے عناد رکھنے والے مفکر کا ایمان لانا اسلام کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

تحریر: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ترجمہ: نورعظیم ندوی

سیّد قطب شہیدؒ

سید بن قطب شہیدؒ کی شہادت کے موقع پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بیان ایک علمی و تاریخی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے اپنے ایک معاصر دوست اور اکثر بیشتر دینی و اجتماعی افکار میں مشترک نقطۂ نظر رکھنے والے عالم کے حق میں جس منصفانہ انداز میں اعتراف کیا ہے اس کی اس دور میں کم مثال ملتی ہے۔ سید شہیدؒ سے مولانا ندوی مدظلہ کو اور سید شہیدؒ کو مولانا سے جو اُنس و اخلاص کا تعلق تھا وہ صرف ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کا مطمح نظر اور جن کے اختلافُ اتفاق کی بنیاد محض اللہ تعالیٰ اور اس کے دین سے وابستگی ہے۔ مولانا کو سید شہیدؒ سے بعض باتوں میں اختلاف بھی تھا جس کا برملا اظہار انھوں نے کیا ہے۔ سید شہیدؒ کے بھائی محمد بن قطب اور ان کے ہزاروں معتقدوں نے جب مولانا کی کتاب 'اسلام کی سیاسی تفسیر' پڑھی تو کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، اور علمی نقد کو علمی نقد ہی سمجھا، یہ علمائے عرب کی وسعت قلبی، بالغ نظری اور علمی و فکری سطح کے بلند ہونے کی دلیل ہے۔

اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے پہلے شمارہ میں شائع کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ باوجود ایک عرصہ گزرنے کے یہ تحریر آج بھی اہل علم کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک تعزیتی نوٹ یا کسی کی وفات پر تاثرات کے اظہار سے زیادہ ہے۔

(ع ح ن)

اسے حسنِ اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ سید قطب شہیدؒ سے میں پہلی بار اس مقدس شہر میں متعارف ہوا جسے مرکزِ اسلام اور نزولِ وحی کا مقام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ تعارف دید وشنید یا ملاقات وگفتگو کا نہیں، بلکہ خالص علمی وفکری تعارف تھا، جو ان کی مشہور اور بلند پایہ تصنیف "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" کے ذریعہ ہوئی، یہ قصہ سنہ ۱۹۵۱ء کا ہے جو اس سے بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا، اور ادبی وفکری ملاقات کے سارے امکانات موجود تھے، کیونکہ مشرقِ عربی میں رواں دواں اسلامی ثقافت کے قافلہ سے میرا تعلق کبھی منقطع نہیں رہا، میں مستقل اس کی کوشش کرتا رہا کہ اس قافلہ کی ہمرکابی سے محروم نہ رہوں، عرب ممالک کے مطابع سے نکلنے والی تمام چیزوں کے حاصل کرنے اور پڑھنے کا میرا شوق حرص کی حد تک بڑھا ہوا تھا، مصر کے کتب خانوں سے جو چیزیں بھی نکلتی رہیں، اچھی ہوں یا بُری، کھری ہوں یا کھوٹی، میری کوشش ہوتی تھی کہ ہر کتاب، ہر تحریر نظر سے گزر جائے، چنانچہ میں عباس محمود العقاد، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، احمد حسن الزیات، اور ان سے پہلے مصطفیٰ لطفی المنفلوطی اور رافعی وغیرہ کو پڑھتا رہا تھا، مصر سے شائع ہونے والے دو ممتاز ومعروف ہفت روزہ پرچے "الرسالۃ" اور "الثقافۃ" پابندی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، یہ دونوں صرف ہفت روزہ رسالے نہیں تھے بلکہ دو ادبی اسکول تھے، دونوں کے نقطہائے نظر الگ اور دونوں کا اپنا اپنا اسلوب تھا، اس دور میں مصر کے بیشتر ادبا اور نوجوان اہلِ قلم انھیں دونوں اسکولوں میں بٹے ہوئے تھے، اور میں ان دونوں رسالوں میں لکھنے والے اہلِ قلم سے واقف تھا، "الرسالۃ" میں سید قطب نام کے ایک صاحبِ قلم کے مضامین میری نظر سے گزرتے تھے جو اکثر ادبی وتنقیدی مسائل وافکار پر لکھا کرتے تھے، یہ بات بھی مخفی نہیں تھی کہ یہ عقاد کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کی مدافعت اور ان کے مخالفین پر تنقید میں پیش پیش رہتے تھے۔

لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ مجھے ان سے پہلا گہرا اور بھرپور تعارف بلد امین میں اور کعبۃ اللہ کے زیرِ سایہ حاصل ہو، اور اچھی زمین میں اچھا پودا ثابت ہو۔

"والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ۔" (الاعراف۔ ۵۸)

(اور پاکیزہ شہر اپنے رب کے حکم سے اپنے پودے نکالتا ہے۔)

قصہ یوں ہے کہ حجاز کے مشہور ادیب اور میرے محترم دوست استاذ احمد عبد الغفور عطار

عقاد اور سید قطب کے شیدائیوں میں تھے، سید قطب کو انسان اور ادیب دونوں حیثیتوں سے بہت پسند کرتے تھے، وہ ان دونوں ادیبوں کا تذکرہ بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے، سنہ ۱۹۵۱ء کی سردیوں کی ابتدا میں طائف کے ایک سفر میں ہم دونوں ایک ساتھ ہو گئے، اور مکہ مکرمہ سے قریب اس پہاڑی مقام پر چند دن ساتھ گزارنے کا موقع ملا، با ذوق و ہم خیال رفیق سفر سے سفر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے، استاذ احمد عبدالغفور عطار کی دلچسپ علمی و ادبی گفتگو نے اس سفر کو بہت دلچسپ و خوشگوار بنا دیا تھا، اسی موقع پر انھوں نے سید قطب کی کتاب "العدالة الاجتماعية فی الاسلام" مطالعہ کے لیے دی، جگہ پُر بہار تھی اور موسم خوشگوار، اور ذہن مطالعہ کے لیے آمادہ و تیار، میں کتاب پڑھتا رہا، متاثر بھی ہوتا رہا اور لطف بھی لیتا رہا، مجھے اس نوجوان اہلِ قلم کی تحریر میں افکار اور ان کی پیش کش کا نیا اور اچھوتا انداز نظر آیا، جو اسلام پسند اہلِ قلم اور خاص طور سے اس وقت کے عرب اہلِ قلم میں نظر نہیں آتا تھا۔

اس کی وضاحت کے لیے قدرے تفصیل درکار ہے:

مشرقی اور مغربی زبانوں میں، انیسویں صدی مسیحی کے نصف اخیر میں بہت سے مسلمان اہلِ قلم اُبھرے اور شہرت کی منزلیں طے کیں، مصر و ہندوستان میں اور ترکی و ایران میں بھی، لیکن ان کی تحریریں اور تصنیفات پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے جیسے یہ لوگ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں — اور ایسے مقدمات یا ایسی شخصیات کا دفاع کر رہے ہیں جو شکوک و شبہات کے گھیر میں گھرے ہوئے ہیں، ان کا مقدمہ کمزور ہے اور دلائل ناکافی، ان کی ساری کوشش اور محنت اس بات پر صرف ہوتی تھی کہ مخالفین کمزوریوں سے صرف نظر کر لیں، اور جو حکم صادر کریں اس میں زمان و مکان کے فرق کا اور ان کے مؤکل (وہ دعوت و تحریک ہو یا شخصیت) کو جن دشوار حالات کا سامنا تھا، اس کا لحاظ رکھیں، اور یہ کہ جن حالات میں ان لوگوں نے کام کیا، وہاں اس سے زیادہ کر دکھانا ممکن ہی نہیں تھا۔

اس طرزِ کلام کو معذرت خواہانہ (Apologetic) یا دفاعی (Defensive) کہنا زیادہ صحیح ہے۔

اس اسلوب و انداز کو اختیار کرنے والوں میں درجات کے تھوڑے فرق کے ساتھ مصر میں شیخ محمد عبدہ۔ اللہ ان کو معاف فرمائے۔ رفاعہ طہطاوی اور قاسم امین ممتاز تھے، اور ہندوستان میں

سرسید احمد خاں، سید امیر علی، صلاح الدین، خدا بخش اور منشی چراغ علی وغیرہ نے یہی انداز اختیار کیا، محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین بھی کم و بیش اسی راہ پر چلتے رہے، یہ حضرات اپنی تعلیم و تربیت کے اثر سے اور انگریز حکومت کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے غالباً یہ سمجھتے تھے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی عظمت و شوکت ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس میں نقد و نظر کی گنجائش ہی نہیں، یہ انسانی عقل اور انسانی علوم کی ترقی کا آخری زینہ ہے، مغربی تہذیب اور اس کے اقدار و افکار کے بارہ میں غور و فکر اور ان پر بحث و مباحثہ کا ان لوگوں کے ذہن میں خیال بھی نہیں آتا تھا، اور اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اس تہذیب یا ان افکار و نظریات پر قوت و اعتماد کے ساتھ تنقید کریں، ان کو چیلنج کریں یا جن بنیادوں پر اس تہذیب کی عمارت استوار ہوئی ہے ان کو بحث و نظر کا موضوع بنائیں، یہ اسلوب و انداز اس پُر اعتماد (ہجومی) طاقتور اور علمی اسلوب سے قطعاً مختلف تھا جیسے امام غزالیؒ نے یونانی فلسفہ پر تنقید کے لیے "تہافت الفلاسفہ" میں، یا ارسطو کی منطق پر تنقید کے لیے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے "الرد علی المنطقیین" میں اختیار کیا تھا، ان کے بعد صدیوں تک یہ اسلوب متروک ہی رہا، یہاں تک کہ مغرب کی ترقیوں کا دور آیا اور اس نے دل و دماغ کو مسحور کر لیا۔

راقم سطور پر اللہ کی مہربانی تھی اور اس کی حکمت، کہ ایسے ماحول میں اس کی نشو و نما ہوئی جو مغربی تہذیب و تمدن کی سحر طرازیوں اور دل فریبیوں سے محفوظ بلکہ اس کا باغی اور افراط و تفریط سے دور صحیح اسلامی عقائد و تعلیمات کے اثرات سے معمور تھا، اور زمانہ بھی ایسا ملا جب ملک میں آزادی کی تحریک اور سیاسی شورش کے اثر سے مغرب کا جادو ٹوٹ رہا تھا، ایسے مشفق مربی کی تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا جس نے قدیم و جدید دونوں تعلیم حاصل کی تھی، دونوں کا عطر کشید کر لیا تھا، دونوں کے اچھے اور مفید حصوں کو اخذ کر کے چھلکوں اور غیر مفید اجزاء کو چھوڑ دیا تھا، اور مغربی تہذیب اور اس تہذیب کے نمائندوں پر منصف و معتدل ناقدوں میں سے تھے[۱]، پھر ایسے اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا جو علمی مہارت کے ساتھ ذہنی و فکری آزادی، اخلاقی جرأت اور نقد و نظر کی صلاحیت و ہمت سے بھی بہرہ ور تھے، اس ماحول اور اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایسی تحریروں کو طبیعت قبول کرنے پر

---

[۱] راقم کے برادر بزرگ حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی سابق ناظم ندوۃ العلماء۔

آمادہ نہیں ہوتی تھی جن میں کمزوری، شرمندگی یا شکست خوردگی کے اثرات ہوں، جو صرف دفاع پر مبنی ہوں اور جن میں جرأت و ہمت پر سکون و سلامتی کو اور فتح وظفر کے مقابلہ میں اپنی جان کی خیر منانے کو ترجیح دی گئی ہو، اس شکست خوردہ ادب کا کوئی نمونہ سامنے آتا تو ذوق اس کو قبول نہیں کرتا، اور طبیعت گھٹی ہو جاتی، ذہن عالی ہمتی، بلند نگاہی، عزت نفس اور اپنے ایمان وعقیدہ پر اعتماد و اعتزاز کی طرف مائل تھا، ان قوموں سے نفرت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، جنھوں نے اسلام پر حملے کیے اور نوع انسانی کو شکوک و شبہات، خواہشات نفسانی، مادہ اور طاقت کی پرستش کے گڑھے میں ڈھکیل دیا، جنھوں نے مکر و فریب کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ ذہن ان قوموں کی عظمت، ان کی طرف سے مدافعت، یا ان کے سایہ میں پناہ لینے کو کسی طرح قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا، خواہ ایسی تحریریں کتنے ہی بڑے اہلِ قلم کی طرف سے کیوں نہ آئیں۔

پہلی شخصیت جس کے ادب سے راقم کے ذہن و ضمیر کو اطمینان و آسودگی ملی جس سے اعتماد و اعتزاز، عالی ہمتی، بلند نظری اور وفورِ جذبات کی نئی خوراک ملتی تھی اور جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ رگوں میں خون کی رفتار تیز ہوگئی، بدن میں جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں، شعور وافکار میں حرکت پیدا ہوگئی اور امیدوں، آرزوؤں کو نئی زندگی مل گئی، وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کا ادب تھا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی ابدیت اور ہر دور میں اس پیغام کے حاملین میں قیادت کی صلاحیت پر ایمان رکھتے تھے، انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی عظمت و قوت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کے بڑے بڑے نمائندوں اور رہنماؤں کو چیلنج کیا۔

معاصرین کی کتابوں اور تحریروں کا مطالعہ جاری رہا اور ایک نومسلم اور ایک خاندانی مسلمان کی تحریروں میں یہی خود اعتمادی اور پختہ علمی رنگ نظر آیا۔ محمد اسد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اول الذکر کی انگریزی کتاب Islam at the cross road کا مطالعہ کیا، اور ثانی الذکر کے مقالات ترجمان القرآن میں پڑھتا رہا جن میں مغربی تہذیب اور اس کی بنیادوں پر تنقید ہوا کرتی تھی، بعد میں یہ مقالات "تنقیحات" کے نام سے ایک کتاب میں جمع کیے گئے، یہ دونوں حضرات مغربی تہذیب کو ایک ایسے علمی مسئلہ کی طرح لیتے تھے جس میں بحث و نظر کی بڑی گنجائش ہے۔ علمی، سماجی اور تمدنی مسائل پر اور مذاہب تہذیبوں اور فلسفوں کے تقابلی مطالعہ پر یقین و اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔

مجھے مصر اور دوسرے عرب ممالک کے اہلِ قلم میں بھی اسی طاقتور عنصر اور اسی بلند نگاہی کی تلاش رہتی تھی اور مصری ادبا و مصنفین میں صرف عقاد کی تحریروں میں اس کی جھلکیاں نظر آتی تھیں، جن میں وہ آزاد رو محقق اور بالغ نظر ناقد نظر آتے تھے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ عرب اہلِ قلم کے اسلوب تحریر اور طرز تفکیر میں سید جمال الدین افغانی کے اسکول نے بہت اثر ڈالا ہے، یہ جب میدان سیاست میں آتے تو استعماری طاقتوں پر جرأت و ہمت کے ساتھ تنقید کرتے، ان پر سخت حملے کرتے، نہ سزاؤں اور دھمکیوں سے ڈرتے نہ قید و بند اور جلا وطنی کو خاطر میں لاتے، لیکن وہی لوگ جب مغربی تہذیب کو موضوع بناتے، یا سیاسی نظام، اقتصادی فلسفوں اور عمرانی علوم پر لکھنے بیٹھتے تو ان کے قلم جیسے تھک جاتے، زبان لڑکھڑانے لگتی، اسلوب کمزور پڑجاتا اور ان کی تحریروں سے یہ جھلکنے لگتا کہ مغرب ہی ہر چیز میں مثالی نمونہ ہے اور ترقی کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ کسی طرح ان کے مقام تک پہنچا جائے اور انھیں کی نقل کی جائے۔ عربی زبان کے مشہور ترین اہلِ قلم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافة فی مصر" اسی طرز تفکیر کی بلند ترین چوٹی پر نظر آتی ہے اس زمانہ میں جو کچھ بھی پڑھنے کو ملتا تھا وہ شعر و ادب ہو یا علمی و تحقیقی بحثیں یا تاریخی مطالعے اور جائزے ایسا لگتا جیسے سب ایک ہی دھن پر نغمہ سرا ہیں۔

مکہ مکرمہ میں جب مجھے یہ کتاب "العدالة الاجتماعية فی الاسلام" تحفہ میں ملی، تو یہ (خاص طور سے جدید عربی کتب خانہ میں) میرے لیے ایک غیر متوقع چیز تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری کوئی عزیز اور کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی، یا میں نے کوئی نیا انکشاف کیا۔ اس کتاب کا مصنف اس معذرت خواہانہ اسلوب سے آزاد تھا جسے ایک مدت سے مسلمان اہلِ قلم نے اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ اس نے دفاع کے بجائے حملہ کا انداز اختیار کیا تھا۔ اور مغربی افکار کے بارہ میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ان آزاد ناقدین کی سطح سے گفتگو کی تھی، جن پر کسی سماج، ثقافت، سیاست یا مصلحت کا دباؤ نہ ہو، جن کی بحث و تحقیق کی غرض و غایت صرف حقیقت کی تلاش ہو اور جنھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو کتابوں میں نہ پڑھا ہو بلکہ اس میں زندگی گزار کر اور اس کو برت کر دیکھا ہو، نصرانیت کا اور یونانی و رومی تمدنوں کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا ہو۔ جدید اقتصادی اور اجتماعی فلسفوں اور نظریات کو جانچا اور پرکھا ہو اور مغربی تہذیب اور اس کے طویل تجربات کی تحلیل اور تجزیہ کر سکتا ہو۔

اس کتاب میں میرے لیے سب سے زیادہ مؤثر اور جاذب قلب و نظر چیز تھی، مصنف کا اپنے دین کی صلاحیت اس کی برتری اور اس کی ابدیت پر ایمان، اور یہ کہ یہی ایک ایسا پیغام ہے جس میں نوع انسانی کی سعادت و کامرانی کی ضمانت ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی ملیں، جن میں مصنف سے میں اتفاق نہیں کر سکا۔ اور دل میں خیال آیا کہ کاش کتاب ان معمولی مآخذ سے خالی ہوتی، یا فاضل مصنف نے ان باتوں کی تلاش و تحقیق پر مزید توجہ دی ہوتی، اور ان برگزیدہ شخصیتوں کے بارے میں احتیاط کے ساتھ قلم اٹھایا ہوتا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی صحبت کا شرف عطا کیا تھا[1]، اور غلطیوں سے پاک ذات صرف اللہ کی ہے[2]

بعد میں اللہ تعالیٰ نے مصنف کتاب سے شخصی تعارف، ان کے ساتھ بار بار اور دیر دیر تک بیٹھنے اور آزادانہ تبادلۂ خیالات کا موقع بھی عنایت فرمایا، ۱۹۵۱ء کے ابتدائی دنوں میں راقم سطور نے قاہرہ کا سفر کیا، تو ان سے ملاقات کا مصمم ارادہ تھا ہی، لیکن پہل انھیں کی طرف سے ہوئی کہ انھوں نے ہمارے مشترک دوست اور قاہرہ میں "مطابع عربیہ" کے مالک الحاج حلمی میناوی (مومن صالح جنھیں اپنے ایمان و عقیدہ کی وجہ سے وطن چھوڑنا پڑا، خطرات میں زندگی گزاری، اور وطن سے باہر ہی وفات ہوئی، اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے) سے مطالبہ کیا کہ حلوان میں ان کے مکان میں ہم لوگ اکٹھا ہوں۔ چنانچہ جمعہ ۱۷/۵/۱۳۷۰ھ ــ ۲۳/۲/۱۹۵۱ء کو ہماری ملاقات ہوئی جسے بھلایا نہیں جا سکتا، وہ بڑے خلوص سے اور بہت کھل کر ملے، وہ میری کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پڑھ چکے تھے جو ان کے ذوق و رجحان سے ہم آہنگ تھی، اس میں باتوں کو پیش

---

[1] سید قطب نے خود بھی اس بات کو محسوس کیا، چنانچہ سیدنا عثمانؓ کے بارہ میں کتاب کے پہلے اڈیشن میں جو عبارت تھی، بعد کے اڈیشنوں میں بدل دی گئی۔

[2] یہاں ناقدانہ نظر سے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سید قطب مرحوم نے بعض قرآنی اصطلاحوں کی جو تعبیر و تشریح کی ہے اور ان کا جو مرکزی نقطہ اصل روح اور مرکزی خیال قرار دے کر اس پر زور دیا ہے، اس سے راقم کو پورا اتفاق نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے راقم سطور کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ملاحظہ ہو، لیکن یہ اختلاف و تنقید علمی و فکری حدود میں ہے، اور شہید مرحوم کے پورے احترام و اعتراف کے ساتھ ہے۔

کرنے کا انداز و اسلوب بھی ان کے اپنے اسلوب سے ملتا ہوا تھا، اس کتاب میں اسلام کو عالمی اور ابدی پیغام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ باقی رہے اور پروان چڑھے، رہنمائی اور قیادت کرے، دنیا میں صرف اسی پیغام کو رہنمائی اور قیادت کا منصب و مقام حاصل ہے، اور اس پیغام کے حاملین کے لیے عزت و سربلندی لکھ دی گئی ہے۔ رہے دوسرے ادیان و مذاہب تو ان کا ستارہ غروب ہو گیا، ان کا وقت ختم ہو چکا، ان ادیان کی اساس پر جو تہذیبیں قائم ہوئیں، ان کے چراغوں کا تیل ختم ہو گیا، اور ان کا فتیلہ تک جل چکا۔ جذبات و خیالات اور ایمان وعقیدہ کی ہم آہنگی کا فطری تقاضا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے، اور اپنا دل کھول کر رکھ دیتے،

اس مجلس میں سید قطب زیادہ تر اپنی زندگی، اپنے تجربات اور زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے بارہ میں باتیں کرتے رہے کہ کون سے اسباب و عوامل تھے جنھوں نے زندگی کو ایک نیا رخ دیا، اور ان کو صف اول کا اسلامی ادیب و انشاء پرداز، مشہور و موثر داعی، نئی نسل کا مربی اور ایک مستقل موثر، دلکش اور ثمر بار ادبی و فکری اسکول بنا دیا، جو ان کی شہادت کے بعد بھی پھل دے رہا ہے، یہ گفتگو سید قطب کی شخصیت اور ان کے افکار کو سمجھنے کے لیے علمی و تاریخی اہمیت کی حامل تھی، جس سے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں پر لکھنے والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں[1]

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، کبھی مختلف اسلامی پروگراموں اور جمعیۃ شبان المسلمین کے جلسوں میں ہم ساتھ شریک ہوئے، اور حلوان میں ان کے گھر پر بھی ملاقاتیں اور مجلسیں رہیں، خیالات کی ہم آہنگی، باہمی اعتماد و خلوص نے مجھے آمادہ کیا کہ میں ان سے اپنی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پر مقدمہ لکھنے کے لیے کہوں، وہ اس کتاب سے متاثر تھے، ہر جمعہ کو ان کے گھر پر یونیورسٹی کے فضلاء، ادباء، مفکرین اور تعلیم یافتہ نوجوان جمع ہوتے تھے، اور اس علمی مجلس میں میری کتاب بحث و مباحثہ کا موضوع بن چکی تھی، اس مباحثہ میں میں بھی شریک تھا، اور اس کتاب کے ساتھ سید قطب کے اہتمام کو بھی دیکھ چکا تھا، اسی طرح اس کتاب کے بہت سے پڑھنے والوں

---

[1] یہ گفتگو راقم کے سفرنامہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۸۸ تا ص ۹۰۔ سید قطب کے مزید حالات اسی کتاب کے صفحات ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۸۵، ۱۸۶ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

کے ساتھ میرا بھی احساس تھا کہ اس پر موجود ڈاکٹر احمد امین کے مقدمہ نے کتاب کی قیمت کو کم کر دیا ہے کیونکہ وہ مقدمہ جوش اور جذبہ کے ساتھ نہیں لکھا گیا تھا، بلکہ صرف ذمہ داری ادا کی گئی تھی یا فرمائش پوری کی گئی تھی، اور صاحب مقدمہ اس کتاب کی بنیادی فکر سے متفق نہیں تھے یا کم از کم اس کے پُرجوش حامی نہیں تھے، اور اردن کے سابق حکمراں شاہ عبداللہ بن حسین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "اس مقدمہ نے کتاب کو نقصان پہنچایا ہے"۔ اور اس میں ڈاکٹر احمد امین کا کوئی قصور نہیں کیونکہ تفکیر و تحریر میں ان کا ایک خاص انداز تھا، اور ہر ادیب و محقق کے لیے نہ ضروری ہے اور نہ ممکن کہ جس کتاب پر بھی مقدمہ لکھے، اس سے لطف اندوز بھی ہو اور پُرجوش بھی۔ بہر حال نئے مقدمہ کا خیال میرے ذہن پر چھا گیا اور اس کو دبا نہیں سکا، اور یہ بہتر بھی ہوا، سید قطب نے اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا اور جو دوسرے اڈیشن سے مستقل کتاب کی زینت ہے، ایک مستقل قیمتی مقالہ ہے، اس میں انھوں نے تاریخ کے بارہ میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے، نیز یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ کس طرح لکھنی چاہیے، کتاب جس مقصد کی طرف دعوت دے رہی ہے انھوں نے اس مقصد کے ساتھ اخلاص اور جذباتی تعلق کے ساتھ اور بڑی طاقت اور جوش کے ساتھ لکھا ہے جو سید قطب کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔

سید قطب نے مؤلف کتاب کے ساتھ اسی لطف و کرم پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انبیائے کرام کے قصوں پر مشتمل مسلمان بچوں کے لیے مؤلف ہی کی دوسری کتاب "قصص النبیین للاطفال" کے تیسرے حصہ پر بھی از راہِ کرم مقدمہ لکھا اور اس میں انھوں نے مؤلف کے لیے ایسا اعتراف کیا جس کی توقع ایک بلند نظر، وسیع الظرف اور وسیع القلب مومن صادق ہی سے ہو سکتی ہے، انھوں نے لکھا:

> "میں نے بچوں کے لیے لکھی گئی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قصے بھی پڑھے ہیں، قرآن مجید میں مذکور قصوں پر مشتمل سلسلۂ کتب "القصص الدینی للأطفال" کی تالیف میں خود بھی شریک رہا ہوں، لیکن میں بغیر کسی رو رعایت کے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ زیر نظر قصہ میں سید ابوالحسن کا کام زیادہ جامع اور مکمل ہے، اس میں بڑے لطیف اشارے، کہانی اور سلسلۂ واقعات کے مقاصد کی وضاحتیں اور کہانی کے بیچ بیچ میں ضروری تفصیلات اور بڑے اہم ایمانی حقائق کی طرف بلیغ اشارے

ہیں جو بچوں اور بڑوں کے دلوں میں جاگزیں ہوجاتے ہیں۔"

اس وقت اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سید قطب ادیب و انشاء پرداز یا محقق و مفکر کے حدود سے آگے بڑھ کر عملی جدوجہد کے میدان میں بھی داخل ہوں گے، مجاہدین و مومنین کی جماعت کی قیادت کریں گے، اور ظلم، سفاکی اور وحشت و بربریت کے مقابلہ میں دنیا کے سامنے ہمت و شجاعت اور عزم و ثبات کا نادر نمونہ پیش کریں گے، جس سے رونگٹے کھڑے ہوجائیں اور روح لرز اٹھے، اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی اور ان کی جدوجہد تصنیف و تالیف اور اسلامی نظریات کی ترتیب و تشریح تک موجود رہے گی، باقی ذمہ داریاں مسلمانوں کی اگلی نسل کے ہم جو نوجوانوں کے لیے چھوڑ دیں گے جیسا کہ بہت سے قدیم اور معاصر داعیوں نے کیا۔ ان کے ساتھ پہلی ملاقات میں ان کی صحت اور ان کے اسلوب کے درمیان بڑا فرق نظر آیا تھا کہ کمزور صحت، نحیف و نزار جسم لیکن بڑا طاقتور، چیلنج کرنے والا اور پُرجوش اسلوب کہ انسان اس کی گرمی اور شدت محسوس کیے بغیر نہ رہے، دہکتا ہوا قلم جس سے چنگاریاں نکلتی تھیں، جیسے قلم نہیں آگ کا انگارہ ہے، جسمانی صحت اور اسلوب نگارش کے اس فرق نے مجھ پر اثر ڈالا تھا، اور میں نے اپنے تأثرات اپنے سفرنامے میں لکھ بھی دیے تھے[۱]

غالباً وہ خود بھی حالات و حادثات میں پوشیدہ محرک قوت سے واقف نہیں تھے جو صاحب واقعہ کے لیے بھی اتنے ہی غیر متوقع اور حیرت انگیز ہوتے ہیں جس قدر دوسروں کے لیے۔ ان کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مستقبل کے لیے ضمیر غیب نے کیا کچھ چھپا رکھا ہے، وہ اپنے کو دعوتِ اسلامی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل سمجھتے بھی نہیں تھے، اس سلسلہ میں میرے سفرنامے میں بعض قابلِ توجہ حقیقتیں آگئی ہیں، جن پر ایک بار پھر نظر ڈالنی چاہیے، اس سے اس عظیم اسلامی ادیب کے ایمان، ان کی تواضع و کسر نفسی، اور ان کی نظر میں قیادت کے "تقدس" اور گراں بار ذمہ داریوں کے احساس و شعور کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں میں اس سفرنامہ کا اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں جو ایک اہم اور قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے:

---

[۱] ملاحظہ ہو، مذکرات سائح فی الشرق العربی، ص ۸۹ - ۹۰۔

"..... اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ پہلا شخص جو اس کام کی نگرانی کرے کون ہو؟ بعض اہلِ مجلس نے سید قطب کی طرف اشارہ کیا، ان کی تعریف کی اور ان سے کہا کہ جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں، وہ خلوص قلب، پختہ عقیدہ، اور اچھے اخلاق کی آئینہ دار ہیں، اس پر سید قطب بول اٹھے اور بہت کھل کر نہایت بے تکلفی کے ساتھ فرمایا کہ میں اپنے کو اس تعریف و توقع کا اہل نہیں سمجھتا، کتابوں کا شائع ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ مصنف نے اسلامی تربیت و اصلاح نفس کی پہلی منزل طے کر لی ہے، میں اپنے ماحول میں شرّ و فساد کی ہونے والی جنگ اور راحت و آسائش اور بے فکری سے واقف ہوں، اور ایمان و جہاد جس ایثار و قربانی اور زہد و روحانیت کے طالب ہیں، اس کے فرق کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ آخری منزل ابھی دور ہے، اصل معیار وہ ہے جو قرآن نے مقرر کیا ہے، قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ، الآیۃ

اگر میں اپنے اس مکان اور جھونپڑے، ملازمت و بیکاری، فقر و مالداری کے اسباب کو برابر نہیں سمجھتا تو میں حقیقت ایمان اور اسلامی تربیت سے دور ہوں، میں خود کو اور غیروں کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔"[1]

لیکن یہی سید قطب جب گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، جیل میں ڈالے گئے اور اذیتیں پہنچائی گئیں، یہاں تک کہ ۱۳۸۹ھ ـ ۱۹۶۶ء میں اللہ نے انھیں شہادت سے سرفراز فرمایا، تو انھوں نے ایسی شجاعت و استقامت کا مظاہرہ کیا کہ لوگ حیران رہ گئے، انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ جو نظریہ پیش کیا تھا، دوسروں سے پہلے وہ خود اس پر یقین و ایمان رکھتے تھے اور اپنی پاکیزہ روح اور اپنے خون کے آخری قطرہ سے اس کی قیمت ادا کی، انھوں نے اپنی جان پہلے ہی سے بیچ رکھی تھی، ان کے اور خدا کے درمیان معاملہ طے ہو چکا تھا،

---

[1] مذکرات سائح ص ۱۸۵،

دستاویز لکھی جا چکی تھی، گواہوں کی گواہیاں بھی ثبت ہو چکی تھیں۔ ان کے شیدائیوں، ان کے ادب کے قدردانوں کو، اور ان کی تحریروں اور افکار و نظریات میں زندگی گزارنے والوں کو اس کی اطلاع بہت بعد میں ہوئی، اس طرح وہ معرکہ ختم ہوا جس سے ان کا دل گھبرا رہا تھا، اس معرکہ میں شک کے مقابلہ میں یقین کو، تردّد و بے ایمانی کے مقابلہ میں سکون و اطمینان کو، اور ارادہ کی کمزوری کے مقابلہ میں عزمِ مصمّم کو کامیابی حاصل ہوئی، گرفتاری، اذیتیں اور شہادت وغیرہ اس معرکہ کا حتمی نتیجہ اور سچی تصویر تھی، جس میں وہ جیل کی کوٹھری اور پھانسی کے تختہ سے پہلے اپنے ذہن و دماغ اور اپنے دل کی گہرائیوں میں برسرِ پیکار تھے۔

مجھے یقین ہے کہ سید قطب کے آثار زندہ رہیں گے، ان کی طرف لوگوں کی توجہ، ان کی کتابوں کے ساتھ لوگوں کے شغف، ان کے علمی و فکری ورثہ کو زندہ رکھنے کی خواہش اور ان کے نام اور کارناموں کو زندۂ جاوید بنانے کی کوششوں میں اضافہ ہوگا، اور میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کے لیے جس "حیات" کی خوش خبری دی ہے، اس میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں، قرآن کی آیت "بل احیاء عند ربھم" میں لفظ "احیاء" کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے جتنا عام مفسرین نے سمجھا اور لکھا ہے۔ میرے خیال میں شہید کے چھوڑے ہوئے آثار کی بقا اور ان کی شہرت و اشاعت، اس کے نام اور کارناموں سے لوگوں کا شغف، اس کے تذکرے اور حالات میں لوگوں کی دلچسپی، معاصرین کا اعتراف اور آئندہ آنے والوں میں ذکرِ خیر بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے، یہ لوگ موت کو گلے لگاتے ہیں اور اللہ زندگی ان کے لیے مقدر کر دیتا ہے، مخالفین اور اعداء ان کا نام و نشان مٹانا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی عزت و شہرت میں اضافہ کا فیصلہ کرتا ہے، اور فیصلہ اللہ ہی کا نافذ ہوتا ہے، وہ علیم بھی ہے، قدیر بھی۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

کتابیں اپنے آبا کی

تاریخ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس ظلم کو کبھی معاف نہیں کرسکتی کہ انھوں نے تقسیم سے متعلق ریڈکلف ایوارڈ کو چھپائے رکھا حالاں کہ وہ ۱۵ اگست ۴۷ء کو اشاعت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور اس کو آزادی کے بعد شایع کیا۔ اس ایک ہفتہ میں خون کی ندیاں بہ گئیں اور پناہ گزینوں کے اتنے بڑے قافلے روانہ ہوئے کہ آسمان نے آج تک یہ نظارہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ قافلے کیا۔ پورے پورے ملک کی آبادیاں تھیں۔ پھر تقسیم کی یہ لکیر بھی اس خوبی سے کھینچی گئی کہ تمام قادیانی پاکستان میں ہیں اور قادیان جو ان کا سب سے اہم مرکز ہے، ہندوستان میں ہے۔ اسی طرح تمام سکھ ہندوستان میں ہیں اور ننکانہ صاحب جو ان کا سب سے مقدس مقام ہے، پاکستان میں واقع ہے! دہلی اور یوپی، اردو کے سب سے بڑے مرکز رہے ہیں، اُس کے سارے اسالیب یہیں وجود میں آئے ہیں اور ان ہی دو جگہ اُس کے بیش قیمت کتب خانے واقع ہیں، لیکن دہلی اور یوپی میں باوجود بہت سے وعدوں کے اِس شیریں اور خزینہ دار زبان کو "دو گز زمین" بھی نہیں مل سکی۔

اِس تقسیم کا اثر ہماری تہذیبی تاریخ اور اردو زبان وادب پر کیا ہوا ہے، یہ کہانی ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ بٹوارہ کی داستان کو سمندر پار کے ایک فرانسیسی مصنف نے "نیم شب کی آزادی" کے نام سے مرتب کیا ہے یا بیگم انیس قدوائی مرحومہ نے شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں کے حالات اور واقعات کو بڑی جرأت کے ساتھ یک جا کر دیا ہے لیکن حقیقتاً اس موضوع پر ابھی تک بڑے علمی پیمانہ پر ریسرچ نہیں ہوئی اور نہ ان نقصانات کا صحیح اندازہ لگایا گیا ہے جو کتب خانوں کے ضایع ہونے سے مرتب ہوئے۔

مسلمانوں میں، چینیوں اور یونانیوں کی طرح، تاریخ کا ذوق خلقی ہے وہ دنیا کو سراب نہیں سمجھتے اِسی لیے تاریخی آثار کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لیے ہندوستان کے ترکی عہد میں

بہت سا تاریخی سرمایہ جمع ہوگیا۔ منہاج سراج، حسن نظامی، فخر مدبر، ضیاء الدین برنی، عفیف اور حضرت امیر خسروؒ کے ذریعہ اتنی تاریخی معلومات جمع ہوگئی ہے کہ ان سے اجتماعی شعور و لاشعور کی کہانی مرتب ہوسکتی ہے۔ جو کتابیں موجود ہیں وہ اہم ہیں لیکن جو موجود نہیں ان کے ضایع ہونے سے کیا کیا نقصانات واقع ہوئے اُس کا اندازہ مشکل ہے۔

عصر حاضر کے انسان کو اِس کا بڑا گھمنڈ ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ مہذب ہوگیا ہے۔ وہ چشم زدن میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرسکتا ہے۔ اس کے جہاز آواز سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ اس کی طبعی عمر بڑھ کر ۵۸ برس تک پہنچ گئی ہے لیکن اس نے وحشت اور درندگی کے بھی تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں، کتب خانوں کی تباہی اور قدروں کی شکست کا مظاہرہ جیسا اِس زمانہ میں ہوا ہے، اس کی نظیر بھی مشکل سے ملے گی۔

رومیوں اور تاتاریوں نے کتب خانوں کو جو نقصان پہنچایا ہے اس سے تاریخ کے طالب علم ناواقف نہیں ہیں۔ چین کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے ایشیا میں علم کی شمع روشن کی لیکن اس کے شہنشاہ تسن شی ہوانگ تی Tsin Shi Hwang-ti نے کتابوں کے جلانے کا عام حکم صادر کردیا تھا چنانچہ ۲۱۳ قبل مسیح میں اتنی کتابیں جلادی گئیں جو حد اور شمار سے باہر ہیں۔ یہ صرف اسلام ہے جس کی ابتدا ہی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے ہوئی اور جس کی میزانِ قدر میں علم کا درجہ سب سے بلند ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں رومی قسطنطنیہ میں سب سے بڑی آفت کتابوں ہی پر آئی اور تین لاکھ سے زیادہ کتابیں جل کر راکھ ہوگئیں۔ عہد وسطیٰ میں استیصالِ ملاحدہ کی مسیحی عدالت Inquisition نے جو ظلم کتابوں پر اور منکرینِ کلیسا پر ڈھائے ہیں ان کی خوں چکاں داستان پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اِن کتابوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہماری تاریخ کتنی ناقص اور کتنی اُدھوری ہے!

ایک مرتبہ عثمانی سلطان کے ایک محل میں آگ لگ گئی۔ اس کے پاس بے مثل کتابوں کے ذخیرے بھی تھے۔ اِس بھگدڑ میں لوگ بیش قیمت سامان لے کر بھاگے جارہے تھے۔ ایک فرانسیسی نے دیکھا کہ ایک ترک Titus Livius کی ضخیم تاریخ روم

بیچے جا رہا ہے جو قطعی ناپید تھی۔ اس نے اس کو بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا اور جو رقم موجود تھی، وہ دینے کے بعد باقی رقم اگلے دن پر اُدھار رکھی لیکن چند لمحوں کے بعد آدمیوں کا اتنا زبردست ریلا آیا کہ وہ کتاب اور اُس کا ترک مالک دونوں غائب ہو گئے۔ اب وہ کتاب مفقود ہے۔

ہمارے ناظرین اٹلی کے شہر ٹورن Turin سے واقف ہوں گے جہاں چند سال ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کفن دریافت ہوا تھا جس کی بڑی دھوم تھی اور ایک نیا علم "کفنیات" Shroudology وجود میں آ گیا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کفنِ حضرت مسیحؑ کی بات محض افسانہ تھی اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اسی ٹورن Turin شہر میں ایک عجائب خانہ ہے۔ اس کے گودام میں ایک بکس ملا جو Papyri کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی نے پوچھا اس میں کیا ہے۔ خدمت گار نے جواب دیا: کچھ نہیں۔ اس میں بیکار پیپرس Papyri کے ٹکڑے ہیں۔ لیکن بعد میں مصریات کے ماہروں نے بتلایا کہ ان بیکار ٹکڑوں میں فراعنۂ مصر کے نام اور ان کی مدتِ سلطنت کی تفصیل درج تھی۔

کچھ عرصہ ہوا بحیرۂ مردہ سے پلٹے ہوئے کاغذ برآمد ہوئے جنھوں نے انجیل کے قدیم متن میں جو دوسری صدی قبلِ مسیح سے متعلق ہے اور دسویں صدی عیسوی کے متن میں ایک حد تک مطابقت پیدا کر دی ہے جو عیسائیوں کے نقطۂ نظر سے بےحد اہم ہے۔ اِن اوراقِ پیپرس کے ڈھونڈھنے کا سہرا ایک بدوی کے سر ہے جو اپنی بکریوں کے گلّے کو لیے لیے اُس غار تک پہنچ گیا جہاں یہ اوراق بڑے بڑے مرتبانوں میں رکھے ہوئے تھے اور جن کی بدولت عہدِ قدیم کی تاریخ میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

۱۵۴۹ء کا یہ واقعہ بھی عجیب و غریب ہے کہ ایک پادری Diego de Landa کو، میکسی کو میں، ایک بڑی لائبریری ملی لیکن اُس نے اِس ذخیرہ کو یہ کہہ کر آگ لگا دی کہ اِس میں شیطانی خیالات اور توہمات کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

صنمیات اور عوامی گیتوں میں بھی تاریخ کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ یہی صورت انجیل کی بھی ہے جو فہمِ تاریخ میں اہمیت سے خالی نہیں۔ میسوپٹامیہ کا شہر اُر جس کو حضرت ابراہیم

علیہ السلام سے نسبت ہے، تاریخِ قدیم کا گنجینہ ہے۔ اب سے سو برس قبل مورخین ہومر کی ایلیڈ اور آڈیسی کو صرف قصہ کہانی کی چیز سمجھتے تھے اور اسے تاریخ کا درجہ دینے کے لیے آمادہ نہیں تھے، لیکن اب جرمن ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کوشش اور ہومر کے عمیق مطالعہ کی بدولت شہر ٹرائے Troy کی نشان دہی ہو گئی ہے جو تاریخی تحقیق کا بڑا کارنامہ ہے۔

۲۲ مئی ۱۹۸۹ء کے اسٹیٹمینس نئی دہلی سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونِ ثانی Rameses II کا وہ محل بھی دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اِس مغرور بادشاہ کو خدائے واحد کے سامنے جھکنے کی تلقین کی تھی اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے یہودی بالآخر مجبور ہو کر مصر سے نکل آئے تھے۔ عصرِ حاضر کے مشہور مورخ احمد عثمان المصری کا خیال ہے کہ یہ محل تین ہزار سال سے ریت اور مٹی کے نیچے دبا ہوا تھا اور یہیں فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کرتا ہوا بحرۂ قلزم میں ڈوب گیا تھا۔

وسطی ایشیا کی تاریخ بڑی عجیب وغریب ہے۔ اس علاقہ میں ریت کی آندھیاں مسلسل آتی ہیں اور ان ہی کی وجہ سے بہت سی سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں یا زلزلوں کی نذر ہو گئیں۔ میں نے تاشقند، سمرقند اور بخارا میں دیکھا ہے کہ پانی کی موٹر گاڑیاں صبح سے شام تک برابر چھڑکاؤ کرتی رہتی ہیں تاکہ گرد دبی رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ومغفور نے مجھ سے بارہا اصرار کیا کہ تم خود گزشت، عصری تاریخ یا تذکرہ کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے عرض کیا اگر میں نے شروع بھی کر دیا تو بپایاں کہ رساند؟ دوسرے اِس مہمل چیز کو کون چھاپے گا؟ جھلّا کر کہنے لگے: "آپ پانچ چھ گز زمین کھود کر دفن کر دیجیے گا، لیکن لکھیے تو"۔ اس کے بعد امیر خسرو کا یہ شعر پڑھنے لگے:

اے گُل، چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند

آں روے ہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

جو چیزیں زیرِ زمیں جا چکی ہیں، ان میں سے کچھ ضرور جلوہ گر ہوں گی۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اس گفتگو سے میرا مطلب یہ ہے کہ تاریخ نویسی کے لیے کاغذ کا ہر پُرزہ، اینٹ کا ہر ٹکڑا، علم الاصنام کی ہر کہانی، عوامی گیت کا ہر بول، محاورہ اور ضرب المثل کا ہر لفظ اور مقدس کتابوں کا ہر ہر فقرہ اہمیت رکھتا ہے۔

اس نامکمل ذخیرہ سے بھی تاریخ اور علوم عقلی کے بہت سے رموز آشکارا ہو گئے ہیں۔ سائنس عہدِ قدیم میں پیدا ہوئی۔ وسطی دور میں گرد اور دھول میں ایسی اَٹ گئی کہ نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی۔ عربوں نے اس کو ازسرِ نو دریافت کیا، دورِ نہضت میں اس کا پھر احیا ہوا اور دورِ جدید میں اُس نے ترقی کی، نئی منزلیں طے کیں اور یہ سب بہت سی کتابوں کے لٹ جانے اور تباہ ہونے کے باوجود ہوا۔

علمی تحقیق میں تسلسل نہایت اہم ہے۔ اپالو نمبر ۸ جو چاند تک پہنچ سکا، کسی ایک شخص کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یوکلڈ (Euclid) آرکے میڈیز[1] (Archimedes)، نیوٹن، کپلر (Kepler) کوپرنی کس (Copernicus)، ان سب سائنس دانوں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہے جو صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے، اور جس کا ہمیں تھوڑا سا عرفان، اُن کتابوں سے ہو سکتا ہے جو دست بردِ زمانہ سے بچ گئی ہیں۔

---

[1] یہاں اس لطیفہ کا ذکر شاید بے محل نہ ہوگا کہ میری والدہ مرحومہ نے خاندانی روایات کے برخلاف مجھ سے اصرار کیا کہ جب تک تمہارے ابا میاں کی جائداد کا داخل خارج ہو اور یونی ورسٹی کی تعلیم دوبارہ شروع ہو، تم ملازمت کرلو۔ ایک بزرگ نے مجھے ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی سے ملا دیا۔ انھوں نے کہا میرے پاس یونی ورسٹی اسکول میں سائنس کی ایک جگہ ہے۔ میں نے عرض کیا میں نے کبھی سائنس نہیں پڑھی۔ فرمایا کون سا کام ہے جو آدمی کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔ محنت سے تو پہاڑ بھی ہل جاتے ہیں۔ چنانچہ میرا تقرر ۴۵ روپیہ ماہوار پر آرکے میڈیز Archimedes کے تجربہ اور اصول وغیرہ کے پڑھانے پر ہوگیا۔ بقول غالبؔ: "میں یوسف بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں"۔

(خ ا ف)

عرضداشت
بحضور خیر الانام

سن ۹ ہجری میں قبیلۂ بنی نہد کا ایک وفد مسجد نبوی میں حاضر ہوا، وفد کے سربراہ طہفہ بن ابی زھیر النہدی نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہت ہی بلیغ اور برجستہ سپاس نامہ ان الفاظ میں پیش کیا:

"أَتَيْنَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْ غَوْرَيْ تِهَامَةَ بِأَكْوَارِ المِيسِ تَرْتَمِيْ بِنَا الْعِيْسُ، نَسْتَحْلِبُ الصَّبِيْرَ وَنَسْتَخْلِبُ الْخَبِيْرَ وَنَسْتَعْضِدُ الْبَرِيْرَ وَنَسْتَخِيْلُ الرِّهَامَ وَنَسْتَجِيْلُ الْجَهَامَ، يَبِسَ الْعُشْنُ وَسَقَطَ الْأُمْلُوْجُ وَمَاتَ الْعُسْلُوْجُ وَهَلَكَ الْهَدِيُّ وَمَاتَ الْوَدِيُّ، بَرِئْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنَ الْوَثَنِ وَالْعَنَنِ وَمَا يُحْدِثُ الزَّمَنُ۔

لَنَا دَعْوَةُ السَّلَامِ، وَشَرِيْعَةُ الْإِسْلَامِ، مَا طَمَا الْبَحْرُ وَقَامَ تِعَارُ وَلَنَا نَعَمٌ هَمَلٌ مَا تَبِضُّ بِبِلَالٍ وَوَقِيْرٌ كَثِيْرُ الرَّسَلِ قَلِيْلُ الرِّسْلِ أَصَابَتْهَا سَنَةٌ حَمْرَاءُ مُؤْزِلَةٌ لَيْسَ لَهَا عَلَلٌ وَلَا نَهَلٌ"

"یا رسول اللہ! ہم لوگ آپ کی خدمت میں وادی تہامہ کے دو نشیبی کناروں سے چل کر آئے ہیں، 'میس' کی لکڑیوں سے بنی ہوئی کاٹھیوں پر سوار ایسی اونٹنیوں سے آئے ہیں جو باوجود نڈھال ہونے کے راستے طے کرتی رہی ہیں، ہم وہ لوگ ہیں جن کا علاقہ

بیابانی اور قحط کا شکار ہے۔ آسمان کے کسی کونے پر بادل کے سفید ٹکڑے بھی دیکھ لیتے ہیں تو چند بوند پانی کا آسرا ہو جاتا ہے۔ صحرائی زمین پر اُگنے والے خاردار پودے بھی ہمارے لیے نعمت ہیں، ان کے ایک ایک پتے کو ہم نوچتے ہیں اور ببول کی خشک ٹہنیوں پر ایک دو پتے ہرے نظر آجاتے ہیں تو اس پر جھپٹتے ہیں، بے پانی کے بادل کو حسرت و امید کی نگاہ سے ٹکٹکی لگائے دیکھتے ہیں۔ ہمارا صحرا دور تک پھیلا ہوا ہے، اور اس پر ہم اس طرح چلتے ہیں کہ ہر قدم موت کی طرف آگے بڑھاتا ہے۔ ہماری سنگلاخ زمین میں چند گام بھی بڑھنے کا راستہ ہموار نہیں ہے، نشیب کوہ کا ایک چپہ بھی روئیدگی سے آشنا نہیں ہے، تپتے ہوئے چٹان پر سدا دہکتے ہوئے سورج کا سایہ رہتا ہے۔ جو پودے تھے وہ ایندھن کی لکڑی بن چکے ہیں۔ اونٹ نڈھال اور مریل ہیں جن کے کوہانوں کی چربی بھی پگھل چکی ہے، اور خود رو گھانس جُھلس چکی ہے،

یا رسول اللہ! ہم امن و سلامتی کے داعی، اور اسلام پر چلنے والے لوگ ہیں. بُت پرستی ہمارا شعار نہیں، ہم ہر طرح کے اصنام سے بیزار اور بری ہیں اور وقت کی پیدا کردہ بدعتوں سے مبرا ہیں۔ سلامتی کی دعوت اور اسلام کی شریعت پر ہم قائم ہیں، اور اس عقیدہ پر اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک سمندر میں پانی کے قطرے رہیں گے اور کوہِ 'تعار' زمین سے پیوست رہے گا۔

ہمارے مویشی آوارہ پھر رہے ہیں، ان کی کوئی رکھوالی نہیں کرتا، کیونکہ یہ بے فیض ہیں، ان سے اتنا بھی دودھ نہیں ملتا کہ تالو کی خشکی دور ہو سکے۔ یوں تو ان کے ریوڑ بڑے ہیں مگر ان کے تھن سوکھے ہوئے ہیں، سخت ترین قحط سے دوچار ہیں، ان مویشیوں کو گھونٹ دو گھونٹ پانی نہیں ملتا۔"

نُطق نبویؐ :

اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِي مَحْضِهَا وَمَخْضِهَا وَمَذْقِهَا وَفِرْقِهَا،

وَابْعَثْ رَاعِيَهَا فِي الدَّثْرِ بِيَانِعِ الثَّمَرِ وَافْجُرْ لَهُمُ الثَّمَدَ وَبَارِكْ لَهُمْ فِي الْمَالِ وَالْوَلَدِ، مَنْ اَقَامَ الصَّلَاةَ كَانَ مُسْلِمًا، وَمَنْ آتَى الزَّكَاةَ كَانَ مُحْسِنًا، وَمَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ كَانَ مُخْلِصًا وَلَكُمْ يَا بَنِي نَهْدٍ ودائع الشِّرْكِ وضائعُ الْمُلْكِ، لَا نُلْطِطِ فِي الزَّكَاةِ وَلَا نُلْحِدُ فِي الْحَيَاةِ، وَلَا نَتَثَاقَلُ عَنِ الصَّلَاةِ۔

"اے اللہ! (ان لوگوں کے مویشیوں) کے دودھ اور مٹھے دونوں میں برکت دے، ان کے شیر پر آب اور پیمانہ شیر دونوں میں برکت عطا فرما، ان کی رکھوالی کرنے والوں کو تونگر بنا دے، ان کے درختوں کو پھلوں سے بھر دے، ان کی چراگاہیں ہری بھری رہیں، ان کے مال و اولاد میں برکتیں عطا فرما، جو نماز قائم کرے گا وہ مسلمان ہے، جو زکات ادا کرے گا وہ (فرائض کو) بہتر طریقہ پر انجام دینے والا سمجھا جائے گا، اور جو لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دے گا وہ مخلص تصور کیا جائے گا۔ اے اولاد نہد! جنگ بندی کے جو معاہدے شرک کے زمانہ میں ہوئے ہیں وہ بنفسہٖ قائم رہیں گے (یا) شرک کے زمانہ میں جو تمہارے مال دوسروں کے پاس تھے ان پر تمہارا حق ہے اور وہ ملکیت جو چھین لی گئی ہے وہ تمہاری ہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ زکات میں ادائیگی میں پس و پیش نہ کریں اور زندگی میں کج روی نہ اختیار کریں اور نماز کی ادائیگی کو گراں نہ سمجھیں۔"

ارکانِ وفد کو روانگی کے وقت ایک پروانۂ رحمت عطا ہوا جو 'بنو نہد' کے نام مراسلہ کی شکل میں تھا:

"مِن محمّد رسول اللّٰہِ اِلٰى بَنِي نَهْدِ ابنِ زَيْدٍ، السَّلَامُ عَلٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

لَكُمْ يَا بَنِي نَهْدٍ فِي الْوَظِيفَةِ الْفَرِيضَةُ وَلَكُمُ الْعَارِضُ وَالْفَرِيشُ وَذُوالْعِنَانِ الرَّكُوبِ وَالْفَلُوُّ الضَّبِيسُ لَا يُمْنَعُ سَرْحُكُمْ

وَلَا یُعضَدُ طَلحُکُمْ وَلَا یُحْبَسُ دَرُّکُمْ وَلَا یُؤکَلُ اُکُلُکُم، مَالَمْ تُضمِرُوا الإمَاق وتَاْکُلُوا الرِّبَاق مَنْ اَقَرَّبِهَا فِیْ ھٰذَا الْکِتَاب فَلَه مِنْ رَسُولِ اللّٰہِ الوَفَاءُ بِالعَھْدِ وَالذِّمَّةُ وَمَنْ اَبیٰ فَعَلَیْهِ الرِّبْوَةُ۔

"یہ مکتوب محمد رسول اللہ کی طرف سے بنو نہد ابن زید کے نام ہے۔ اس پر سلامتی ہو جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اے بنو نہد! معاہدہ کے رُو سے درمیانی عمر کے جانور (اونٹ، بھیڑ، بکریاں) کمزور یا عیب دار یا نوزائیدہ جانور تمہارے ہی رہیں گے، اسی طرح دودھ دینے والی اونٹنیاں سواری کے جانور مضبوط و توانا مویشی تمہارے ہی رہیں گے اور وہ جانور بھی جو چراگاہ جا کر خود سے واپس آجاتے ہیں۔ تمہارے درخت کاٹے نہیں جائیں گے، تمہارے جانوروں کو چراگاہوں سے محروم کر کے محبوس نہیں ہونے دیا جائے گا، تمہاری غذا کوئی دوسرا نہیں کھائے گا، اگر تم نفاق اپنے دل میں چھپائے نہیں رہو گے اور جو تم پر فرض ہے اس میں ایک رسّی سے بھی بخل نہیں کرو گے، اور جو اس معاہدہ میں مذکور ہے اس کی مخالفت نہیں کرو گے تو رسول اللہ کی طرف تم سے کیے ہوئے وعدوں کے پورے کیے جانے کی ضمانت ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا وہ اپنی گردن میں پھندا لگائے گا۔"

پس منظر، خصوصیت:

تہامہ، مکہ مکرمہ کے شمالی حصہ میں واقع وادیوں کا ایک سلسلہ ہے، غزوۂ حُنین کے بعد یہ تمام علاقے اسلام کے حلقہ بگوش اور اس کے دائرہ انتظام میں آگئے تھے، ان قبائل نے اسلام قبول کیا اور لوٹ مار، غارت گری سے توبہ کی، اور پُرامن باشندوں کی طرح رہنے کا معاہدہ کیا، احکام شریعت میں ہر بات ان کے لیے قابلِ قبول تھی، البتہ راہِ خدا میں خرچ کرنے اور زکاۃ کی

ادائیگی میں ان کو تردد تھا، اس لیے اپنے فقر و افلاس کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے تھے، اور واقعہ بھی تھا کہ ان کے علاقے بنجر تھے، بارش کبھی کبھار اتفاقاً ہو جاتی، زراعت کا بُرا حال تھا، مویشی (اونٹ، بھیڑ، بکریاں) ان کی دولت تھے اور انھی پر ان کی معاش کا انحصار تھا۔ احکامِ خداوندی کی رو سے ان کو زکاۃ کی ادائیگی میں یہی جانور دینا پڑتے تھے، اس لیے وہ مریل قسم کے جانور، عیب دار، دُبلے پتلے اور نکمے مویشیوں کو صدقہ کے طور پر دینا چاہتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عرضداشت سُن کر، جس میں انھوں نے اپنے فقر و افلاس، قحط و بدحالی کا ذکر کیا تھا اور اسلام پر مضبوطی سے رہنے اور جاہلیت کے شعار سے بری ہونے کا اعلان کیا تھا۔ آپ نے ان کے حق میں دعائیں فرمائیں جو قبول ہوئیں اور ان کی حالت گنتی کے چند برسوں میں بدل گئی، فقر و افلاس کی جگہ اسلام کے صدقہ میں ان کی دولت بڑھ گئی، لیکن جس وقت انھوں نے اپنے مویشیوں کے دُبلے پتلے اور کمزور نڈھال ہونے کا ذکر کیا تھا اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اس قسم کے مریل اور کمزور جانور زکاۃ میں قبول کیے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمایا کہ دودھ دینے والے جانور، سواری کے لائق جانور، زراعت میں کام آنے والے جانور تم سے نہیں لیے جائیں گے، اور نہ بیمار و گھائل، عیب دار مریل اور ازکار رفتہ جانور قبول کیے جائیں گے، کیونکہ بیت المال میں جو دولت جس شکل میں آتی ہے وہ سب مسلمانوں کے لیے ہے۔ جہاد میں، امن قائم رکھنے میں، دوسروں کی ضروریات پورا کرنے میں ان کو خرچ کیا جاتا ہے، لہٰذا ازکار رفتہ اور نکمے جانوروں کو لے کر مسلمان کیا کریں گے؟ اس لیے آپ نے ان کو درمیانہ راستہ بتایا کہ نہ تو کمزور و لاغر جانور دو، اور نہ اچھے، کام میں آنے والے جانور دو۔

اس عرضداشت میں اور اس کے جواب سے اس وقت کی معاشی حالت کا ایک نقشہ قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ ان کی نفسیات کا ایک آئینہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ مال نکالنے سے طبعی ہچکچاہٹ ہوتی ہے، مگر عقیدہ کی پختگی آڑے آتی ہے اور دل کو مائل کرتی ہے کہ اس بات پر راضی کرے جو اسلام کا تقاضا ہے۔ ایک طرف ایمان کا تقاضہ سپردگی اور اللہ کے وعدوں پر یقین رکھنے کا ہے۔ دوسری طرف انسانی کمزوری کہ آئی ہوئی دولت کو

اپنی ملکیت سمجھتا ہے، اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر اس کے اندر تذبذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر معاہدہ (بیعت) کیا تو یہی کہا تھا:

"بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان نتبعہ منشطاً و مکرھًا۔ دوسری روایت میں ہے: علی ان نتبعہ فی المنشط والمکرہ۔"

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر بیعت کی ہے کہ ہم آپ کی اتباع ہر حال میں کریں گے، دل چاہے یا نہ چاہے، پسندیدہ بات ہو یا گراں گزرنے والی بات۔"

'مَکرَہ': وہ بات جو نفس پر گراں ہو، مثلاً اللہ کی راہ میں جہاد پر نکلنا، اپنی مرضی کے بغیر مال نکالنا، نفس جس بات پر اُبھارے اگر وہ خلافِ شریعت ہو تو اس سے باز رہنا، اس کی مشق تمام مسلمانوں سے کرائی گئی تھی اور ان کو مائل کیا گیا تھا کہ اللہ کی مرضی جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ذریعہ معلوم ہو جائے تو اس میں پس و پیش نہ کریں۔

اس عرضداشت کی خصوصیت یہ ہے کہ عربی بلاغت کا یہ اعلیٰ نمونہ ہے، وفد کے سردار طہفہؓ نے کس درجہ باریکی کے ساتھ قحط زدہ زمین اور وہاں کے رہنے والوں کی نفسیات کا حال بیان کیا ہے، ایک خشک بیابان کا تصور کیجیے جہاں پانی میسر نہیں ہے، وہاں کے رہنے والے آسمان پر بادل کا ٹکڑا دیکھتے ہیں تو کس طرح ان کا دل مچلتا ہے، بادل تو دور کی چیز ہے، آسمان پر سفید ٹکڑے جو بادل نما ہوتے ہیں اس کو دیکھ کر بھی اس کی آس بندھ جاتی ہے۔ جانوروں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ آوارہ پھر رہے ہیں، کیونکہ بے فیض ہیں، کمزور ہیں، سواری کا کام ان سے نہیں لیا جا سکتا، بکریاں اور اونٹنیاں دودھ نہیں دے سکتیں کہ ان کے تھن سوکھ گئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب (میں دو باتیں قابلِ غور ہیں، ایک تو) بلاغتِ نبوی برجستگی کا پتہ چلتا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک پیغمبر کے شایانِ شان بات کہ ہر حال میں التجار والتماس اللہ تعالیٰ سے ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ تسلی کے الفاظ اس طرح فرماتے کہ گھبراؤ نہیں حالات بدل جائیں گے۔ آپ نے بات دعا سے شروع فرمائی کہ اے اللہ! ان کے مویشیوں کے شیر خالص

اور شیر پُر آب میں برکت دے، ان بے زبان جانوروں کی رکھوالی کرنے والوں کو تونگر بنائے۔
مزید یہ کہ آپؐ کے عدل وانصاف کی تصویر سامنے آجاتی ہے، اگر آپ کو بیت المال کی فکر ہے جس پر اس وقت کے اسلامی قلمرو کے اخراجات، جہاد کی ضرورتوں، بیواؤں، یتیموں، اور لاچار افراد کی خدمت کا دارومدار ہے اس کے لیے از کار رفتہ جانور ایک بوجھ ہی بنتے، اسی کے ساتھ ان لوگوں کا بھی پورا خیال ہے کہ ان کے کام آنے والے جانور، دودھ دینے والے، سواری کے کام میں آنے والے مویشی نہ لیے جائیں۔

وفود عرب جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے ان کی زبان اسی طرح غریب الفاظ پر مشتمل ہوتی تھی۔ وہ لوگ اس طرح کے غریب الفاظ اور ایسی ترکیب (نحوی جملے) کیوں بولتے تھے جو دوسروں کی سمجھ میں نہ آئیں اس کے متعدد اسباب بتائے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے قبیلوں میں یہ الفاظ غریب نہ تھے۔ ابن قتیبہ نے غریب الحدیث میں ایک بدوی کا قول نقل کیا ہے اس سے پوچھا گیا کہ تم لوگ غریب الفاظ کیوں استعمال کرتے ہو؟ اس نے کہا:

هُوَ كلام القوم، انما الغريبُ اَنْتَ وَاَمْثَالُكَ الدُّخلاء فيه۔

یہ عوام کی بولی ہے، غریب تم ہو، اور تمہارے جیسے (غیر قبائل کے لوگ جو قبیلہ میں) باہر سے آگئے ہیں۔

اس کا عام سبب یہ ہے کہ مقفیٰ مسجع اور غریب الفاظ اور مشکل نحوی ترکیبوں میں بات کرنا اس وقت کا بڑا اہم فن تھا، عربوں کا یہ سرمایۂ ہنر تھا، وہ اس پر ناز کرتے تھے، اور اس معاملہ میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے، قرآن کریم نے تحدّی (چیلنج) کیا تھا کہ قرآن کی جیسی چند آیتیں تم نہیں بنا سکتے اور ایسے ایسے ماہرین کلام جن میں ایک ایک شخص برجستہ اس طرح کی تقریریں کر سکتا تھا، وہ سب کے سب ناکام رہے اور چیلنج کا جواب نہ دے سکے جب تک کہ ہمارے سامنے ان کے مایہ ناز مقررین کا کلام نہ ہو، ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کس درجہ کے لوگ تھے، اگر ہمارے سامنے اس طرح کے ادبی ٹکڑے نہ ہوں جن میں الفاظ پُرشکوہ، ترکیب عام شاہراہ سے بلند، اور وصف و واقعہ نگاری کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں، ہمیں نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ جن قوموں کو چیلنج کیا گیا تھا وہ کس درجہ زبان کے ماہر اور اس پر قدرت رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وفود کے جواب میں جو فرمایا ان میں بھی ان کے انداز کلام کی نمائندگی ہے۔ الفاظ اسی درجے کے غریب اور ترکیبیں (نحوی) اسی طرح کی ہیں۔ امام ابوسلیمان الخطّابی نے اپنی کتاب 'غریب الحدیث' کے مقدمہ میں اس کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ معقول ہیں اور اس لائق ہیں کہ ان کا ترجمہ کر دیا جائے:[1]

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داعی اور مبلغ بنا کر مبعوث فرمائے گئے تھے، ہر موقع پر آپؐ کو اپنی اس حیثیت کا احساس رہتا تھا، آپؐ اصلاح نفوس پر مامور بھی تھے اور خود آپؐ کے اندر اس کا اس درجہ بے پناہ جذبہ تھا جس کو قرآن نے 'حریص علیکم' سے تعبیر کیا ہے، قبائلی بدوجن کا سرمایۂ فن زبان تھا، ان کو اگر آپ سادہ مجازی روزمرّہ میں جواب دیتے تو ان کی نظر میں آپؐ کی بات نہیں جچتی، وہ لوگ سمجھ کے اس درجہ پختہ نہ تھے کہ بات کے مغز کو پالیتے، اس لیے ان کو انہی کے لہجے اور اسلوب میں جواب دینا ضروری تھا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جو باتیں اس لہجے اور اسلوب میں کی جاتیں وہ یاد کر لیتے تھے، اور جب اپنی قوم میں واپس جاتے تو ان الفاظ کو بعینہ دہرادیا کرتے، اگر روزمرہ کی زبان میں بات سنتے تو نقل کرنے میں الفاظ گھٹا بڑھا سکتے تھے، اور آپؐ سے سنی ہوئی بات اپنے الفاظ میں (روایت بالمعنی) نقل کرتے جس میں مفہوم کے بدلنے کا بھی خطرہ تھا۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے۔ یہ بات صرف عقیدت کی بنا پر نہیں کہی جاتی بلکہ آپؐ کے فرمودات کی لسانیاتی تحلیل سے ثابت ہے اور اس کی اثرانگیزی آج بھی مسلم اور غیرمسلم ادبا کو تسلیم ہے، آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ بات کو دوٹوک

---

[1] الخطابی کی مشہور کتاب 'غریب الحدیث' ہے جس میں انھوں نے ایسی طویل حدیثیں نقل کی ہیں جن کے الفاظ میں غرابت ہے اور متن کے لحاظ سے طویل حدیثیں ہیں، اس کو ڈاکٹر عبداللہ الجبوری نے تحقیق کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں عراق سے شائع کیا ہے۔

انداز میں کرنے اور مکمل ٹھوس اور معنی کے لحاظ سے مکمل بات کرنے کا سلیقہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، چنانچہ حدیث صحیح میں ارشاد ہے:

"فُضِّلْتُ عَلَى الانبیاء بِسِتٍّ، اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَاُحِلَّتْ لِیَ الغنائمُ وَجُعِلَتْ لِی الارضُ طَهُوْرًا وَ مَسْجِدًا وَ اُرْسِلْتُ اِلَی الخَلْقِ کَافَّةً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ"[1]

"مجھے تمام انبیائے سابقین کے مقابلہ چھ باتوں میں افضل بنایا گیا ہے۔ (۱) مجھے 'جوامع الکلم' عطا ہوئے [اصولی، مکمل، ہر جانب سے ٹھوس]، (۲) میری مدد اس طرح کی گئی کہ میرا رعب دلوں میں ڈال دیا گیا، (۳) میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا، (۴) روئے زمین کو میرے لیے پاک اور جائے سجدہ بنایا گیا یعنی زمین پاک ہے، خشک جگہ پر جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں (برخلاف بعض دوسرے مذاہب کے جن کی عبادت صرف مخصوص مقامات پر ہو سکتی ہے) (۵) مجھے تمام مخلوقات کی طرف مبعوث کیا گیا (یعنی کسی خاص زمانہ یا کسی خاص جگہ کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم کے لیے اور ہر زمانہ کے لیے نبی بنایا گیا) اور مجھ پر پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم کیا گیا۔"

اس حدیث میں جن چھ خصائص نبویؐ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر خصوصیت کو بیان کرنے کے لیے علیحدہ مستقل کتاب یا مقالہ کی ضرورت ہے، سردست صرف پہلی بات جوامع الکلم کو لیا جائے، جوامع الکلم کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے وہ باتیں کہلائی گئیں جو اپنی جگہ ہر معنی کے لحاظ سے مکمل، الفاظ کے لحاظ سے مختصر ہیں، اس کو موجودہ تعبیر میں آپ 'فارمولہ' کہہ سکتے ہیں، جس کی تشریح و تفریع مختلف زاویوں سے ہو سکتی ہے، اور جس کے ہوتے ہوئے کسی چوں و چرا کی گنجائش نہ رہے۔

اس موضوع پر علمائے ادب و حدیث نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں:

---

[1] مسلم شریف وسنن ترمذی، بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

۱۔ التاج الجامع للأصول فی احادیث الرسول — از علامہ محدث منصور علی ناصف

۲۔ التصویر الفنی فی الحدیث النبوی — ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ

۳۔ الحدیث النبوی الشریف من الناحیۃ البلاغیۃ — 〃 کمال عزالدین

۴۔ من روائع الادب النبوی — 〃 کامل سلامہ الدقس

ان کے علاوہ متقدمین میں علامہ ابن رجب حنبلی جو آٹھویں صدی کے علماء میں ہیں، ان کی کتاب جامع العلوم والحِکَم فی شرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم بہت مشہور ہے، بڑے سائز پر ۴۲۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب 'دار المعرفۃ' لبنان سے شائع ہوئی ہے۔

جوامع الکلم کے ضمن میں عموماً وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن کے الفاظ مختصر ہیں۔ ادب نبوی کی دوسری صنف وہ طویل حدیثیں ہیں جن کے الفاظ کو غریب کہا جاتا ہے ان میں اکثر و بیشتر صحاح میں موجود ہیں، مثلاً حدیث ام زرع، دعائے استسقاء وغیرہ۔ بعض حدیثیں ایسی بھی ہیں جن کو موضوع کہا گیا ہے جیسے حدیث فدک جو حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہے، یا وہ حدیث جس میں زمانۂ جاہلیت کے بڑے خطیب قیس بن ساعدہ الایادی کا خطبہ ہے۔ (تاریخ الادب العربی للزیات میں بھی اس کا نمونہ ہے اور خزانۃ الادب للحموی میں بھی مذکور ہے، الفاظ کہیں زیادہ اور کہیں روایت میں کم ہیں) لیکن وہ احادیث جو صحاح و مسانید میں ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہے، ان احادیث کو اصطلاحاً 'غریب الحدیث' کہتے ہیں۔ غریب سند کے لحاظ سے نہیں، بلکہ متنِ حدیث میں الفاظ کے نامانوس اور اجنبی ہونے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمود الطناحی نے منال الطالب لابن اثیر کی تحقیق کی ہے۔ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "علماء کا اتفاق ہے کہ 'غریب الحدیث' میں پہلا مجموعہ "ابوعبیدہ معمر بن المثنی التیمی" م ۲۱۰ھ نے مرتب کیا۔ الحاکم النیسابوری (م ۴۰۵ھ) کا بیان ہے، اس طرح کی احادیث کو سب سے پہلے، النضر بن شمیل م ۲۰۳ھ نے مدون کیا۔ چونکہ ابوعبیدہ اور نضر بن شمیل کا زمانہ ایک ہی ہے اس لیے کسی کی بھی سبقت

تسلیم کی جا سکتی ہے۔"

اس موضوع پر سب سے جامع کتاب علامہ ابن اثیر (مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد ابن الاثیر المحدث) م ۶۰۶ھ کی ہے، جس کو ڈاکٹر محمود محمد الطناحی نے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں الخطابی کے 'غریب الحدیث' میں جو روایتیں آئی ہیں وہ بھی داخل ہیں، اور روایات کے اسناد کی تحقیق بھی ہے۔

غرض قرآن کریم کے بعد نثر کے نمونے یا تو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات و مکتوبات میں ملتے ہیں جن میں الشریف الرضی کے وضع کردہ مکتوبات بھی ہیں، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کلام بھی، ادبی حیثیت سے دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی حصہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نہیں ہے جب بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے اسلوب اور طریق بیان کی مکمل نقل ہے، تاریخی اور دینی حیثیت اپنی جگہ پر ہے، اس سے بحث نہیں اور نہ اس کے مقاصد سے گفتگو مقصود ہے، خالص ادبی تعبیرات کی روشنی میں دیکھیے تو احمد حسن زیات نے جس کا بھی تبصرہ نقل کیا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید کے بعد ادبی جمال و جلال کا نثر میں اس سے اچھا نمونہ نہیں مل سکتا۔

مگر ابن اثیر کی 'منال الطالب فی شرح طوال الغرائب' دیکھنے کے بعد نہج البلاغۃ کے علاوہ ہمیں خود احادیث نبویہ میں ایسے نمونے ملتے ہیں، جو عصر اول کی زبان کا بہترین نمونہ ہیں۔

اس حدیث کی روایت اور سند:

اس حدیث کی محدث دینوری (ابو عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ)، ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی، محمود زمخشری اور الحافظ اصفہانی نے تخریج کی ہے، ابن اثیر نے لکھا ہے کہ رواۃ حدیث کے یہاں مستند اور مشہور درجہ کی حدیث ہے، اس کی روایت حسن بن ابو الحسن البصری نے عمران بن حُصین سے کی ہے۔

عز الدین بن الاثیر نے اُسد الغابہ میں لکھا ہے کہ ابن عبد البر نے اس حدیث کی تخریج کی ہے، مگر طہفہ کا نام طعیہ بن ابی نصیر لکھا ہے۔

زمخشری اور الحافظ الاصفہانی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ایک اور فقرہ ہے جو ان کتابوں میں مذکور نہیں ہے، اور وہ یہ ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو سُن کر عرض کیا:

"یَارَسُوْلَ اللّٰہِ أرَاكَ تُكَلِّمُ وُفُوْدَالعرب بِمَا لا نَفْهَمُ اكثره ونحن بنو أبٍ واحدٍ فقال: أَدَّبَنِي رَبِّي فَأحْسَنَ تَأدِيْبِي وَرُبِّيْتُ فِي بَنِي سَعْدٍ"

"یارسول اللہ! میں دیکھتا ہوں کہ آپ وفودِ عرب سے جو خطاب فرماتے ہیں ان میں زیادہ حصہ ایسا ہوتا ہے جو ہم نہیں سمجھ پاتے۔ حالانکہ ہم آپ ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ (ایک باپ کی اولاد سے مطلب ایک ہی خاندان یا ایک ہی دادا کی اولاد ہیں) فرمایا: اللہ نے مجھے ادب سکھایا اور بہتر طریقہ پر میری ادبی تربیت فرمائی، نیز یہ کہ میری پرورش بنو سعد میں ہوئی ہے۔ (بنو سعد حضرت حلیمہؓ کا قبیلہ)

الفاظ کی تشریح:

الغور: نشیبی وادی، (اس کے مقابل "نجد" کا لفظ آتا ہے، اس کے معنی ہیں بلند، غَوْرٌ وَنَجْدٌ: نشیب و فراز،

تِهَامه: مکہ مکرمہ کا ایک نام ہے۔ بعض تحریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے النبی التہامی الہاشمی، لکھا گیا ہے۔ مکہ کے گرد و پیش وادیوں کو بھی تہامہ کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے تَهَمَ حبس کو کہتے ہیں جب لُو یا ہوا نہ چلے، تَهِمَ الحَرُّ گرمی کی شدت میں جب ہوا نہ چلے اور حبس ہو۔

اکوار: کُور کی جمع ہے، اونٹ کا کجاوہ، جیسے گھوڑے کے کجاوہ کو سَرْج کہا جاتا ہے۔

الیِنْبُ: ایک درخت کا نام ہے جس کی لکڑی بہت مضبوط اور سخت ہوتی ہے، اس سے کاٹھی بنائی جاتی ہے، ہمارے ملکوں میں جیسے ساکھو یا شیشم کے درخت ہوتے ہیں۔

ترتمی: رَمیٰ (باب افتعال)، تیزی سے لے جانا، گویا دور سے پھینک دینا۔

العیس: سفید رنگ کے اونٹ۔
القَبیر: تہ بہ تہ سفید بادل کے ٹکڑے۔ (جن سے اکثر پانی نہیں برستا)
استحلاب: دوہنا، نچوڑنا۔ (حلب سے باب استفعال)
استخلاب: کاٹنا، نوچنا (خلب سے 〃 〃)
الخبیر: پودے
نستعضد: استعضد کاٹنا، توڑنا، یہ لفظ عَضَد سے بنا ہے جس کے معنی کلہاڑی کے ہیں، یعنی ناخنوں اور انگلیوں سے وہ کام لیں جو کلہاڑی سے لیا جاتا ہے۔
البریر: شجر" اراک" کا وہ پھل جو پک کر کالا ہو جائے اور بہت تلخ ہو۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قحط کی وجہ سے اراک کا تلخ پھل لوگ کھانے پر مجبور ہیں' اور وہ بھی نہیں ملتا۔
نستخیل: (خ سے) خیال سے، ہم خیال کرتے ہیں۔ (امید باندھتے ہیں)
الرِّهام: ہلکی بارش، بوندا باندی۔ اس کا مفرد رِهْمہ ہے۔
نستحیل: (ح سے) احالہ سے بنا ہے، دیکھنا۔ (قاموس میں اس لفظ کو حال یحول بتحریک سے بتایا ہے
الغائلۃ: ہلاکت آفریں۔
النِّطاءُ: دوری، بُعد۔
المَوطأُ: قدم رکھنے کی جگہ۔
المُدْهُنُ: پہاڑ یا پتھر میں کوئی بڑا سوراخ۔
الجُعْثُن: پودے کی جڑ۔
الأُمْلُوج: امالیج کی جمع، تنکوں کی طرح لمبے پتے۔
العُسْلُوج: کسی درخت کی نرم ٹہنی جس سے پتے نکلتے ہیں۔
هَدِی: اونٹ، بکرے، بھیڑ، اصلاً قربانی دیے جانے والے جانوروں کو کہتے ہیں جو حج کے موقع پر لوگ ساتھ لے جاتے تھے۔
الوَثَنُ: غیر اللہ جس کی پوجا کی جائے۔
الوَدِیُّ: کھجور کا معمولی خوشہ۔

الغش : اعتراض، مباحثہ، جھگڑا۔

طما : سمندر کی سطح آب کا اونچا ہو جانا۔

تِعار : ایک پہاڑ کا نام ہے جو بہت مشہور تھا۔

النّعم : اسم جنس۔ بھیڑ، بکرے، گائے، اونٹ وغیرہ۔

هَمَل : وہ جانور جو آوارہ پھرتے ہیں۔

الأُغفال: غُفل کی جمع، وہ جانور جس پر کسی ملکیت کا نشان نہ ہو۔

بَضٌّ : تھن سے قطروں کے حساب دودھ کا نکلنا۔

اِبلال : جمع بلل، تری، مطلب دودھ۔

وَقیر: بھیڑ بکروں کے ریوڑ۔

رَسَلُ : وہ جانور جو چراگاہ بھیجے جاتے ہیں۔

رِسُل: دودھ۔

السنة الحمراء: سخت قحط زدہ وقت۔

مؤزلة: تنگی۔

العَلَل : ایک گھونٹ کے بعد دوسرا گھونٹ۔

نَهَل : پہلا گھونٹ۔

مَحْض : خالص دودھ، جس میں پانی نہ ملا ہو۔

مَذق : وہ دودھ جس میں پانی ملا ہو۔

فِرق : دودھ کا پیمانہ۔

دَثر : دولت، مال کثیر۔

یانع : پکا ہوا پھل۔

ثَمَدُ : گدلا اور کم مقدار میں پانی۔ (فجر الثمد کا مطلب ہے کم مقدار کے پانی کو حاصل کرنے کی کوشش۔)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں جو لھم کی ضمیر ہے وہ طہفہ اور

اوران کی جماعت کی طرف راجع ہے۔

ودائع : سے مطلب (ودیعہ کی جمع) جنگ بندی کا معاہدہ۔

وضائع الملك: خراج کی رقم جو عائد کی جاتی تھی۔

مُلْطط : اَلَطَّ يُلِطُّ يا لَطَّ يَلُطُّ سے جو تعداد عائد کی گئی ہے اس کی بروقت ادائیگی۔

الحاد : جادۂ حق سے تجاوز۔

الفریضة: بوڑھے جانور۔

العارض : عیب دار جانور۔

الفریش : نومولود جانور۔

ذوالعنان: لگام لگائے جانے والے جانور، مراد گھوڑے۔

الرَّکوب: سواری کے لیے رام کیے ہوئے اونٹ۔

الفُلُوُّ: اچھے قسم کے گھوڑے۔

ضبیس : سخت۔

السَّرح : جانور، جو چراگاہ جاتے ہیں۔

السملح : ایک خاص قسم کا درخت۔

الدَّر : کافی تعداد میں دودھ کا نکلنا۔

الأُكُل : غذا۔

الإضمار: کسی بات کا دل میں رکھنا۔

الإماق: غدر، ایمان شکنی۔

الرِّباق: جمع ربقہ، جانور کی گردن میں باندھی جانے والی رسّی۔

الذِّمة: امان۔

الرِّبوة : طے شدہ رقم سے زیادہ عائد کرنا، (جرمانہ)۔

پروفیسر حبیب الحق ندوی

فنونِ لطیفہ کی شہ رگ

(۲)

پلیٹو (PLATO) کے بعد مغربی ادبیات میں شعری نقد و جرح کا سلسلہ:

پلیٹو اور ارسطو کے نظریات نے ادب کو دو مختلف سمتوں میں منقسم کر دیا۔ پلیٹو کا نظریہ 'ادب برائے زندگی' اور ارسطو کا نظریہ 'ادب برائے ادب' آج تک انتقادیات کا موضوع بحث ہے۔ ادب میں لامقصدیت اور التذاذ کی یہی تحریک تھی جس نے آج فحش ادب کی صورت اختیار کر لی، اس کے خلاف مغرب و مشرق دونوں میں احتجاج جاری ہے۔ یورپ میں عہد وسطیٰ تک شاعری ڈھال رہی۔ یہ بحث کہ آیا شاعری مستقل بالذات کوئی آزاد فن ہے یا نہیں؟ بطور سوالیہ نشان نشاۃ ثانیہ تک جاری رہا۔ سولہویں صدی میں شاعری کو ایک آزاد فن کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ لیکن بایں ہمہ اس کے کردار (FUNCTIONS) اور معاشرہ یا اجتماع میں اس کی ذمہ داریوں پر بحث جاری رہی۔ ایک طرف مسیحی پیورٹن (PURITAN) جماعت دوسری طرف چرچ کے علماء اور تیسری طرف سیاسی مدبرین، شاعری کی افادیت کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے، چرچ کا عتاب جاری رہا۔ ان پیہم صدمات کی وجہ سے شاعری کا جانبر ہونا محال نظر آنے لگا۔ لیکن چونکہ ہر عمل کا ایک فطری ردعمل ہوتا ہے شاعری کے دفاع کی تحریک اسی ردعمل کا نتیجہ تھی۔ شاعری کا دفاع شروع ہوا۔ ولس (WILLIS) نامی ناقد نے شاعری کے خلاف تمام اعتراضات کی فہرست تیار کی اور ان کے جوابات دیے۔ اہم اعتراضات میں دلچسپ حسب ذیل تھے۔ مثلاً: شاعری فطرۃً ایک بیکار شے ہے، نقصان رساں ہے، جذبات پرستی کی تلقین کرتی ہے۔ مخرب اخلاق ہے اور جرائم پیشہ بھی، ظالمانہ جنگوں کی داستان ہے اور عاشقانہ جنسی افسانوں کی کہانی بھی، شعراء پاگل اور سنکی ہوتے ہیں، ان کے قول و فعل میں تضاد ہے جو ان کی منافقت کی دلیل ہے، وہ جو کہتے

ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے، مختصر یہ کہ شاعری مادر کذب ہے۔ ولس نے دفاع کے لیے مذہبی سہارا لیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اگر شاعری واقعتاً باطل اور لغو ہے تو خود بائبل اور قدیم مسیحی دعائیں (HYMS) بھی لغو و باطل ہیں کیونکہ وہ بھی شاعری کی ایک قسم ہے۔ ولس کے دفاع الشعر کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ تھامس لاج (THOMAS LODGE 1579) نے شعر کے دفاع میں زور لگایا۔ دفاعی جنگ میں سڈنی سرخیل کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے پلیٹو کی تائید کرتے ہوئے ثابت کیا کہ شعر بالذات خراب نہیں۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا خراب بناتا ہے۔ نیز پلیٹو نفس شاعری کا مخالف نہ تھا۔ اس نے خود بھی صالح اور خدا ترس شعرا کا استثنار کردیا ہے۔ اس نے جس شاعری کی مذمت کی ہے وہ یونانی شعرا کی دروغ آمیزی ہے اور مبالغہ کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کی جھوٹی ترجمانی ہے۔ سڈنی نے گوسن (GOSSEN) کے اعتراضات کے جوابات دیے اور شاعری کے خلاف اعتراضات کو چار حصوں میں تقسیم کردیا۔ دفاع کا سارا زور اس اعتراض کی نفی میں صرف کیا کہ شاعری مادر معاصی و کذب (MOTHER OF LIES) نہیں ہے اور معصیت آمیز تخیلات کی محرک نہیں ہے۔ شاعری ایک قدیم اور مقدس فن ہے جو تنویر افکار کا ذریعہ ہے اور قاری کے ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ دنیا کے فلاسفہ عام طور پر شاعر گزرے ہیں، مثلاً خود پلیٹو، پتھاگورس، امپڈوکلس وغیرہ عظیم شاعر تھے۔ معروف نامور مورخ ہیروڈوٹس بھی شاعر تھا۔ پھر شاعری پر غلط الزامات لگانا، انصاف کے خلاف ہے۔

نقد الشعر کا سلسلہ انیسویں صدی تک رد و قبول کے مراحل سے گزرتا رہا، اچانک ایک نئی تحریک چل پڑی۔ یہ رومانی تحریک تھی جس کی آندھی نے یورپ کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ رومانی تحریک قدیم روایات کے لیے برق تپاں بن گئی۔ اس کی دعوت کا محور عودۃ الی الفطرۃ (RETURN TO NATURE) تھا۔ رومانی تحریک کے قائدین نے دعویٰ کیا کہ انسان اور اس کی زندگی فطرت سے بہت دور ہوگئی ہے اور وہ مصنوعی زندگی کا عادی ہوگیا ہے۔ فن و ادب، سیاست و سماجی مراسم، تعلیم و تربیت کے ادارے سب روایت کے شکنجے میں گرفتار ہیں۔ ضرورت ہے انسان اور اس کے سماجی اداروں کو اس شکنجے سے آزاد کیا جائے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ اس تحریک کی زد میں سب سے پہلے آئے۔ شاعری جو امرا و رؤسا کی مدح میں شاہی محلات کی اسیر تھی، عروض و بلاغت اور صنائع

کے دباؤ سے جانکنی میں مبتلا تھی، اس کو آزاد کرانے کی تحریک رومانی شعراء نے پوری قوت کے ساتھ چلائی۔ شعرا شہروں کی مصنوعی زندگی سے نکل کر کوہساروں، آبشاروں کے آغوش میں ہجرت کرنے لگے۔ تاکہ ان کی شاعری میں فطرت کی ترجمانی ہو سکے اور دیوی دیوتاؤں یا پریوں کے افسانوں سے آزادی نصیب ہو اور شعر میں قلب انسانی کی دھڑکنوں اور اس کے نبضوں کی حرارت کو ضبط کیا جا سکے۔ معروف انگریزی شاعر ورڈس ورتھ (WORDS WORTH) نے ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ شعر میں فرشتوں کے آنسو نہیں ہوتے ہیں۔ اس میں تو انسانوں کے چشم گریاں کے آنسو اور قلب بریاں کی حرارت ہوتی ہے

Poetry sheds no tears such as angels weep
But natural and human tears.'

شاعری کا خام مواد۔ دیومالائی قصے نہیں بلکہ عام انسانوں کی فطری زندگی ہے ــــــ اور جذبات انسانی کا اظہار شاعری کے تکوینی عناصر ہیں۔

'Poetry takes its origin from emotions
recollected in tranquillity.'

رومانی تحریک نے قدیم کلاسکی روایات و نظریات کی بنیادیں ہلا دیں، اور قوم کو شعر و شاعری کے مقدس فریضہ سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے معاشرتی فرائض سے بھی آگاہ کیا۔ ایک صدی تک رومانی تحریک کا زور رہا۔ لیکن بیسویں صدی میں رجحانات میں تبدیلی آئی اور روایات کے احیاء و تجدید کی تحریک چلی جس کے سرخیل معروف شاعر و ناقد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S.ELIOT) تھے۔ انھوں نے رومانی تحریک کو مریض ذہنیت اور میلانات (DISEASED SENSIBITITY) کا مرقع قرار دے کر اسے مغربی روایات کے خلاف ایک بغاوت قرار دے دیا۔ ایلیٹ کے خیال میں شاعری محض جذبات کا بہاؤ نہیں بلکہ جذبات سے گریز کا نام ہے۔

'Poetry is not letting lose of emotions but
an escape from emotions.

کلچر اور انارکی کا معروف مولف آرنلڈ نے روحانی اور اخلاقی اقدار کو فنون لطیفہ کی خشت گل قرار دے دیا اور اعلان کر دیا کہ جو شاعری اخلاقی اور روحانی اقدار کے خلاف بغاوت کرتی ہے

وہ گویا زندگی کے خلاف بغاوت کرتی ہے:

'A poetry in revolt against moral ideas is
a poetry of revolt against life.'

آرنلڈ کی نظر میں شاعری خود نقد حیات ہے (Poetry is criticism or life)
اس کے خیال میں شاعر اور ناقد دونوں پر معاشرہ کے واجبات اور فرائض ہیں جنھیں آرٹ اور کلا (Art) کے نام پر قربان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی معروف کتاب کلچر اور انارکی کا عمودی مضمون 'سوسائٹی کے ساتھ ناقد کا رشتہ' ہے۔ ناقد پر اشاعت حق واجب ہے۔

(Critic is to make Truth prevail.')

اے۔ سی۔ بریڈلے (A C BRADLEY) نے آکسفورڈ میں شاعری پر معرکۃ الآرا لکچرز دیے (OXFORD LECTURES ON POETRY) مطبوعہ انڈیا یونیورسٹی (1961) تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب شعر و شاعری سے سیر حاصل بحث کرتی ہے۔ اس پر تبصرہ علیحدہ مقالہ کا متقاضی ہے، جو کسی دوسرے موقع پر ممکن ہے۔ اسی طرح ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مفصل افکار اس کی معروف کتاب (ON POETRY AND POETS) مطبوعہ نون ڈے پریس (1961) میں تین سو صفحات پر مشتمل ہیں، جو مستقل مقالہ کے محتاج ہیں۔ ان عباقرہ ناقدین سے واقفیت اور ان کا تعارف اس لیے بھی ضروری ہے کہ مغربی افکار اور نقدالشعر کا ادراک کماحقہ ہو سکے۔ ان میں ہمارے اُن مشرقی ادبا، شعرا، اور ناقدین کے لیے درس عبرت ہے، جو ادب میں اخلاقیات اور روحانی اقدار کے منکر ہیں اور ان کو بے ادبی یا 'ملّا ازم' تصور کرتے ہیں۔

گفتگو کا اختتام برنارڈ شا کے نظریات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد کرنا زیادہ مفید ہوگا۔ معروف انگریزی ناقد، ڈرامہ نگار شاعر نے مغربی کلچر اور فنون لطیفہ پر ناقابلِ انکار اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کی وفات کو ابھی چند عشرات ہی گزرے ہیں۔ برنارڈ شا اپنے ادبی نظریات میں اپنے پیش رو ناقدین سے زیادہ متقشف نظر آتا ہے، وہ اپنے نظریہ فنون لطیفہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ملٹن اور بنیان کی طرح لطیف موسیقی اور خوب صورت عمارات کا دلدادہ ضرور ہوں، لیکن اگر مجھے یہ محسوس ہو جائے کہ یہ سب جذبات پرستی کا آلہ کار بنتے جا رہے ہیں تو میں عیش کو

اور ناقدین ادب کے افکار کی پروا کیے بغیر دنیا کے تمام گرجوں کو ڈائنامیٹ سے نیست و نابود کر دیا۔
ایسے اداروں کی تاراجی ہی میری نظر میں اعلیٰ بصیرت اور مدبّرانہ سیاست کی علامت ہے۔

'I am fond of fine music and handsome buildings as Milton was or Cromwell or Bunyan, but if I found that they were becoming the instruments of systematic idolatry of sensuousness, I would hold it good statesmanship to blow every cathedral in the world to pieces with dynamite, organ and all, without the least heed to the screams of the art critics and cultural volupturies.'

برنارڈ شا تھیٹر کو اسکول اور چرچ کی طرح مقدس مراکز تعلیم و تربیت تصور کرتا ہے۔ یہ محض لہو و لعب کے ادارے ہی نہیں ہیں بلکہ ذمہ دار سماجی اور اخلاقی ادارے بھی ہیں۔ وہ رقمطراز ہے کہ سماجی ادارہ کی حیثیت سے تھیٹر (THEATRE) کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے لیکن تھیٹر ایک مخرب اخلاق اسکول اور برے چرچ کا رول بھی ادا کر سکتے ہیں۔ تہذیب کی پیچیدگیاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسکول اور چرچ اپنے اخلاقی فرائض ادا کریں۔

'The theatre is growing in importance as a social organ. But theatres are as mischievous as bad schools or bad churches, for the modern civilisation is rapidly multiplying the class to which theatre is both school and church.' ۲؎

اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے برنارڈ شا متمنی ہے کہ کاش تھیٹر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے تنویر افکار کا ذریعہ بن جائیں، ضمیر انسانی اور شعور کے محرک اور سماجی کردار کے ترجمان بن جائیں۔ مایوسی، قنوطیت اور اضمحلال کے خلاف دفاعی اسلحہ اور عروج آدم کا منشور بھی بن جائیں۔

'This would be a very good thing if the theatre took itself seriously as a factory of thought, a prompter of conscience, an elucidator of social conduct, an armory against despair and dulness and the temple of the ascent of man.' [۳]

بدقسمتی سے برنارڈ شا اور اس کے ہم خیال رفقا زندہ نہ رہے ورنہ وہ جدید کیسنو کلچر (CASINO CULTURE)، نائٹ کلب اور مخرب اخلاق سینما ہال اور ویڈیو کیسٹ کے تمام اداروں کو ڈائنامیٹ کے ذریعہ تاراج کرنے کو مدبرانہ سیاست تصور کرتے اور فسق و فجور، فحاشی اور عیاشی کے ان اڈوں کو نیست و نابود کرنے کی تحریک کے رہبر بن جاتے۔ کلچر، آرٹ اور کلا کے نام پر عیاشی کے اڈے چلانے والے تاجران کے لیے زمین تنگ ہو جاتی، یہ لوگ شعر و ادب، ناول و افسانہ کے ذریعہ الحاد اور عریانی و بدکاری کے تجارت خانوں کو ختم کر دیتے تاکہ سفلی ادب کا وجود ختم ہو جائے۔

مشرق میں اصلاح ادبیات کی تحریکات، ادب اسلامی کو فروغ دینے کی دعوت:

مغربی ادبیات اور نقد الشعر کے اس پس منظر میں مشرق کی اصلاح ادبیات کی تحریکات پر ایک طائرانہ نظر مفید ثابت ہو گی۔ عالمی ادبیات کا تقابلی مطالعہ ہمیشہ مفید اور نفع بخش ہوتا ہے، اور ہمارے شعراء اور ادبا کی رہبری کے لیے معاون بھی۔ ہمارے بعض ادبا اور شعراء کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کے اسباب میں ایک اہم سبب فنون لطیفہ سے بے تعلقی اور غفلت رہی ہے۔ اگر اس مفروضہ کو درست تسلیم کر لیا جائے تو زوالِ یونان و روما کے بارے میں ہمارے ادبا و شعراء کی رائے کیا ہو گی؟ یونان میں فنون لطیفہ کو مذہب کا درجہ حاصل تھا۔ یونانی دیویاں (MUSES) جو یونان کے بڑے دیوتا زیس (ZEUS) اور اس کی اہلیہ دیوی نموسن (NEMOSIN) کی دختران نیک اختر تھیں، فنون لطیفہ کی

اشاعت میں فنا فی اللہ تھیں۔ اس فدائیت کے باوجود یونان کا زوال نوشتۂ تقدیر تھا اس تنزل کو نہ یونانی دیویاں نہ اس کے دیوتا روک سکے۔

شعر و ادب میں اقدار عالیہ کے تحفظ اور فضائل حمیدہ کی اشاعت کے بارے میں مغرب اور مشرق کے تمام ذمہ دار ناقدین ادب کا اجماع ہے۔ مشرق میں شعر و ادب کم و بیش انھیں مراحل سے گزرے ہیں جن سے وہ مغرب میں گزرے تھے۔ غیر ذمہ دار اور مخرب اخلاق شعراء کے خلاف حالیؔ کا نوحہ عبرت ناک ہے۔ حالیؔ نے پلیٹو کی طرح نہ صرف ایسے شعراء کو اپنے اقلیم شعر سے دربدر کیا بلکہ انھیں جہنم رسید کر دیا:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے [۴]

علامہ اقبالؒ نے اسرار خودی میں "درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ" میں اپنے افکار کا برملا اظہار کیا ہے، ایک شعر کے اندر علامہ نے ادب اسلامی کے عروج و ظہور کا فلسفہ بیان کر دیا:

رجعتے سوئے عرب می بایدت — فکر صالح در ادب می بایدت [۵]

عرب سے اقبالؒ کی مراد اسلام، اور فکر صالح سے مراد اسلامی زندگی کی آرزو اور عشق حقیقی ہے۔

اسلامی شاعری چونکہ سچائی اور سوز دروں دونوں کا مجموعہ ہے، اس لیے اقبالؒ نے شعراء وطن کو اسی اسلامی شاعری ــــ جس سے ہمارے ترقی پسند شعراء شرماتے

ہیں اور اس کو بے ادبی قرار دیتے ہیں ___ کے احیاء اور تجدید کی دعوت دی ہے۔

لامقصدیت ادب کی جاں کنی ہے۔ خوب سے خوب تر کی طرف سفر واضح مقصدیت کے بغیر ممکن نہیں۔ حالی اور اقبال اور ان کے ہم نواسب ادب میں اسی کے متلاشی ہیں۔

مصادر: (حوالہ جات)

لہ جارج برناڈشا، ڈرامائی نظریات اور مقالات ص ۱۴

Dramatic opinions and Essays, P. 14 (1)

لہ ایضاً

لہ ایضاً۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ کتاب

لہ خواجہ الطاف حسین حالی، ملاحظہ ہو مسدس

لہ علامہ محمد اقبالؒ ___ فنونِ لطیفہ سے متعلق علامہ کے نظریات کے لیے کلیات فارسی و اردو ___ (اشاعت دوم فارسی مئی ۱۹۷۵ء) اور اشاعت سوم اردو ۱۹۷۷ء مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پیشِ نظر ہے۔ نظمیں مثلاً "درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ، حکمت و شعر، حور و شاعر، شاعر، دین و ہنر، فنونِ لطیفہ، شعر عجم، ہنرورانِ ہند، رقص و موسیقی، ___ اور نفسیات غلامی وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

تعارف و تبصرہ

'نمودِ صبح' مجموعۂ کلام جناب تہور علی زیدی، صفحات ۲۷۲، قیمت ۵۰ روپیے پاکستانی
ملنے کا پتہ: ۱۴۰/ آر۔ بلاک ۲۔ سرسید روڈ روڈ، کراچی (پاکستان)

اردو کے ایک قادر الکلام شاعر جناب سید تہور علی زیدی کا یہ مجموعہ دل آویز و فکر انگیز اشعار کا گنجینہ ہے، زیدی صاحب روایاتِ کہن کے امین اور نیاگانِ دانش و فن کے وارث ہیں۔ وہ شاعر ہیں مگر شاعری ان کا پیشہ نہیں ہے بلکہ ان کے سوزِ دروں، حلاوتِ ایمانی اور ذوق و وجدان کا آئینہ ہے، اشعار میں طرزِ ادا کا بانکپن ہے، لہجہ میں سادگی اور رعنائی ہے۔ اس مجموعہ میں غزل بھی ہے جو بقول رشید احمد صدیقی مرحوم کے ہماری تہذیب اور زبان کی آبرو ہے اور اس میں نعت بھی ہے جو شاعر کے صدقِ احساس، ذوقِ سلیم، اور بصارت کی سچی تصویر ہے۔

ان کے کلام کے اس حسین مرقع کو ان کے سعادت مند فرزند پروفیسر ظفر حسنین اور ہنرمند صاحبزادی ڈاکٹر مہ جبیں نے بہت ہی نفاست کے ساتھ شائع کیا ہے، ٹائیٹل پر کتاب کے نام کی مناسبت سے پو پھٹنے کا منظر اس درجہ حسین دکھایا ہے کہ دیکھنے والے کی خواہش ہوگی کہ اس کو چوکھٹے میں آویزاں کرکے اپنا گھر سجائے، کتابت ایسی جس سے آنکھوں میں نور آجائے، اور طباعت ایسی کہ کتاب کھولیے تو اُجالا پھیل جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے عروسِ جمیل کے لیے اسی ملبوسِ حریر کی ضرورت تھی۔

ابتدائیہ ڈاکٹر مہ جبیں کے قلم سے ہے جس میں انھوں نے اپنے والدِ مکرم اور خاندان کا تعارف بہت ہی شگفتہ انداز میں کرایا ہے، جس میں نہ تصنع کی بُو ہے اور نہ بے جا تواضع، اور نہ بے محل تعلّی، سیدھی بات، سادہ انداز، سچی تصویر۔

اس ابتدائیہ میں جس کا عنوان 'تعارف' ہے ڈاکٹر مہ جبیں اپنے اب و جَد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

ان کے جد ثانی (پردادا) سید فرزند علی علیہ الرحمہ کے پاس ایک تعزیت میں سرسید احمد خاں تشریف لائے تھے، اور ان سے فرمائش کی کہ اپنے کسی لڑکے کو علی گڑھ تعلیم کے لیے بھیجیں، سید فرزند علی صاحب نے فرمایا:
"بھائی! میں اپنا گوشت جہنّم کی آگ میں نہیں ڈال سکتا، البتہ چندہ جو آپ فرمائیں پیش کر سکتا ہوں۔"

یہ جواب آج سادہ لوحی، ناواقفیت اور ناعاقبت اندیشی پر محمول کیا جائے گا، اگر کوئی بہت تہذیب و متانت سے بھی تبصرہ کرے گا تو یہی کہے گا کہ "اگلے وقتوں کے لوگوں" کے افتادِ مزاج کا یہ ایک رُخ ہے لیکن جس کے سامنے ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد کا ماحول ہے، اور جذبۂ انتقام سے بھری ہوئی سامراجیت کے مظالم کی داستان ہے وہ جانتا ہے کہ یہ جواب ایک پورے ماحول کا عکّاس ہے، ایک تاریخ ہے، ایک غیرت مند مردِ مسلمان کے دل کی آواز ہے، ایسی آواز اگر نہ ہوتی تو اس سرزمین پر اذان کی آواز نہ سنائی دیتی، یہ غیرت نہ ہوتی تو اندلس کی طرح یہاں سے بھی اسلام رخصت اور مسلمان معدوم ہو چکے ہوتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سرسید کی دعوت ہوش میں آنے کی دعوت تھی، وہ طوفان کو دیکھ رہے تھے، آندھیوں میں چراغ تہ داماں کی لَو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ دونوں سچے تھے، دونوں مخلص تھے، سرسید کے ہوش نے مسلمان کو باقی رکھا اور سید فرزند علی کے جوش نے اسلامی قدروں کی پاسبانی کی۔ اللہ دونوں کی قبروں کو منور رکھے۔

اس کتاب میں احمد ہمدانی صاحب کا مقدمہ فاضلانہ ہے، اور "نمودِ صبح" کی غزلوں کا تجزیہ اچھا کیا ہے۔ نثر کے حصے میں موصوف کی تحریر بہت جاندار ہے۔ اب رہا سید تہور علی صاحب کی شاعری پر اظہارِ رائے جیسا کہ اس تبصرہ کی ابتدائی سطروں میں عرض کیا، ان کے کلام میں اساتذۂ فن کے کلام کی جھلک ہے۔ حیرت ہے کہ ایسا باکمال شاعر اتنے دنوں پردۂ خفا میں کیوں رہا، ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا نہ سہی، ادب ایک ابرِ کرم بھی تو ہے اس کو برسنا چاہیے، جس سے دل و دماغ کے چمن شاداب ہو سکیں۔

کسی تبصرہ و تجزیہ کے بجائے مناسب ہوگا حضرت زیدی کی ایک نعت اور ایک غزل بطور نمونہ پیش کر دی جائے۔

رحمت کے ہیں تابندہ حالات مدینے میں — انوار کی بارش ہے دن رات مدینے میں
انعامِ الٰہی تھے، سرمایۂ رحمت تھے — ہم نے جو گزارے ہیں لمحات مدینے میں
جس سمت نظر اُٹھی، اکرام کی بارش تھی — ہر شخص نے دیکھی ہے یہ بات مدینے میں
ہر لمحہ نظر مجھ پر تھی رحمتِ عالم کی — ایسی بھی گزاری ہے اک رات مدینے میں

جس کے لیے خالق نے تخلیق دو عالم کی زیدؔی متمکن ہے وہ ذات مدینے میں

اس شعر کو پھر پڑھیے :

ہر لمحہ نظر مجھ پر تھی رحمتِ عالم کی
ایسی بھی گزاری ہے اک رات مدینے میں

اس شعر کو سُن کر کیا کسی بندۂ مومن کے دل کی دھڑکن تیز نہیں ہو جائے گی ؟ ایک حسرت دل میں کروٹ لینے لگے گی کہ کاش ! ایک رات اس کو بھی ایسی میسر ہو، جو بات دل کی دھڑکن تیز کردے اسی کو شعر کہتے ہیں !!

آخر میں ایک غزل بھی سُنیے :

تم جس میں بس رہے تھے وہ دنیا نہیں رہی — وہ دل نہیں رہا وہ تمنّا نہیں رہی
بادہ کشی کو اب بھی ترستا ہے جی مگر — وہ دل کشیِ ساغر و مینا نہیں رہی
یہ سوئے اتفاق ہے یا حُسن اتفاق — غم سے طبیعت اپنی شناسا نہیں رہی
بربادیوں کا اپنی ہمیں کوئی غم نہیں — غم اس کا ہے کہ کاوشِ فردا نہیں رہی
وہ اک خلش جو دل کو ملی ہے بہ فیضِ عشق — منت کشِ خیال سراپا نہیں رہی
اس قوم کا ہے زیدؔی جہاں میں مقام کیا — جس قوم میں عقیدتِ عقبیٰ نہیں رہی

نعتیں اور غزلیں تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، ظاہر ہے سب نقل نہیں کیے جاسکتے۔ اس ہار کا ہر موتی اپنی جگہ تابناک ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے حضرت زیدی (شاعر) کے صاحبزادے پروفیسر زیدی اور صاحبزادی ڈاکٹر مہ جبیں زیدی کا ذکر کیا ہے کہ ان سب میں ثقافتی وضع داری پائی جاتی ہے، اس ثقافتی وضع داری کے ساتھ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ خاندان مصنفوں کا خاندان بن گیا ہے۔ ظفر حسنین کیمسٹری کے آدمی ہیں، ان کی کیمیاگری بھی ایک کتاب کی شکل میں جلوہ گر ہو چکی ہے، ان کی بہن مہ جبیں مولانا سید سلیمان ندویؒ پر ریسرچ کر چکی ہیں، اور یونیورسٹی میں لکچرر ہیں۔ اس خاندان کا تذکرہ ڈاکٹر شاہدہ زیدی (بیگم ظفر) کے بغیر نامکمل رہے گا، موصوفہ بھی اپنے فن ڈاکٹری پر ایک کتاب لکھ چکی ہیں۔ اس خاندان میں وضع داری کی صفت سب میں مشترک ہے۔ یہ اور بات ہے ڈاکٹر شاہدہ کی وضع داری ثقافتی سے زیادہ سرجیکل قسم کی ہے

ترتیب : مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں

فقہی سمینار :

گزشتہ اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں مرکز البحث العلمی پھلواری شریف پٹنہ اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکیٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے مشترکہ تعاون سے ہمدرد کنونشن سنٹر نئی دہلی میں ایک سمینار منعقد ہوا، جس کی صدارت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے فرمائی اور افتتاح حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے کیا، سمینار میں ضبطِ تولید، اعضاء کی پیوندکاری اور "پگڑی" جیسے اہم مسائل زیر بحث آئے۔ "پگڑی" کے مسئلے پر غور و فکر کرنے، اور اس کے قانونی، سماجی، معاشی اور شرعی پہلوؤں اور پیچیدگیوں کا جائزہ لینے کے لیے آٹھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں آئندہ اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جائے گی۔

اعضاء کی پیوندکاری کے سلسلے میں سمینار کے شرکاء نے درج ذیل باتوں پر اتفاق کیا: "

۱۔ انسان کے جسم میں غیر حیوانی اجزاء کا استعمال بطور علاج درست اور جائز ہے۔

۲۔ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کے ذبح کردہ جانوروں کے اجزاء کا استعمال بطور علاج جائز ہے۔

۳۔ کسی شخص کی جان کی ہلاکت یا عضو کے تلف ہونے کا قوی اندیشہ ہو اور اس مطلوبہ عضو کا بدل کسی غیر ماکول اللحم جانور یا ماکول اللحم لیکن غیر مذبوحہ جانوروں میں ہی مل سکتا ہو تو اس کی پیوندکاری جائز ہے۔

۴۔اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو تو خنزیر کے اجزا کا استعمال جائز نہیں۔

۵۔انسانی اجزار کی فروختگی چاہے زندہ کے ہوں یا مُردہ کے بہر صورت ناجائز ہے۔

۶۔انسانی اعضار کی رضاکارانہ یا غیر رضاکارانہ زندہ سے یا مُردہ سے پیوندکاری کے مسئلہ پر حتمی رائے تک پہنچنے کے لیے دس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

ضبطِ ولادت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد سیمینار کے شرکار نے مندرجہ ذیل تجویزیں اتفاقِ رائے سے پاس کیں:

۱۔کوئی بھی ایسا عمل جس کا مقصد نسلِ انسانی کے سلسلے کو ختم کرنا یا محدود کرنا ہو تو اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف اور ناجائز ہے۔

۲۔بطور فیشن خاندان کو مختصر رکھنے یا تجارت و ملازمت کی مشغولیتوں کے متاثر ہونے یا سماجی دلچسپیوں میں رکاوٹ پیدا ہونے کی وجہ سے اولاد کی ذمہ داری سے انکار و گریز کو اسلامی شریعت کسی حال میں قبول نہیں کرسکتی۔

۳۔جو بچہ موجود ہے اس کی پرورش، رضاعت اور نشو و نما پر اگر ماں کے جلد حاملہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں مناسب وقفہ قائم رکھنے کی خاطر عارضی مانعِ حمل تدبیریں اختیار کرنا جائز ہے۔

۴۔مردوں کے لیے دائمی منعِ حمل کی تدابیر کسی حال میں درست نہیں ہیں، عورتوں کے لیے صرف اس صورت میں جواز نکل سکتا ہے جب کہ ماہر قابلِ اعتماد ڈاکٹر کی رائے یہ ہو کہ اگلا بچہ پیدا ہونے کی صورت میں عورت کی جان جانے کا خطرہ ہے، یا کسی عضو کے تلف ہونے کا غالب گمان ہے۔ایسی صورت میں استقرارِ حمل سے بچنے کے لیے عورت کا آپریشن کرا لینا جائز ہے۔

۵۔عام حالات میں عارضی منعِ حمل کی تدابیر اور دواؤں کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔

۶۔استثنائی صورتوں میں عارضی منعِ حمل کی تدابیر اور دواؤں کا استعمال مردوں اور عورتوں کے لیے درست ہے۔مثال کے طور پر عورت بہت کمزور ہے، ماہر ڈاکٹروں کی رائے میں وہ حمل کی متحمل نہیں ہوسکتی، حمل ہونے سے اسے شدید ضرر لاحق ہونے کا قوی اندیشہ ہو، اسی طرح ماہر ڈاکٹروں کی رائے ہیں عورت کو ولادت کی صورت میں ناقابلِ برداشت تکلیفوں اور

ضرر میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو ان حالات میں عارضی منع حمل تدابیر اور دواؤں کا استعمال درست ہوگا۔

سیمنار میں بڑی تعداد میں اہلِ علم نے شرکت کی۔ ان میں مستند دینی اداروں سے وابستہ ماہرینِ فقہ اور علومِ دینیہ بھی تھے، جدید علوم کے ماہرین بھی تھے۔ سیمنار میں اظہارِ رائے کی مکمل آزادی تھی، چنانچہ پوری آزادی کے ساتھ غور و فکر اور بحث و نظر کے بعد شرکائے سیمنار نے مذکورہ بالا تجویزیں منظور کیں۔

تعلیمی کانفرنس:

انجمن شبابِ اسلام مسلم طلبہ کی ایک نئی تنظیم ہے، اس کی بنیاد ستمبر ۱۹۷۴ء میں پڑی، آغاز میں محدود پیمانے پر تعلیمی، تربیتی اور ثقافتی پروگرام ہوئے، رفتہ رفتہ اس کے میدانِ کار میں وسعت پیدا ہوتی گئی، قیام کے دس سال بعد اس کی سرگرمیوں میں خاصی تیزی آگئی، آج ہندوستان میں کوئی نامانوس نام نہیں رہ گیا ہے، ملک کے مختلف حصوں میں اس کے سرگرم کارکن موجود ہیں، ان میں مدارس کے طلبہ بھی ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اسٹوڈنٹس بھی۔ اس تنظیم کے ذریعہ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھتے، سمجھتے اور سیکھتے ہیں، اس طرح قدیم و جدید کے درمیان فاصلے کم کرنے میں مدد ملتی ہے، ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کے درمیان اپنائیت اور بھائی چارگی کا احساس فروغ پاتا ہے۔ مولانا سید سلمان حسینی ندوی اس تنظیم کے بانی، صدر، اور روح رواں ہیں، یہ خود فعال، سرگرم اور جذبۂ عمل سے سرشار ہیں، اور دوسروں کے اندر بھی یہی اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں، چراغ سے چراغ جلتا ہے، دوسرے نوجوان بھی ان کے جذبۂ عمل سے متاثر ہوتے ہیں، ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ دین کی خدمت کے لیے آگے بڑھنے کی فکر و جستجو کرتے ہیں، اس طرح ان کی شخصیت اور ان کی تنظیم سے متاثر ہونے والوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی ہے۔

اسی انجمن شبابِ اسلام کے زیر اہتمام ۹، ۱۰ اور ۱۱ رجون کی تاریخوں میں "مدارس دینیہ اور مسلم کالجز، موجودہ ہندوستان میں کیا رول ادا کر سکتے ہیں" کے عنوان سے مدرسہ فلاح دارین

بلاسپور ضلع مظفر نگر میں ایک سہ روزہ تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں مختلف مدارس کے طلبہ کے علاوہ ماہرینِ تعلیم، علماء کرام اور ممتاز دینی شخصیتوں نے شرکت کی، اس کانفرنس میں بعض ایسی شخصیتوں نے بھی شرکت فرمائی جو صرف تعلیمی اور دینی سرگرمیوں تک اپنے کو محدود رکھتی ہیں۔ جلسہ، جلوس اور ہنگامہ ہائے و ہو سے کنارہ کش رہتی ہیں بطور مثال مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، اور مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی کے اسمائے گرامی پیش کیے جاسکتے ہیں۔

کانفرنس میں متعدد نشستیں ہوئیں، اجلاس عام میں اطراف وجوانب کے مسلمانوں نے بھاری تعداد میں شرکت کی، صدر انجمن مولانا سید سلمان صاحب حسینی ندوی کے علاوہ متعدد علماء کرام کی تقریریں ہوئیں۔ جلسۂ عام میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہٗ نے دین کے بارے میں غیرتِ صدیقی کو موضوع بنایا انھوں نے کہا کہ آج کے ہمارے سارے مسائل کا حل اسی غیرت وحمیت کے احیاء میں پنہاں ہے، اگر ہمارے اندر دینی غیرت کی چنگاری موجود ہے تو سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں اور تمام دشواریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

مولانا ندوی نے اپنی تقریر میں فرمایا تاریخ میں حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا ایک ایسا جملہ نقل کیا گیا ہے، جس نے حالات کا رُخ موڑ دیا، کایا پلٹ دی۔ وہ جملہ یہ ہے: "أینقص الدین و أنا حی" (کیا میرے جیتے جی دین میں قطع و برید کی جائے گی)۔ دین کے بارے میں یہی غیرت تھی جس نے جیشِ اُسامہ کا سفر جاری رکھنے پر اصرار کیا، جب کہ ناسازگار حالات کے سبب صحابہ کرام کی ایک جماعت اس کو ملتوی کرنے کے حق میں تھی، یہی وہ حمیت تھی جس نے مانعینِ زکوٰۃ سے قتال پر آمادہ کیا جب کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) جیسے جلیل القدر صحابی کو اس اقدام کے بارے میں تذبذب تھا، دینِ حنیف کے بقا وتحفظ میں اس غیرت وحمیت کو بڑا دخل ہے۔

مولانا ندوی نے شرکاء اجلاس پر زور دیا کہ وہ اسی غیرت وحمیت کی سوغات لے کر اپنے گھروں کو واپس جائیں، اپنے گھروں کو دین کے قلعے میں بدل دیں جہاں شب و روز دین کا چرچا ہو، اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا خود اہتمام کریں اور اس مقصد کے لیے گاؤں گاؤں دینی مکاتب کے جال بچھا دیں، مدارس دینیہ کے فارغین کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا ندوی نے فرمایا کہ وہ یہاں سے یہ عزم کرکے اٹھیں کہ انھیں دین کی حفاظت کا فریضہ انجام دینا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ غیرتِ صدیقی ہی ہمارے

لیے باعزت زندگی کا ضامن بن سکتی ہے۔

مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری، اور مولانا عبداللہ صاحب اجراڑوی نے بھی جلسہ کو خطاب کیا، بنگلہ دیش کے معزز مہمان اور رابطہ ادب اسلامی کے رکن مولانا محمد سلطان ذوق نے ایک جلسہ کی صدارت کی۔ ایک نشست کی صدارت مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی نے فرمائی، خطبۂ استقبالیہ مولانا راشد کاندھلوی نے پڑھا۔ تقریروں اور مقالات کی نشستوں کے علاوہ مختلف اداروں سے آئے ہوئے طلبہ کے درمیان تقریری اور تحریری مقابلے ہوئے، ورزش کا مظاہرہ بھی ہوا۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ انعامات سے نوازے گئے۔ مندوبین اور مہمانوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد تھی۔

تیونس میں اسلامی بیداری:

تیونس سے آمدہ خبروں کے مطابق موجودہ صدر زین العابدین بن علی نے اعلان کیا ہے کہ وہ جمہوریہ تیونس کے مختلف صوبوں میں حفظ قرآن مجید کا مقابلہ کرانے اور کامیاب حفاظ کو گرانقدر انعام دینے کا عزم رکھتے ہیں، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ قیروان یونی ورسٹی کے اسلامک ریسرچ سنٹر کے زیر اہتمام اسلامی موضوعات پر سالانہ سمینار منعقد کرائیں گے۔ ماہ رمضان مبارک میں مختلف دینی موضوعات پر تقریریں ہوئیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بھی دینی موضوعات کو جگہ ملی، اس طرح تیونس کے عوام نے خوشگوار تبدیلی محسوس کی، یہ تبدیلیاں اس امر کی غماز ہیں کہ تیونس کے موجودہ صدر اسلام سے وحشت محسوس نہیں کرتے، بلکہ وہ ملک میں اسلامی ثقافت کو فروغ دینے کے خواہشمند ہیں۔ حفاظ کا مقابلہ بھی اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ملک میں حفظ قرآن پاک کی تعلیم عام کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی اطلاع کے مطابق حفاظ کے مقابلے بھی منعقد ہوئے اور اسلامی موضوعات پر سمینار بھی ہوئے ہیں، اس پر شیخ ابن باز نے تیونس کے موجودہ صدر کو مبارکباد دی ہے۔

تیونس کا اسلام پسند طبقہ جو ملک میں اسلام کی حکمرانی دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشاں ہے اور اس مقصد کے لیے طویل عرصہ سے قربانیاں دے رہا ہے، موجودہ صدر زین العابدین بن علی کے رویہ سے ایک حد تک مطمئن ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رو حبیب بورقیبہ کے برعکس اسلام کو

"پابند آزادی" دے رکھی ہے۔"پابند آزادی اس معنیٰ میں کہ لوگ گھروں اور مسجدوں میں اسلام کی تعلیمات پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں، حفظِ قرآن کے مقابلے منعقد کرا سکتے ہیں، اسلامی موضوعات پر سیمینار بھی کر سکتے ہیں لیکن نظامِ حکومت میں اسلام کو داخلے کی ہنوز اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ موجودہ صدر نے بھی صاف اعلان کیا ہے کہ دین کے نام پر کوئی پارٹی نہیں بن سکتی ہے۔ ملک کا نظام اسلامی نہیں ہوگا، بلکہ بدستور جمہوری رہے گا۔

اسلام پسندوں کے اطمینان کی وجہ یہ ہے کہ طویل قید و بند کی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد موجودہ صدر کے عہد میں انھیں رہائی نصیب ہوئی ہے، انھیں آرام و راحت کی سانس لینے، اور اپنے بکھرے شیرازہ کو اکٹھا کرنے کا موقع ملا ہے، چنانچہ انھوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اسلام کے نام پر کوئی پارٹی تشکیل دینے کے بجائے حركة النهضة "تحریک بیداری" کے نام سے ایک جمعیت قائم کی ہے۔ کاروبارِ حکومت میں چونکہ بورقیبہ کے سیاہ دور کے لوگ پورے طور پر دخیل ہیں اس اس لیے مستقبل کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ سابق صدر حبیب بورقیبہ کا طویل دور تیونس کے مسلمانوں کے لیے سیاہ ترین دور تھا، اس پورے عرصے میں ملک کو مغرب کے قالب میں ڈھالنے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مٹانے کے لیے سارے وسائل استعمال ہوتے رہے، اسلام پسندوں پر قیامت گزر گئی، کون سی اذیت ہے جو ان کے لیے روا نہ رکھی گئی، بالآخر ان کی آہوں میں تاثیر پیدا ہوئی اور ۷ر نومبر ۱۹۸۷ء کو زین العابدین بن علی کی صدارت کی نئی صبح طلوع ہوئی۔ خدا کرے اسلام پسندوں کے لیے یہ صبح سازگار ثابت ہو، اور تیونس میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا دوبارہ فروغ ہو۔

کانفرنس برائے سدِّ باب نشہ آور اشیاء:

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ اور بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے مشترکہ تعاون سے ایک سہ روزہ کانفرنس اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ جس میں رابطہ کے جنرل سکریٹری اور پاکستان کے صدر نے شرکت کی۔ شرکاءِ اجلاس دانشوروں نے منشیات کے سدِّ باب کے لیے مختلف زاویوں سے بحث کی، اور یہ تجویز پاس کی گئی کہ تمام مسلم ممالک کو اس کی روک تھام کے لیے آمادہ کیا جائے۔ تفصیلی خبریں اخبارات میں آچکی ہیں۔

ماهنامہ

ذکر و فکر

دہلی

جلد نمبر (۶) محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

شمارہ نمبر (۵) ستمبر ۱۹۸۹ء

ترتیب

افتتاحیہ
مقالات
جائزے
تحقیقات
اور
ادبیات

۱۔ مذاکرات — مولانا عبداللہ عباس ندوی ۲
۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقریت — پروفیسر حبیب الحق ندوی ۸
۳۔ امیر سید عبدالقادر حسنی الجزائری — مولانا نذر الحفیظ ندوی ۲۲
۴۔ روس اور چین میں زندگی کی لہر — سید غلام محی الدین ۳۰
۵۔ مولوی نورالحسن نیر کاکوروی — مولوی عزیز الرحمن علیم ۴۰
۶۔ عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں — مولانا شفیق الرحمن ندوی ۵۰

مولانا عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

اہلِ مغرب کی اسلام سے عداوت اور ان کا مسلمانوں سے بُغض کوئی آج کی بات نہیں ہے، برسہا برس کیا صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ چل رہا ہے، لیکن دو باتیں ایسی ہیں جو سطحی طور پر دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ ان اقوام یورپ نے مسلمانوں سے انتقام لینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، انڈونیشیا میں ڈچ حکمرانوں نے، ملایا اور برصغیر میں انگریزوں نے، اور مغرب اقصیٰ میں فرنچ نے اور شرق اوسط میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس تینوں نے اسرائیل کو مسلّط کر کے جو نہتے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے ہیں ان میں ایک ایک واقعہ ایسا ہے جس کو بلا کسی ادنیٰ مبالغہ کے، اور بغیر کسی مجاز و استعارہ کے بیان کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی وہی حالت تھی جو کسی مُردہ مخلوق کی ممکن ہے جو گدھوں اور درندوں کے درمیان پڑ گیا ہو۔ آج جنوبی افریقہ اور مڈغاسکر میں ایسے مسلمان موجود ہیں جن کے آباء و اجداد کو ملیشیا سے لاکر عمر قید کی سزا دی گئی تھی جن کا جرم یہ تھا کہ وہ اپنی زمین پر اُگنے والے درختوں سے پیدا شدہ روئی کے چند تولے ان کی مرضی کے بغیر حاصل کر لیتے تھے، اور برصغیر میں خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل تو کیا اجمالی ذکر بھی ایسا ہے کہ :

آسماں را حق بود گر خوں ببفشاید بر زمیں

فلسطینیوں پر چالیس سال سے جو مسلسل آگ برسائی جا رہی ہے، کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ لیکن ان تمام چیرہ دستیوں کے باوجود آج تک ان کی آتشِ انتقام ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔ جولائی کے شمارہ میں ان کی اکیڈمی سازش کا ایک منظر اٹھایا گیا تھا کہنے کو تو مسلمان ایک حقیر قوم ہیں، ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور جہاں ہیں باہم برسرپیکار ہیں۔ مغرب اقصیٰ سے لے کر انڈونیشیا کے آخری جزیرے تک کہیں اقتصادی طور پر آزاد نہیں ہیں، سیاسی طور پر انہی اقوام کے دریوزہ گر ہیں۔ علمی و ثقافتی دنیا میں انہی

کی ایجادات کو عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں، انہی کی زبان بولنے پر فخر کرتے ہیں، انہی کی معاشرت تہذیب کی علامت سمجھتے ہیں۔ ایسی شکست خوردہ قوم سے انتقام کس بات کا اور کب تک ہے۔ تسخیر فضا کے مدعی چاند پر کمند ڈالنے والے چند انسانوں کو زمین پر اپنی مرضی سے چلنے کی آزادی کیوں نہیں دینا چاہتے؟

ایک بات تو یہی ہے جو نا قابلِ فہم ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کے وہ دانشور و محققین جن کی علمی تحقیقات کا میدان مشرق ہے اور جن کو اورنٹیلسٹ یا مستشرق کہا جاتا ہے۔ مشرق کے دوسرے مذاہب بودھ مت، شنتو، آتش پرست، بت پرستوں کے مذاہب کا مجموعہ جس کو ہندو مت کہا جاتا ہے، ان سب پر بحث کیوں نہیں کرتے۔ برائے نام شعبے ان مذاہب کے مطالعہ اور ان کی ادبیات کی تحقیق کے لیے قائم ہیں، مگر ان شعبوں میں جا کر دیکھیے، چند تصویر بتاں، چند قدیم ویدا اور دیومالاؤں کے نسخے، چند سنسکرت میں لکھے ہوئے کتبے، کچھ پتھر کے ٹکڑے یا مختلف لباسوں اور پیراہنوں کے نمونے، اور اس کے آگے صفر۔

دوسری طرف اسلامیات کا مضمون دیکھیے، تیرہویں صدی عیسوی سے لے کر اس بیسویں صدی تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب قرآن کریم کا ایک نیا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ پروفیسر محمد حمید اللہ صاحب (سابق پروفیسر اسلامیات، استنبول یونیورسٹی، مقیم پیرس) کے فرانسیسی ترجمۂ قرآن کریم کے مقدمہ میں ان ترجموں کی فہرست ہے جو یورپین زبانوں میں اب تک ہوئے ہیں، مشرقی و مغربی یورپ کا کوئی ایک ملک ایسا نہیں ہے جس میں ایک سے زیادہ ترجمۂ قرآن موجود نہ ہو۔ انگریزی میں اٹھہتر ترجمے، فرنچ میں بہتّر ترجمے، جرمن میں ۵۵ ترجمے، اطالوی میں ۲۱ ترجمے ہو چکے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کسی ایک ترجمہ سے ان کی تشفی نہیں ہوتی، سیرت نبویؐ پر بہتیری کتابیں نئے نئے عنوانات کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اڈنبرہ یونیورسٹی میں قرآن کریم پر کام کرنے والوں کے لیے اسکالرشپ اب بھی دیا جاتا ہے بشرطیکہ ان کی تحقیق کی ابتدا اس سے ہو کہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصنیف ہے۔

لیڈز یونیورسٹی میں جہاں راقم نے چند سال گزارے ہیں وہاں سامی (SEMITIC) ادبیات کا شعبہ ہے۔ ان زبانوں میں سریانی، عبرانی، حبشی اور مختلف زبانیں ہیں۔ عبرانی پر تو خیر دو ایک حاخام کام کرتے دکھائی دیے کیونکہ انہی کا قائم کردہ شعبہ ہے مگر سریانی، آرامک، حبشی پر

ایک مقالہ بھی مرتب نہیں، اور عربی پر کام کرنے والوں کے رسالوں سے الماری بھری پڑی ہے۔

قرآن کریم اور سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو ان مستشرقین کا تختۂ مشق ہمیشہ سے رہا ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سیرت پر مختلف بیہودہ عناوین کے ساتھ اپنی 'معاندانہ تحقیقات' شائع کرتے رہتے ہیں۔

ایک اور حربہ یہ استعمال کرتے ہیں کہ سیرت نبویؐ پر ایسی کتاب لکھتے ہیں جیسے معلوم ہو بڑے انصاف پسند ہیں، لکھنے کا انداز معروضی ہے، مگر آخر میں قرآن کے متعلق ایسا جملہ لکھ دیں گے جس سے تمام اعترافات پر پانی پھر جائے، دراصل ان کا مقصد صرف قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کی تردید کرنا ہوتا ہے، اور سیرت کا عنوان اور اعتراف کا انداز سب ایک فن کارانہ سازش ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس انداز میں یا اُس انداز میں کوئی زمانہ خالی نہیں جاتا جب ان کی تحقیقی کاوش اسلام پر حملہ آور نہ ہو۔ حال میں مانٹ گمری واٹ (استاد اسلامیات اڈنبرہ یونیورسٹی اور مصنف 'محمد ایٹ مکہ'، 'محمد ایٹ مدینہ'، وحدت اسلامی، غزالی وغیرہ) نے ایرانی انقلاب، افغانستان کے جہاد، اور اسلامی شعور کی بیداری (الصحوۃ الاسلامیۃ) کا جائزہ پیش کیا ہے۔

یہ دو عجوبہ قسم کی باتیں ایک تو اسلام کو ناقابلِ التفات، نوزائیدہ مذہب اور قرآن کو معاذ اللہ "چند سُنی سنائی باتوں کا غیر مرتب مجموعہ" کہتے ہیں اور اس کے باوجود صدیوں سے اس کی تشریح و تفسیر کرتے جا رہے ہیں، یہ سیکڑوں ترجمے ان کے لیے ناکافی ہیں، مزید کی کوشش جاری ہے۔

دوسرا عجوبہ یہ کہ اسلام میں جاذبیت کے قائل نہیں ہیں۔ ایک بات کو صدیوں سے رٹ رہے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ تو سوال یہ ہے کہ اب تو مسلمانوں کے ہاتھوں میں شمشیر کیا چھری بھی نہیں ہے، اب تو اس کے خلاف سازش سے باز آجاتے۔ کبھی براہ راست نام لے کر گالی دیتے ہیں، کبھی علم و فلسفہ کی آڑ میں آکر وار کرتے ہیں۔ عیسائیت کی تبلیغ میں کروڑوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں۔ تعلیم، دوا، غذا، جنس، ہر قسم کے ہتھیار سے دیہاتوں اور شہروں میں، افریقہ

کے جنگلوں میں اپنے چرچ بنا رہے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے، کیا اس کی ضرورت ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کے درپئے آزار ہوں ؟

کبھی آپ نے سُنا کہ ان مشنری کے سورماؤں نے بودھ مت کی مذمت کی ہو شنٹو پر حملہ آور ہوئے ہوں، کسی آریائی مذہب یا کسی بُت پرست مذہب کی تردید کی ہو۔ ؟

اس متضاد صورت حال کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دراصل عیسائیت کے پاس دنیا کے لیے نہ پہلے کوئی پیغام تھا اور نہ اب ہے۔ چند بُجھی بُجھی مدھم روشنی کی کرنیں پورے مجموعۂ اصلاحات وکفارات میں نظر آتی ہیں، جو عقل سلیم کو مطمئن نہیں کرسکتیں۔ عقل سلیم الگ رہی عام انسانی عقل کو بھی اپیل نہیں کرتیں، خود یورپین نوجوان بائبل کو "پریوں اور جنوں کی کہانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دوسری طرف اسلام کا معاملہ ہے کہ قرآن اور سیرت نبویؐ میں وہ مقناطیسی قوت ہے کہ جو کام یہ مشنریاں پچاس برس میں نہیں کرسکتیں اس کو ایک داعئ دین چند دنوں میں انجام دے دیتا ہے۔

ایتھوپیا ایک خالص کرسچین ملک ہے، ہیلا سلاسی کے وقت میں یہی ایک ملک تھا جس کی بنیاد میں عیسائیت کی پرورش، تبلیغ داخل تھی۔ وہاں ایک شہر عدیس ابابا میں پچاس مشنریاں کام کرتی تھیں۔ حکومت کی سرپرستی، مشنریوں کی دولت، اور تربیت یافتہ نوجوان لڑکیاں، اپنے رفقائے کار کے ساتھ ان گاؤں اور قصبوں میں پھیل جاتیں جہاں موٹر یا لاری کا راستہ بھی نہیں ہے۔ کئی میل کچے اور ناہموار راستوں پر پیدل چل کر کوڑھیوں کا علاج کرتیں، ان کے زخم دھوتیں، مرہم پٹی کرتیں، ان کے لڑکوں کو مٹھائیاں، کھلونے اور گیند دیتیں۔ نوجوانوں کو اپنے ساتھ لاکر تربیت کا نظم کرتیں، چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے اور بھوک سے سسکتے ہوئے جوانوں کو کوٹ پینٹ، سفید قمیص اور ٹائی باندھ کر انگریزی، فرنچ، اٹالین زبانیں سکھاتیں، مگر جب یہ نومذہب ہوش سنبھالتے تو اپنے کو تیسرے درجہ کا عیسائی پاتے، یہ کالے ہیں ان کی قبریں کالوں کے قبرستان میں ہونگی، یہ گوروں کے چرچ میں نہیں جاسکتے اور ان کو پتہ چلتا کہ کالوں کی ہولی فیملی الگ ہے اور گوروں کی

ثالوث دوسرے ہیں۔ وہاں اسلام کے نام لیوا چند مہینوں میں عام پبلک کو مسلمان کردیتے، صرف اصولِ مساوات ہی کے جاننے اور برتنے کے بعد لوگ عیسائیت سے تائب ہوکر اسلام کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔

محمد علی اہری عدیس ابابا کے رہنے والے ہیں، ایک زمانہ میں ایتھوپیا کے سفارت خانہ جدہ میں سکنڈ سکریٹری تھے، ازہر میں تعلیم حاصل کی ہے، ان کی کتاب "الاسلام فی ایثوبیا" دار الشعب مصر نے شائع کی ہے اس میں متعدد واقعات ایسے لکھے ہیں کہ مشنریوں کی برسہا برس کی کوششوں پر مسلمان داعیوں نے پانی پھیر دیا۔

مسیحی مبلغ اس وقت تک تیر چلاتے رہتے ہیں جب تک کہ تاریکی قائم ہے، لیکن آفتاب کی کرنوں کے نکلنے کے بعد ان کے پیر نہیں جم سکتے، یہی وہ حقیقت ہے جس کو ان مشنریوں نے پا لیا ہے۔

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر محمد وزیر خانؒ نے برطانوی استبداد کے زمانہ میں عیسائیت کو پنپنے نہیں دیا۔

ایک شخص بھی جب عیسائیت کا مطالعہ کرکے سامنے آجاتا ہے تو ان کی برسہا برس کی کاوشوں پر پانی پھیر دیتا ہے، جیسے آج کل ایک افریقی مسلمان ڈاکٹر احمد دیدات نے ان مشنریوں کے مبلغین کی نیند اڑا رکھی ہے۔

اس حقیقت کے پس منظر میں جب اقوام یورپ کی اسلام دشمنی کا جائزہ لیا جائے تو پھر کوئی بات عجوبہ یا باعث حیرت نہیں رہ جاتی۔

'ذکر و فکر' کی یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ سے ان علماء و مصلحین کا تعارف کرائے جو بہ یک وقت تسبیح و سیف کے جامع رہے ہیں، جنھوں نے اپنی علمی و روحانی تربیت سے خلق خدا کو فیض پہنچایا اور جب جہاد کا وقت آیا تو اس میں قائدانہ کردار ادا کیا۔

اندرون برصغیر میں ایسی باکمال شخصیتیں کم نہیں ہیں۔ حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل

شہیدؒ، مولانا عبدالحئیؒ، مولانا ولایت علیؒ سے لے کر مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیرت و کارنامے جن سے یہاں کے مسلمان واقف ہیں اور جو واقف نہیں ہیں ان کے لیے کتابوں کے کافی ذخیرے موجود ہیں۔ لیکن اسی طرح کی وہ شخصیات جو عرب ممالک میں اُبھریں اور جنھوں نے ملکوں کو آزاد کرانے میں حصہ لیا اور دوسری جانب حلقہ درس و تربیت میں بھی اعلیٰ خدمات انجام دیں، ان کی سیرتوں سے کم لوگ واقف ہیں اور ان کے حالات اور کارناموں کو اردو میں منتقل بھی نہیں کیا گیا ہے۔

اس لیے پہلے مغرب اقصیٰ کی تین عظیم شخصیات کے دینی و جہادی کارناموں کو پیش کرنے کا خاکہ بنایا گیا۔ سیدی احمد الشریف السنوسی اور عبدالکریم الخطابی کے حالات گزشتہ شماروں میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ اس شمارہ میں امیر عبدالقادر الجزائری کے حالات پیش کیے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ کو ہماری فرمائش پر مولانا نذر الحفیظ ندوی (ایم اے قاہرہ یونیورسٹی) استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مرتب کیا ہے، ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی

مولانا ابو الکلام آزاد کی عبقریت

۱۸۸۸ — ۱۹۵۸

پیش لفظ:

کسی قوم و ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی، بقول حضرت امام غزالیؒ یہ ہے کہ اس کے دانشور ناقدری کا شکار ہوں اور ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوں۔ دانشور ہی ملک و قوم کی فکری دولت ہوتے ہیں اور ان کی دانش، علم و ہنر ہی قوم کو جاوداں سانچہ میں ڈھالتی ہے۔ تاریخ کے صفحات سے کتنی قومیں کالعدم ہوگئیں جنھوں نے اپنے دانشوروں کے ساتھ ناانصافی کی۔ آج یونان کے دولت مندوں کو کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے مفکرین اور دانشوران مثلاً ارسطو یا پلیٹو وغیرہ مغربی فکر و فلسفہ کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی دانش گاہ ایسی نہیں ہے جہاں ان کی تالیفات شریک نصاب نہیں۔ یونان کا نام صرف علم و دانش کی بدولت زندہ ہے۔ یہی حال قدیم مصر، چین اور ایران وغیرہ ممالک کا ہے، جو تاریخ کے صفحات پر ہنوز اپنے فکر و فلسفہ کی وجہ سے زندہ ہیں۔ شرق اوسط کے مسلم ممالک بھی آج امام غزالی، رومی، عبدالقادر جیلانی، ابن عربی، ابن تیمیہ جیسے دارائے علم و فضل کی وجہ سے نامور ہیں، ابن رشد، فارابی، ابن سینا نے امت مسلمہ کو علمی دولت سے نوازا۔ رازی، ابن خلدون، ابن بطوطہ، اقبال، شاہ ولی اللہ جیسے درجنوں نام زبان زد عام و خاص ہیں۔ اس کے برخلاف حکمرانوں کے نام، بڑے بڑے مالداروں کے نام، وقت اور زمانہ کے ساتھ مٹ گئے۔ انھیں نہ کوئی یاد کرتا ہے نہ ہی ان کو جاننے اور پہچاننے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔

آج دنیا کے اکثر ممالک میں، خاص کر مشرقی ممالک میں، علم و دانش کی عام ناقدری ہے، یہاں

ہر شے کی قیمت ہے، لیکن علم و دانش کی قیمت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک میں تحقیق و ریسرچ، علم و دانش پر سب سے زیادہ رقمیں جرمن قوم صرف کرتی ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ دو عالمی جنگوں میں شکست خوردگی کے باوجود آناً فاناً یہ قوم پھر صفحۂ ہستی پر جواں سال قوم کی طرح کھڑی ہو کر تیز گام ہوگئی۔ ان دنوں امریکہ اور روس رقیبانہ ریسرچ و تحقیق پر بڑی بڑی رقمیں صرف کر رہے ہیں، اور دنیا کے ہر ملک سے اعلیٰ ذہین دانشوروں کو اونچی اونچی تنخواہوں پر اپنے ہاں ملازمت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اسی کا نام برین ڈرین (BRAIN DRAIN) پڑ گیا ہے۔ مشرقی ممالک کی علمی ناقدری کی وجہ سے ان کے اعلیٰ اور ذہین مفکرین مغربی ممالک جا کر تحقیق و ریسرچ کر رہے ہیں، ان کی فکری دولت سے غیر اقوام مستفید ہو رہی ہیں اور خود اپنی قومیں محرومی کا شکار ہیں۔

آزادیٔ ہند کے بعد جدید ہندوستان نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ ایک المیہ کے مترادف ہے۔ ایک طرف مسلم تاریخ کو مسخ کرنے کی تحریک چل رہی ہے، مسلم حکمرانوں کو ظالم، جابر اور قاہر قرار دے کر ان کے کردار کو سیاہ کرنے کی کوشش جاری ہے۔ تعلیمی اداروں کے نصاب میں یہ زہریلا مواد گھول گھول کر طلبا کو پلایا جا رہا ہے اور "مسلم ہند کی ہزار سالہ اسلامی تاریخ" کو مٹانے کی سعی جاری ہے۔ مسلمانوں کو بیرونی حملہ آور قرار دے کر غیر ملکی قرار دیا جا رہا ہے، یہ سارا عمل ملکی سالمیت کے لیے سرطان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح آزادیٔ ہند کے مسلم سرفروشانِ راہ حریت کے عظیم قائدین کے کردار کو مسخ کرنے کی مہم جاری ہے۔ ان کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیاں ہو رہی ہیں، ان کی نیتوں پر شبہات اور اخلاص پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع ابلاغ عامہ کو بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی، صحافت، سینما سب کردارکشی میں علی قدر مراتب شریک ہیں۔

امام الہند مولانا آزاد کے ۳۰ صفحات کی اشاعت اور مناظرات کا آغاز:

امام الہند مولانا آزاد اُن عبقری مفکرین میں ہیں جنھوں نے آزادی کی اذان ۱۹۱۲ء میں

ساحل بنگال سے دہلی اور 'الہلال' کے تاریخ ساز اور آتش فشاں اسلوب نے ساحل بنگال سے ساحل سندھ تک آزادی کی آگ بھڑکا دی۔ اُس وقت کسی دوسرے کل ہند قائد کا پتہ تک نہ تھا۔ مولانا آزاد نے زندگی کی تمام لذتوں سے محروم ہوکر اپنی ساری زندگی کو جدوجہد آزادی کے لیے وقف کر دیا اور جیل کی صعوبات سے گزر کر آخر برطانیہ کے چنگل سے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ بتدریج سارا عالم اسلام صلیبی قوتوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ تقسیم ہند کا مسئلہ تاریخ کا سب سے عظیم مسئلہ تھا تقسیم کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ سوال لاینحل تھا۔ مولانا آزاد نے اس کی عقدہ کشائی کی اور تاریخ ہند کو کہر اور تعصب کے گھٹا ٹوپ بادل سے باہر نکال کر ہمیشہ کے لیے صاف فضا میں لا کھڑا کیا۔ تقسیم کا سارا الزام مسلم لیگ اور قائد مسلم لیگ جناح صاحب پر تھا۔ مولانا نے کانگرس کی قیادت کی اور آزادی کی گفت و شنید کے ہر نازک موڑ پر شریک رہے۔ آپ نے اس کی عقدہ کشائی کی اور اپنی کتاب 'INDIA WINS FREEDOM' میں صاف الفاظ میں تحریر فرمایا کہ سردار پٹیل کو تقسیم ہند کا بانی مبانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں گاندھی جی اور نہرو جی بھی برابر کے شریک ہیں ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے موقع پر نہرو جی نے جو غلط موقف اختیار کیا اس نے تقسیم کی راہ ہموار کر دی۔ مسلم لیگ نے اس پلان کو منظور کر لیا تھا، لیکن بمبئی میں نہرو جی کے بیان کے بعد مسلم لیگ بھی اس پلان سے دست کش ہو گئی۔ اس نے ہندوستان کی پوری تاریخ بدل ڈالی۔ مولانا آزاد نے کھلے الفاظ میں لکھا کہ تاریخ اپنا فیصلہ یہی دے گی کہ ہندوستان کی تقسیم مسلم لیگ نے نہیں کانگرس نے کی۔ اس کے ذمہ دار مسٹر جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ سردار پٹیل، نہرو اور گاندھی جی ہیں۔

کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' سے مولانا کی تحریریں نقل کر دی گئی ہیں۔ مولانا کے اس بیان پر ہندوستان میں قیامت برپا ہے، طعن و تشنیع کے علاوہ مولانا کو فرقہ پرست (کمونل)، کند ذہن اور متعصب قرار دیا جا رہا ہے۔

اس بیان کے خلاف مناظرات اور مباحثات کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ سیاسی زعماء، صحافی اور دیگر ہندو مفکرین میں ہلچل مچ گئی۔ اخبارات میں تبصرے آنے لگے۔ ایک دلچسپ بحث چھیڑ دی گئی اور وہ یہ کہ مولانا آزاد انگریزی زبان پر مہارت نہیں رکھتے تھے اور مترجم کتاب ہمایوں کبیر اردو زبان سے ناواقف تھے، لہٰذا مولانا نے کیا کہا اور ہمایوں کبیر نے کیا سمجھا اور کیا لکھا،

غیر محقق ہے اور غیر معتبر بھی۔ التباس اور تشکیک کا یہ پردہ اس عظیم تاریخی حقیقت پر ڈالنے کی کوشش محض اس لیے کی گئی کہ کانگرس کے مجاور گاندھی جی، سردار پٹیل اور پنڈت نہرو پر تقسیم ہند کی ذمہ داری کسی طرح عائد نہ ہو سکے۔ مولانا کی انگریزی دانی اور سیاست فہمی کا اعتراف خود انگریزوں نے کیا۔ ہمایوں کبیر کے انگریزی ترجمے کی مولانا نے نہ صرف ترمیم واصلاح کی بلکہ بعض حصوں پر نظر ثانی بھی کی، جس کا اعتراف ہمایوں کبیر صاحب نے کتاب کے آخر میں کیا ہے۔ کرپس مشن اور کیبنٹ مشن کے ساتھ گفت وشنید میں مولانا کی زبان دانی مسلم ہے۔ کانگرس کی تمام تجاویز جو انگریزی زبان میں مرقوم ہیں، مولانا، صدر کانگرس، کی انگریزی دانی، تدبر، سیاسی بصیرت وعبقریت کی شہادت کے لیے کافی ہیں۔ کرپس سے ملنے والا سب سے پہلا فرد صدر کانگرس مولانا آزاد تھے، کرپس نے اعتراف کیا کہ قائدین ہند میں سب سے زیادہ بیدار مغز، ممتاز اور جینیس قائد مولانا آزاد نظر آئے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف مولانا آزاد کی یادگاریں منائی جاتی ہیں، ان کے نام بھَوَن بنائے جاتے ہیں، یادگار لکچرز دیے جاتے ہیں، ان کی زندگی اور کارناموں پر تالیفات تیار کی جاتی ہیں اور دوسری طرف ان کی نیک نیتی پر حملے کر کے ان کے صاف شفاف کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا ان کو کمونل (communal) ثابت کیا جاتا ہے، مسلم عصبیت سے مغلوب ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ دونوں متضاد عمل ہیں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را (India wins freedom):

مولانا ابو الکلام آزادؒ کی مذکورہ بالا معروف کتاب کا مسودہ ستمبر ۱۹۵۸ء میں پروفیسر ہمایوں کبیر (۱۹۰۶–۱۹۶۹) نے اورینٹ لانگ مین (orient Longman) کے حوالہ برائے اشاعت کیا۔ سات ماہ بعد جب حضرت مولانا کا انتقال ہوا تو ناشرین کو مطلع کیا گیا کہ مسودہ کا مکمل مضمون جو مزید ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے، ۲۲ فروری ۱۹۸۸ء کو مولانا آزاد کی تیسویں برسی کے موقع پر برائے اشاعت حوالہ کیا جائے گا۔ ۳۰ سال بعد حسب وعدہ یہ مسودہ حوالہ نہیں کیا جا سکا اس لیے کہ ان ۳۰ صفحات پر حضرت مولانا کے بعض رشتہ داروں نے دعویٰ کیا اور مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ مقدمہ کی سماعت کلکتہ ہائی کورٹ، دہلی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں شروع ہوئی۔ آخر دہلی ہائی کورٹ

کے جج بی. این کرپال (B.N. Kirpal) نے ۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ کو فیصلہ صادر کیا کہ سودہ کے ۳۰ صفحات جو کلکتہ کی قومی لائبریری نیز نئی دہلی کی قومی archives A۲ میں محفوظ ہیں، ناشرین کے حوالہ برائے طباعت کیے جائیں۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی گئی کہ یہ مضامین من وعن بلاحذف و اضافہ طبع کیے جائیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ ۳۰ صفحات کسی ایک جگہ یا ایک باب سے نہیں تھے جیسا کہ عام خیال تھا۔ بلکہ پوری کتاب کے صفحات، بلکہ جملوں اور پیراگراف سے حذف کیے ہوئے مضامین تھے۔ چونکہ ملک کی سیاسی فضا اس وقت ان حقائق کو سننے کے لیے تیار نہ تھی، اس لیے ان کو اصل متن سے خارج کر دیا گیا تھا۔ کتاب کا حذف شدہ پہلا نسخہ ۱۹۵۹ میں شائع ہوا مکمل سودہ بشمول ۳۰ صفحات ۱۹۸۸ میں شائع ہوا۔ سال بھر کے اندر یہ نسخہ نکل گیا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ میں طبع کرنا پڑا۔

مولانا کی یہ کتاب تاریخ ہند بلکہ تقسیم ہند کے حقائق کو تاریخ کے اجالے میں لے آئی ہے۔ بہت سی خوش فہمیاں خاک میں مل گئیں اور بہت سی حقیقتوں نے کردار کی نقاب کشائی کر ڈالی۔ عام طور پر تقسیم ہند کی ذمہ داری مسلم لیگ یا محمد علی جناح صاحب پر ڈالی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ یہ ذمہ داری مسلم لیگ پر جس قدر ہے اسی قدر کانگرس پر ہے، جس قدر جناح صاحب پر ہے اسی قدر گاندھی جی، سردار پٹیل اور نہرو جی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mount Batten) پر بھی ہے۔ کانگرس کے گاندھی جی، نہرو اور پٹیل کی حقیقت مولانا آزاد نے اس طرح واضح کی ہے کہ، چون بخلوت می روند کارِ دیگر می کنند۔ یا درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا، جو سطح آب پر نہیں آ سکے۔

مولانا آزاد کیبنٹ مشن کی حمایت میں تھے۔ یہ مشن ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ کو دہلی پہنچا۔ اس مشن کا پلان یہ تھا کہ تمام صوبوں کو مکمل آزادی دی جائے اور ایک سنٹر قائم رہے۔ اس طرح تقسیم کو روکا جا سکتا ہے۔ اس پلان کے تحت ہندو مسلم صوبے تقریباً آزاد تھے۔ مولانا رقم طراز ہیں:

> "میرا عقیدہ تھا اور ہے کہ کیبنٹ مشن ہر اعتبار سے بہترین حل تھا۔ مسلم اکثریت کے صوبے مکمل خود مختار تھے۔ مرکز میں بھی ان کی معتدبہ نمائندگی ہو سکے گی۔" (ص ۲۰۰)

اصل کانگرس درحقیقت ایک ہندو مثلث پر مشتمل تھی۔ گاندھی جی، نہرو اور پٹیل، یہ سب تقسیم

کے جانی دشمن تھے۔ لیکن مولانا کی تحلیل و تفریق کے مطابق یہ تینوں مہرے خفیہ مذاکرات کے ذریعہ اس طرح ٹوٹتے گئے کہ مولانا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا اور تشفی بخش حل پیش نظر تھا۔ مگر بدقسمتی سے اسی موقع پر جواہرلال نہرو نے اپنا وہ بدقسمت اعلانیہ کر ڈالا، جس نے سارا نقشہ بدل ڈالا۔ بمبئی کی ایک کانفرنس میں نہرو نے من حیث صدر کانگرس اعلان کر دیا کہ کانگرس نے کسی پلان کو منظور نہیں کیا ہے۔ وہ صرف دستور ساز اسمبلی میں شرکت کے لیے تیار ہوئی ہے۔ اس طرح نہرو نے جناح صاحب کو کیبنٹ مشن پلان سے، قبولیت کے بعد، نکل جانے کا سنہرا موقع فراہم کر ڈالا۔

(ص ۲۰۲)

مولانا آزاد نے نہرو جی کو متنبہ کر دیا کہ تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اگر ہم نے تقسیم کا منصوبہ تسلیم کر لیا۔ تاریخ کا فیصلہ یہی ہوگا کہ تقسیم ہند کی ذمہ دار مسلم لیگ نہیں بلکہ کانگرس ہے۔

(ص ۲۰۲)

مولانا رقمطراز ہیں کہ مجھے اکثر اس بات پر حیرانی ہوتی تھی کہ جواہرلال کس طرح ماونٹ بیٹن کے دام تزویر میں آجاتے تھے۔ وہ با اصول انسان ہونے کے باوجود جذباتی اور ہیجانی بھی تھے۔ اور بہت جلد شخصی اثرات کے تابع ہو جایا کرتے تھے۔ میرے خیال میں نہرو جی کے کردار کی تبدیلی میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا بڑا ہاتھ تھا۔ (ص ۱۹۸) ـــ تاریخ ہند کے دیگر ابطال (ہیرو) کا بھی یہی حال تھا چوں بخلوت می روند کار دیگر می کنند۔

سردار پٹیل بھی تقسیم کے حق میں تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دو رفقاء (یعنی نہرو اور پٹیل) کو بہت سمجھایا کہ وہ کوئی آخری قدم نہ اٹھائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سردار پٹیل تو اس قدر تقسیم کے حق میں تھے کہ وہ تقسیم کے علاوہ کسی اور نقطۂ نظر کو سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ میں نے دو گھنٹے ان کو سمجھایا لیکن لاحاصل رہا۔ (ص ۲۰۰ - ۲۰۱)

مولانا کے خیال میں پٹیل کو تقسیم ہند کا بانی مبانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن سردار پٹیل کو ہمیشہ اخروٹ کا چھلکا (walnut) کہا کرتا تھا، یعنی وہ صرف باہر سے سخت ہے۔ جب چھلکا اتر جاتا ہے تو وہ موم کی طرح نرم ہو جاتا ہے، (جس طرح اخروٹ چھلکے سے باہر آکر نرم ہوتا ہے)۔ ماؤنٹ بیٹن مزاح میں مولانا آزاد سے بعض اوقات کہا کرتا تھا کہ اس نے (ماونٹ بیٹن نے) والنٹ سے بات

کی ہے اور وائسرائے ہر مسئلہ پر اس سے متفق ہو گیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اب صرف گاندھی جی کا سہارا باقی تھا کہ وہ تقسیم کی مخالفت کریں گے۔ سردار پٹیل اور نہرو تو تقسیم کی تائید میں تھے۔ گاندھی جی ہی مولانا کی تنہا امید تھے۔ (ص ۲۰۲)

گاندھی جی نے مولانا سے کہا کہ اگر کانگرس نے تقسیم کا منصوبہ تسلیم کر لیا تو اس کا نفاذ میرے مُردہ جسم پر ہوگا، میں زندگی بھر تقسیم کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے بس میں رہا تو میں ایسا ہونے بھی نہیں دوں گا۔ (ص ۲۰۳)

مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ گاندھی جی خفیہ طور پر ماونٹ بیٹن اور سردار پٹیل سے ملتے رہے، جو مولانا سے مخفی رکھا گیا۔ اس خفیہ گفت و شنید کے بعد جب مولانا گاندھی جی سے ملے تو وہ گاندھی جی کا رویہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب میں گاندھی جی سے ملا تو مجھے زندگی کا سب سے بڑا دھکا (صدمہ) ملا۔ دیکھا کہ گاندھی جی بھی بدل گئے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز اور دُکھ کی بات یہ تھی کہ وہ بھی سردار پٹیل کے دلائل کو دہرانے لگے۔ دو گھنٹہ تک میں نے گاندھی جی کو سمجھایا لیکن بے سود رہا۔ حسرت و مایوسی میں مَیں نے کہا کہ گاندھی جی! اب جب کہ آپ بھی بدل گئے ہیں اور نظریۂ تقسیم کے حامی ہو گئے ہیں تو اب ہندوستان کو عظیم المیہ سے بچانے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ میرے اس تبصرہ پر گاندھی جی خاموش رہے۔ (ص ۲۰۳)

مولانا فرماتے ہیں کہ بس اب گاندھی جی کے کیمپ میں صرف ایک ہی مسئلہ زیر بحث آنے لگا کہ تقسیم کی شکل کیا ہوگی، شب و روز اسی مسئلہ پر مباحثات جاری رہے۔ میں ہمیشہ اسی پر سوچتا رہا کہ آخر گاندھی جی کیوں اس قدر جلد بدل گئے۔ آخر مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ سردار پٹیل کا اثر تھا جن کے خیال میں اب تقسیم کے بغیر کوئی حل ہی نہ تھا۔ (ص ۲۰۴)

تقسیم کا منصوبہ درحقیقت ماؤنٹ بیٹن کی پیداوار تھی، وہ کیبنٹ مشن پلان کی تائید دراصل میں اس لیے نہیں تھا کہ یہ منصوبہ اس کے اپنے دماغ کی پیداوار نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ تاریخ میں اس کا نام زندہ رہے، لوگ کہیں کہ ہندوستان کے مسئلہ کو اسی نے حل کیا۔ اسی لیے اس نے تقسیم کا منصوبہ تیار کیا جو اس کا اپنا منصوبہ تھا۔

مولانا نے کیبنٹ مشن کے پلان کو بچانے کی آخری کوشش کی لیکن جب ستونِ کانگرس

ٹوٹ گئے تو وہ کچھ نہ کر سکے۔ (ص ۲۰۶)

تقسیم ہند کی مخالفت میں مولانا آزاد نے اپنے خیالات کو صفحات ۱۵۰۔۱۵۲ پر بیان کر دیے ہیں جو لائق مطالعہ ہیں۔ اس عبقری کردار نے جو موقف روز اول اپنے لیے منتخب کیا تھا وہی روزِ آخر تک قائم رہا۔

مولانا نے ماؤنٹ بیٹن کے کید و مکر اور سازش کی طرف بار بار اشارات کیے ہیں، جن کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔ مولانا نے بار بار اسے سمجھایا کہ تقسیم کے بعد خون کی ندیاں بہیں گی اور بے گناہ معصوم افراد قتل کیے جائیں گے۔ اس کے جواب میں مکار ماؤنٹ بیٹن ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ میں فوجی ہوں، ایک قطرہ خون بہنے نہیں دوں گا۔ میں فوج استعمال کروں گا۔ (ص ۲۰۷)

مولانا حسرت کے ساتھ اس باب کو ختم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ مکارِ صلیبی کے منصوبہ کے بعد دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خون کے دریا کس طرح بہے اور معصومین کا قتل کس طرح ہوا۔

یہ تھا اس عبقری ذہن کی دوربینی کا نتیجہ جس نے صلیبی نفسیات کو پرکھا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن مشن (صفحات ۱۹۵۔۲۰۷) کے زیرِ عنوان باب پیش نظر رہے۔ آج بنگلہ دیش میں مہاجرین کا جو حشر ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ پس ماندہ پاکستان میں ان کا جو حشر ہو رہا ہے وہ بھی عالم سے مخفی نہیں ہے۔

تاریخ ہند کے اس فیصلہ کن موڑ پر مولانا آزادؒ کے افکار و آرار کی مزید تحقیق و تفتیش کے لیے کتاب مذکور کے دیگر ابواب بھی پیش نظر رہیں۔ مثلاً مولانا کا صدر کانگرس ہونا (۶۴۔۶۹) (Quit India) کا فیصلہ (۸۳۔۹۰)، احمد نگر فورٹ جیل کا المیہ (۹۱۔۱۰۶)، شملہ کانفرنس کی داستان (۱۰۷۔۱۲۵)، برٹش کیبنٹ مشن کی روداد (۱۴۵۔۱۶۰)، تقسیم ہند کا شاخسانہ (۱۶۱۔۱۷۲)، ماؤنٹ بیٹن مشن (۱۹۵۔۲۰۷)، ایک خواب کا خاتمہ (۲۰۸۔۲۲۳) اور منقسم ہندوستان (۲۲۴۔۲۴۲)۔

ان ابواب سے جو بصیرت قاری کو حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسرے تاریخی دستاویزات سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مولانا کی شخصیت تاریخ ساز تھی۔ آپ نے ہند کی تاریخ کو مستقبل کے مؤرخین کی دست درازیوں اور تسخ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ کانگرس

کے معصومین (گاندھی، نہرو اور پٹیل) تقسیم ہند کے اسی طرح ذمہ دار ہیں جس طرح مسلم لیگ ـــ بلکہ تقسیم ہند کا بانی مبانی سردار پٹیل کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد کی دیدہ ور نگاہ: صلیبی عزائم کی پردہ دری:

مولانا آزاد کی نظر ہندوستان کے افق میں محدود نہ تھی، وہ عالمی سطح پر مسلم حکمرانوں اور مسلم ممالک کی بدحالی سے رنجور ہو کر سوچنے پر مجبور ہوئے کہ عالم اسلام کو مجموعی بدحالی سے کس طرح نجات دلائی جائے۔ مولانا کی نظر یورپ کی مسیحی صلیبی طاقتوں پر پڑی جو عالم اسلام پر مسلط تھیں اور سارا عالم اسلام صلیبی طاقتوں کے چنگل میں گرا رہا تھا۔ مولانا کا پورا سیاسی فلسفہ (Political Philosophy) اسی پس منظر میں تیار ہوا۔ برطانیہ، صلیبی جماعت کا امام تھا ـــ جو ہندوستان پر اپنا تسلّط قائم کر کے ترکی اور شرق اوسط کو فنا کرنے کی قسم کھا چکا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں شاہِ انگلینڈ رچارڈ کی شکست کا زخم ہنوز اس کے جسم میں ہرا بھرا تھا۔ اس کے انتقام کی آگ اس کے سینہ میں بھڑک رہی تھی، اس نے ایک طرف ترکوں کو فنا کرنے کی قسم کھائی، دوسری طرف مغلوں کو، جو اصلاً خود ترکی تھے، ہندوستان میں ختم کر ڈالا۔ ترکی نہ صرف عالمی قوت (World Power) تھا، بلکہ عالم اسلام کی قوت کا مظہر بھی تھا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ کی پیشانی پر نہ صرف پہلی جنگ عظیم کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھا بلکہ ۱۹۱۷ کے بالفور منشور یا اعلامیہ کی تڑپتی لکیروں کو بھی پڑھ لیا تھا۔ آپ نے ۱۹۴۸ء میں قیام اسرائیل کا نقشہ بھی دیکھ لیا تھا اور گریٹر اسرائیل (Greater Israel) ـ کے نقشہ (Map) پر مکہ مدینہ سے لے کر خیبر تک کا خاکہ ملاحظہ کیا تھا۔ مولانا کی نگاہ دوربین ۱۹۱۲ء میں دیکھ چکی تھی کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد عالم اسلام کا نقشہ بدل جائے گا۔ اتحادی (برطانیہ فرانس وغیرہ) مڈل ایسٹ کا بٹوارہ کر کے اس کے ٹرسٹی بن جائیں گے اور فلسطین میں اسرائیلی حکومت کو قائم کرنے کی دیرینہ سازش کو بروئے کار لائیں گے۔ ان تمام سازشوں کا لیڈر برطانیہ تھا، جس نے اسلامی عظمت کے نشان ترکی کو مٹانے کی قسم کھائی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں Egypt (مصر) پر قبضہ کرنے کے بعد برطانیہ نے مڈل ایسٹ میں ترکوں کے خلاف عربوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ عُرابی تحریک کو کچل ڈالا۔ (یہ اتحادی سازش حسن البنّا اور سید قطب شہید تک جا پہنچی)۔ لارنس آف عربیہ، جو برطانوی

فوج کا حرام نژاد جاسوس تھا، عربوں کا حلیف بن گیا اور ترکوں کو مٹانے کا پلان تیار کیا۔ عربوں کو آزادی کے سنہرے باغ دکھا کر ترکوں کو مڈل ایسٹ سے اکھاڑ دیا اور ترک فوج کا آخری دستہ جس نے حرم مکہ میں آخری آماجگاہ کی حیثیت سے پناہ لی تھی، برطانوی گولیوں کا نشانہ بنا اور بھون ڈالا گیا۔ اندرون حرم پاسبان حرم شہید کیے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں یہ سارے مناظر مولانا کی نگاہوں کے سامنے تڑپ رہے تھے۔ انہی حوادث کی بازگشت اور چیخیں 'الہلال' کے صفحات پر گونجنے لگیں۔ ایک طرف جنگ بلقان کا مرثیہ تھا تو دوسری طرف تحفظ خلافت عثمانیہ کے نعرے تھے۔ 'الہلال' کا کوئی صفحہ خلافت عثمانیہ کی تائید وحمایت اور برطانیہ یا صلیبی حملہ آوروں کے خلاف نفرت سے خالی نہ تھا۔ مولانا آزاد کا دماغ ان مناظر کو دیکھ کر سلگ رہا تھا۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے ساحل بنگال کا پانی بلکہ بحر ہند کا پانی بھی ناکافی تھا۔

مولانا نے برطانیہ کی کمر توڑنے کی قسم کھائی۔ انھیں یقین تھا کہ ہندوستان سے برطانیہ کے اخراج کے بعد عالم اسلام سے بھی اس کا اخراج آسان ہوجائے گا۔ یہی مولانا کے سیاسی فلسفہ کی اساس بن گیا۔ اس کے لیے انھوں نے ساری عمر وقف کردی۔ مولانا کی جنگ نے ایک مثلث کی شکل اختیار کرلی۔ ایک طرف ہندوستان کی اکثریت (ہندو آبادی) کے ساتھ اشتراک کے ساتھ اخراج برطانیہ کا عزم تھا اور دوسری طرف عرب قوم پرستوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت سے روکنا تھا۔ صلیبی قوتیں عربوں کو آزادی کے سنہرے خواب دکھا رہی تھیں۔ بڑے بڑے کھوکھلے وعدے کرکے عربوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ مولانا نے ان پٹیوں کو کھولنا چاہا اور ان کو حقیقۃ الحقائق دن کی روشنی میں دکھانا چاہا۔ تیسری طرف یورپ کی صلیبی قوتوں کا مقابلہ تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد درحقیقت وہی کچھ ہوا جو مولانا کی نگاہ دوربین نے قبل ازوقت دیکھ لیا تھا۔ فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا اور کمانڈر النبی سیدھا دمشق پہنچ کر صلاح الدین ایوبیؒ کی مزار پر بوٹ سے ٹھوکریں مار مار کر چیخ اٹھا:

"اٹھ صلاح الدین اُٹھ" دیکھ ہم نے اپنے شاہ انگلینڈ رچرڈ کی شکست کا بدلہ لے لیا۔"

برطانیہ نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک خفیہ اور اعلانیہ یہودی آبادی کو فلسطین کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی اور ریاست اسرائیل کی تشکیل کی راہ ہموار کردی۔ آج ساری دنیا نے

دیکھ لیا کہ ملک فلسطین کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور ایک پوری فلسطینی نسل اور قوم کے وجود کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ افغانستان کو ریگستان میں تبدیل کر دیا۔ جنوبی سوڈان اور لبنان میں مسیحی ریاست کے قیام کی سازش تیار کر لی گئی۔ فلپائن اور ایریٹیریا میں مسلمانوں پر عذاب طاری ہے۔

عرب قوم پرستوں کے ساتھ مولانا آزاد کے مراسلات، صلیبی سازشوں پر تنبیہ، عربوں کی مجرمانہ غفلت:

مولانا آزاد کی اسی عالمی بصیرت (world view & vision) کا نتیجہ تھا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ صلیبی عزائم کو شکست دینے اور ترکی کو بچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس کا پہلا زینہ ہندوستان کو آزاد کرانا تھا۔ مولانا نے برطانیہ کو کمزور کرنے اور ترکی کو بچانے کے لیے عرب قوم پرستوں سے گفت و شنید کی۔ یہ واضح رہے کہ ترکی کے سلطان عبدالحمید نے ارض فلسطین پر یہودی آبادکاری سے انکار کر دیا تھا۔ موصوف کا یہ بیان معروف ہے کہ یہودی پورا ترکی لے سکتے ہیں لیکن ارض فلسطین کا ایک انچ بھی ان کے لیے حرام ہے، کیونکہ ارض مقدسہ اسلام اور امت مسلمہ کی امانت ہے۔ اسی ترکی کے خلاف عرب برسرپیکار تھے اور ترک خون کے پیاسے تھے۔ ترکوں کو فنا کر کے اتحادیوں یا صلیبیوں نے جو تحفہ عربوں کو دیا اُسے دنیا نے دیکھ لیا۔ تحفہ، ریاست اسرائیل ہے۔ اس تحفہ کو مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں دیکھ لیا تھا۔ یہ حقیقت مولانا کی بصیرت اور عربوں کی بے بصری پر دلالت کرتی ہے۔ مولانا نے سید رشید رضا کو خط لکھا کہ وہ جنگ کے اس نازک موقع پر برطانیہ کے اشارہ پر ترکوں کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ برطانیہ مسلمانوں کا ازلی دشمن ہے۔ جنگ کے بعد ترکوں کے ساتھ صلح صفائی ہو جائے گی۔ عرب و ترک سب بھائی بھائی ہیں۔ رشید رضا صاحب جو عالم کبیر تصور کیے جاتے تھے، مفسر قرآن، مدیر 'المنار' سلفیہ تحریک کے قائد تھے اور عربوں کی ذہنی، علمی و فکری قیادت کے ذمہ دار بھی۔ محمد عبدہ کے شاگرد رشید، اور محمد عبدہ کی وفات (۱۹۰۵) کے بعد مصری ذہنی قیادت کے دعویدار بھی۔

رشید رضا صاحب نے مولانا آزاد کے خط کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ترکوں سے آزادی حاصل کرنے کا سب سے زیادہ موزوں اور سنہرا موقع یہی تھا۔ مولانا کا خط 'الہلال' مورخہ ۳۰ جون ۱۹۱۳ء (ص ۸۹) پر شائع کیا گیا۔ صفحات ۹۰ سے ۹۵ تک اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ رشید رضا کا جواب

'الہلال' مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء میں (صفحات ۱۲۴ - ۱۲۷) پر شائع کیا گیا۔ اس کی تفصیلات راقم الحروف نے اپنی تالیف فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات (۱۹۵۶) میں (صفحات ۵۹۲ تا ۵۹۶) درج کیا ہے۔ صفحات ۵۹۳ تا ۶۰۱ ہدیۂ ناظرین ہیں۔ کاش رشید رضا زندہ ہوتے تو انھیں ریاست اسرائیل کی سیاحت کرائی جاتی اور عربوں کی بے بسی کا نقشہ دکھایا جاتا۔

عرب و ترک تعلقات 'الہلال' کی روشنی میں:

چونکہ سلاطین ترک عالم اسلام کے خلیفہ تھے اور چونکہ برطانیہ ان کے وجود کو مٹانے کے درپے تھا، (وہی برطانیہ جس نے اسلامی ہند میں روح فرسا مظالم کے ذریعہ مسلم حکمرانوں کے خاندانوں بلکہ مسلم عوام کو تہ تیغ کر کے تخت دہلی پر قبضہ کیا تھا اور جسے اہلِ ہند ہنوز بھولے نہیں تھے) لہٰذا مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں فطرتاً ترکوں کے ساتھ تھیں۔ تین ہم عصر مقبول اور معروف ترین اخبارات ہند، الہلال (کلکتہ)، زمیندار (لاہور) اور کامریڈ (انگریزی) کی ترکوں کے ساتھ ہمدردی اور وابستگی اظہر من الشمس ہے۔ صحافت کے بے مثال نمونے اور شاہکار ادب 'الہلال' کی مدد سے مسلمانانِ ہند کے جذبات و عواطف اور روحانی وابستگی کے چند نمونے ہدیہ ناظرین ہیں۔ محض ایک سال (۱۹۱۳ء) کے اس ہفت وار اردو مجلہ کا مطالعہ مسلم نکتہ نظر کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ پہلی جنگ عظیم سے ایک سال قبل ہم عصر بین الاقوامی سیاست میں ہل چل مچی تھی۔

'الہلال' مورخہ ۳۰ جون ۱۹۱۳ء (ص ۸۹) پر ترک و عرب تعلقات کے زیرِ عنوان ترک موقف پر حسب ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

> "ترک اور عربوں کی باہمی بے لطفی کے متعلق خود ترکوں نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے۔ دولت عباسیہ اور خلافت عربیہ کا خاتمہ تاتاریوں نے ۶۵۶ھ میں کیا۔ اب عرب ایک طوفان بادپیما ہوتے رہے تاکہ اس خاندان تاتار کی یادگار اور آخر میں خلافت اسلامیہ یعنی دولت عثمانیہ کے شیرازہ کو برہم کردے۔ لاقدر اللہ۔"
>
> تفصیلات صفحات ۸۹ - ۹۰ - ۹۵ پر ملاحظہ ہوں۔
>
> یہ مختصر عبارت قضیہ کے ترکی موقف یا نکتہ نظر کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

'الہلال' مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء میں "الترک والعرب" کے زیر عنوان عربی موقف کی

وضاحت میں رشید رضا کے مکتوب سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام رشید رضا نے ایک مفصل خط لکھا جس کا عربی متن اردو ترجمہ کے ساتھ صفحات ۱۲۴-۱۲۷ پر شائع ہوا۔ عرب ترک قضیہ میں مولانا آزاد کے مراسلات عربوں اور ترکوں سے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خیال میں، عربوں کو حق ہے کہ وہ اپنے لیے ترکوں سے مراعات حاصل کریں، اصلاحات اور تبدیلی کا مطالبہ کریں۔ لیکن مطالبہ کا یہ وقت موزوں نہ تھا، جب مسیحی یورپ ترکی کا شیرازہ منتشر کرنے پر مصر تھا، بلقان کی جنگ چل رہی تھی۔ اٹلی اور یونان اس پر چڑھے ہوئے تھے اور دشمن فاسد بطانیہ ترکی کے گلے پر سوار تھا....

اس کے برخلاف عرب موقف کے مطابق پریشان حال ترکی سے حقوق تسلیم کروانے کا مناسب ترین وقت یہی تھا۔

مولانا آزاد کے نام رشید رضا کا خط ملاحظہ ہو:

"....مسئلہ بیداری عرب کے متعلق آپ کی رائے معلوم ہوئی۔ آپ کے خیال میں عجلت کی ضرورت نہیں، تامل درکار ہے۔ یورپ کے بھوت سے خوف لازم ہے ——— یہ خیال کہ اہل عرب، ترکی کی حالت سے واقف نہیں۔ اس لیے درست ہے کہ اہلِ ہند عربوں کی حالت سے واقف نہیں۔"

مراسلہ کا لب لباب شق ۳ میں ملاحظہ ہو:

"....رہی یہ بات کہ یورپ کے خوف سے اہل عرب کو اپنے مطالبات میں جلدی نہ کرنی چاہیے، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم کہیں کہ یورپ کے خوف سے اہلِ عرب کو مطالبہ اصلاح میں جلدی کرنی چاہیے تو یہ زیادہ موزوں ہوگا...."

اس عجلت پسندی کا جو حشر ہوا وہ قارئین نے گزشتہ ابواب میں دیکھ لیا۔ فاعتبروا یا اولی الالباب۔

'الہلال' مورخہ ۲۰ اگست (۱۹۱۳ء) ص ۱۵۹ میں 'ترک و عرب' کے زیر عنوان ایک طویل رپورٹ شائع ہوئی جس میں المؤتمر العربی السوری اور انجمن اتحاد و ترقی کے درمیان حسب ذیل شرائط پر مصالحت ہوئی:

۱۔ عرب، عثمانی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ دولت عثمانیہ میں عربوں اور ترکوں کے حقوق برابر ہوں گے۔

۳۔ عرب وعدہ کرتے ہیں کہ وہ انتظامی محکموں میں ترکی کی مساعدت کریں گے۔

۴۔ عرب اصلاحات کے منتظر ہیں۔ وہ ترکی کے ساتھ تعاون کریں گے۔

۵۔ ولایات عثمانیہ اصلاحات کے سخت محتاج ہیں۔ اس میں عرب دولت علیہ کے ساتھ متفق ہیں۔

۶۔ انجمن جوانان عرب اعلان کرتے ہیں کہ وہ بیرونی طاقت ورکی مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے۔

لجنۃ المؤتمر العربی اور انجمن اتحاد و ترقی کے درمیان جو اتفاق نامہ شائع ہوا، اس کے شرائط حسب ذیل تھے:

۱۔ تمام عربی شہروں میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم عربی زبان میں ہو گی اور اعلیٰ تعلیم اکثریت رکھنے والی جماعت کی زبان میں۔

۲۔ گورنروں کے علاوہ تمام اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے عربی دانی شرط ہو گی، تمام عہدہ دار مقامی ہوں گے۔ دار الخلافہ سے صرف چیف جسٹس کا تقرر ہو گا۔

۳۔ اوقاف کا انتظام مقامی افسران کے ذمہ ہو گا۔

۴۔ رفاہ عامہ کا کام ادارہ محلیہ یعنی مقامی دفاتر کریں گے۔

۵۔ فوج قریب کے شہروں کی خدمات انجام دے گی۔

۶۔ مجالس عمومیہ میں کم از کم تین عرب ہوں گے۔ شیخ الاسلام کے دائرہ میں بھی دو یا تین عرب ہوں گے۔

۷۔ وزارتوں میں بھی کم از کم چار یا پانچ عرب ہوں گے۔

۸۔ عربوں میں سے کم از کم دس کمشنر اور پانچ گورنر لیے جائیں گے۔

۹۔ مجلس اعیان میں دو فیصد عرب ہوں گے۔

۱۰۔ ہر ولایت میں مفتش خصوصی مقرر کیے جائیں گے۔

۱۱۔ مقامی حکومت کی مالی امداد کی جائے گی۔

۱۲۔ سرکاری معاملات عربی میں ہوں گے مگر اس کا نفاذ بتدریج ہو گا۔

۱۳۔ اسمبلی میں نصف مسلم نصف غیر مسلم ہوں گے۔

آج کا قاری جس کے سامنے فلسطین کا المیہ ہے۔ یہی کہہ سکتا ہے کہ کاش ان معاہدوں پر عمل ہو جاتا، لیکن تقدیر کے نوشتے محض تمناؤں سے نہیں بدلتے۔

(جاری)

امیر سید عبدالقادر حسنی الجزائری

عثمانی حکومت نے الجزائر کے ساحلی علاقوں میں ایک طاقتور بحری بیڑہ تیار کیا تھا جو عرصہ تک بحر متوسط پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کرتا رہا۔ جب بھی باب عالی (ترکی) کو جہاد کے لیے بحری بیڑے کی ضرورت ہوتی الجزائر کا بحری اڈہ فیصلہ کن رول ادا کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، اس بحری قوت نے الجزائر سے متصل یورپی ساحلوں تک اپنے اثر ونفوذ کا دائرہ بڑھا لیا تھا لیکن جوں جوں عثمانی حکومت کمزور ہوتی گئی اس بحری بیڑے اور مغرب اقصیٰ کے علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس بحری بیڑے نے جہاد کے بجائے بحری قزاقی شروع کردی، الجزائر پر حکمراں ترک حکام نہ صرف اس قزاقی سے چشم پوشی کرتے بلکہ مال غنیمت میں بھی حصہ لیتے۔ اس صورت حال سے مجبور ہو کر فرانس نے ۱۶۵۹ء سے ۱۶۸۶ء تک مسلسل بحری حملے کے ذریعہ الجزائر کے بحری بیڑے کی قوت توڑ کر رکھ دی۔ اس کے بعد ہی برطانوی اور فرانسیسی تجارتی جہاز آزادی کے ساتھ نقل وحرکت کرنے لگے، جب کہ ڈنمارک اور ہالینڈ الجزائر کے بحری بیڑے کو حفاظتی ٹیکس ادا کرنے کے بعد ہی سمندر میں نقل وحرکت کر سکتے تھے، اس لیے کہ ان دونوں ملکوں کے پاس اتنی بڑی بحری طاقت نہیں تھی جو ان کی حفاظت کر سکتی۔

۱۸۲۷ء میں جب الجزائر کے حکمراں حسین والی اور فرانسیسی کونسلر جنرل کے درمیان تجارتی راہداری کے مسئلہ پر اختلافات نے سنگین صورت اختیار کر لی تو فرانس نے ۵ ستمبر ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر قبضہ کر لیا یہ کارلوس دہم کا زمانہ تھا اور ابھی فرانس جمہوری انقلاب سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو فرانس کا ارادہ یہی تھا کہ الجزائر کے ساحلی علاقوں ہی پر وہ اپنا قبضہ رکھے گا اور اندرونی حکومت کے متعلق الجزائر کے باشندوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرے گا اس لیے کہ پورے ملک پر قبضہ کرنے کی صورت میں بھاری اخراجات ہوں گے لیکن ایک کمیٹی نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پورے

الجزائر پر فرانسیسی تسلط ضروری ہے خواہ اس راہ میں کتنی ہی مالی قربانیوں سے گزرنا پڑے' اس فیصلہ پر عمل کیا گیا اور آہستہ آہستہ پورے ملک پر فرانسیسی اقتدار مسلط ہوگیا۔ بہت سے شہروں میں فرانسیسی فوج کو شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا، لیکن الجزائر کے مغربی علاقے نے امیر عبدالقادر الجزائری کی قیادت میں پندرہ سال تک فرانس کی طاقتور اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس فوج کے چھکے چھڑا دیے، حالانکہ امیر کے پاس فوجی طاقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی جب کہ فرانس نے اس مٹھی بھر جماعت کے مقابلہ کے لیے ایک لاکھ آٹھ ہزار فوج بھیج دی تھی جسے الجزائر کو سرنگوں کرنے میں پندرہ سال لگ گئے'۔

جب فرانسیسی فوج الجزائر کے بعض ساحلی شہروں اور صحرائی علاقوں پر قبضہ کر رہی تھی تو مغربی علاقہ کے قبائل نے ان فوجوں کو ذلّت آمیز شکست دی ان کی اس جنگی یورش اور کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان قبائل نے اپنا ایک امیر بنا لیا تھا جو سادات حسنی کے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔

امیر عبدالقادر کا تعلق ایسے سادات حسنی کے گھرانے سے تھا جو مغرب اقصیٰ سے ہجرت کر کے الجزائر کے مرکزی شہر دھرآن آ گیا تھا، اس خاندان کے حضرات پورے مغرب اقصیٰ میں اپنے زہد و تقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، تواضع و بےنفسی، مجاہدے، ایثار و قربانی اور غیرت ایمانی کے لیے مشہور تھے، ان میں ممتاز صفات اور دینی فہم و فراست کی بنا پر مغرب اقصیٰ کے قبائل ان کے گرویدہ اور عاشق تھے۔ ان نمایاں اور ممتاز لوگوں میں امیر عبدالقادر کے والد ماجد سید محی الدین بھی تھے جنھوں نے فرانسیسی استعمار کی آمد سے قبل ایک دینی مسئلہ کو لے کر الجزائر کے ترک حکام کے خلاف شورش میں مرکزی کردار ادا کیا تھا، اس کے بعد وہ حج کی تیاری کر رہے تھے کہ دھرآن کے گورنر نے ان کو گرفتار کر لیا، لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد ان کو رہا کر دیا اور حج پر جانے کی اجازت دے دی چنانچہ اپنے صاحبزادہ امیر عبدالقادر اور ممتاز علماء و فضلاء کی ایک جماعت کے ساتھ حجاز کے لیے روانہ ہو گئے'، دو سال کے عرصہ میں ان حضرات نے حرمین شریفین کے علاوہ عراق، شام اور مصر کا بھی دورہ کیا، جب یہ وفد الجزائر پہنچا تو الجزائر کے ترک حکام اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، کہا جاتا ہے کہ امیر عبدالقادر نے اپنے والد کو اس جنگ میں شرکت سے روکا، ترکوں اور فرانسیسیوں

کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی، باب عالی سے فوجی مدد نہیں مل سکی کہ اس کی پالیسی سفارتی ذرائع سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی تھی۔ چنانچہ مجبوراً ترک حکام نے شہر کو فرانسیسی فوج کے حوالے کر دیا۔ لیکن اس کے بعد الجزائری عوام اور فرانسیسی فوج کے درمیان خوں ریز جنگ ہوئی، اس کی قیادت سید محی الدین نے کی، امیر عبدالقادر کی جنگی حکمت عملی، سیاسی سوجھ بوجھ، غیر معمولی شجاعت اور جرأت وہمت نے عوام وخواص دونوں کے دلوں میں جگہ بنالی اور سب ہی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے۔ لیکن چونکہ ان کے والد موجود تھے اس لیے ممتاز قبائل "ہاشم"، "غربہ" اور "بنو عامر" نے سید محی الدین حسنی سے باقاعدہ امارت قبول کرنے کی درخواست کی تاکہ ایک خودمختار حکومت کی تشکیل ہوجائے اور اس کی قیادت میں فرانسیسی استعمار سے جنگ کی جائے، باب عالی سے کسی امداد کی توقع بیکار ہے، سید محی الدین حسنی نے امارت قبول کرنے سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں البتہ انھوں نے اپنے صاحبزادہ امیر عبدالقادر کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیت کی تعریف کی اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء میں امیر کے ہاتھ پر تینوں ممتاز قبائل نے بیعت کرلی، اس وقت امیر کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔ امیر کی پیدائش ۱۸۰۸ء مطابق ۱۲۲۳ھ کی ہے۔

امیر عبدالقادر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور دوسرے ممتاز اساتذہ سے حاصل کی، ویسے تو پورا گھرانہ علم وتقویٰ کے ساتھ جنگی فنون میں ماہر تھا، لیکن عبدالقادر کو بچپن ہی سے حصولِ علم کا غیر معمولی شوق تھا، ادب، فقہ اور توحید میں غیر معمولی تفوق اور امتیاز رکھتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں فنون سپہ گری، گھوڑ سواری، نشانہ بازی میں بھی مہارت حاصل کرلی، علمی اور دینی موضوعات پر ان کا قلم رواں اور تحریر شگفتہ ہوتی تھی، اس طرح اپنے سادات خانوادے کی خصوصیات سیف وقلم، اجامِ شریعت اور سندانِ عشق کی جامعیت کے وہ علمبردار و داعی تھے۔

۲ر نومبر ۱۸۳۲ء کو جب ان کی بیعت مکمل ہوگئی تو ان سے درخواست کی گئی کہ اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب استعمال کریں، لیکن انھوں نے اس سے معذرت کی اور کہا کہ مراکش کے سلطان کے ہم مطیع وفرماں بردار ہیں اس لیے امیر المومنین کا لقب زیادہ مناسب ہے۔

امیر عبدالقادر نے قیادت سنبھالتے ہی سب سے پہلے العسکر نامی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، چونکہ مصر کے سفر میں وہ محمد علی باشا کی فوجی اور اداراتی اصلاحات کو دیکھ چکے تھے اس لیے

اسی طرز پر انھوں نے اپنی فوج کی جدید تنظیم کی، جدید طرز کے اسلحہ کی تیاری کے لیے متعدد شہروں میں کارخانے قائم کیے، یہاں تک کہ فوجی یونیفارم کے لیے بھی انھوں نے کرگھے قائم کیا، دوسری طرف الجزائر اور مراکش کے صحرائی اور پہاڑی علاقوں میں پھیلے ہوئے قبائل میں دینی شعور بیدار کرنے کا ایک ٹھوس منصوبہ بنایا، اس منصوبے میں بچوں، بچیوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کی تعلیم کے مراکز، شبینہ، صباحی مکاتب کا نظام، زراعت اور تجارت کی بھرپور تنظیم، بنیادی ضرورتوں کے لیے صنعتی کارخانے، اسی کے ساتھ مساجد کے ذریعہ دینی شعور کو بیدار کرنے اور تصوّف کے حلقوں کے ذریعہ جہاد کی روح پھونکنے کا پروگرام شامل تھا۔ فاس اور ازہر کے علماء سے فتاوے حاصل کرکے تمام مسلمانوں کو صدقات وزکات اور عشر ادا کرنے کے احکامات جاری کیے، شرعی احکام کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنے اور ان فیصلوں کی تنفیذ کے لیے قاضی مقرر کیے۔ امیر نے یہ بھی فرمان جاری کیا کہ جو قبائل فرانس کے زیر تسلّط علاقوں میں بستے ہیں ان کا دینی فرض ہے کہ وہ دارالکفر کے ان علاقوں سے ہجرت کرکے دارالاسلام آجائیں اس لیے کہ یہ مقبوضہ علاقے ہیں اور عیسائیوں کے زیرنگیں ہوکر رہنا شرعی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

امیر نے گیارہ ممتاز علماء پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ کی تشکیل کی تاکہ حکومت کا نظام باقاعدہ چلایا جاسکے۔ اس مجلس کے علاوہ ایک سپریم کونسل بھی قائم کی جہاں سے فیصلوں کی آخری توثیق ہوتی تھی، وزراء کا کام صرف یہ تھا کہ وہ سپریم کونسل کے فیصلوں کی تنفیذ کریں، خارجی امور، ٹیکس اور اوقاف وغیرہ کے لیے وزراء مقرر کیے گئے، جنگی امور خود امیر براہ راست دیکھتے تھے۔

امیر جس رقبہ پر حکومت کرتے تھے وہ سارے کے سارے قبائلی اثر ونفوذ کے علاقے تھے، اس لیے ان ہی قبائل کے سرداروں کا نظام کیا گیا، یہ لوگ خلیفہ کہلاتے تھے اور تمام امور میں وہ سپریم کونسل کے سامنے جوابدہ ہوا کرتے تھے۔ ان خلفاء کا کام یہ تھا کہ صدقات اور عشر وزکات جمع کرکے امیر کے پاس پابندی سے روانہ کیا کریں، اگر مزید مالی امداد کی ضرورت ہو تو تحصیل و وصول کے بعد مرکز کو بھیج دیا کریں۔

شرعی احکام کی تنفیذ کی برکت جلد ہی کھل کر سامنے آگئی، کثرت سے صدقات وزکات اور عشر کی رقمیں، نیز جہاد کے لیے مالی امداد امیر کے پاس آنے لگی۔ ان تمام رقوم کو وہ فوجی تنظیم، اسلحہ کے کارخانوں کے قیام، مساجد اور مدارس کے نظام تعلیم وتربیت پر صرف کرتے تھے۔ جدید طرز کی

فوجی تربیت کے لیے ترکی اور فرانس کے ریٹائرڈ فوجی افسروں کی خدمات حاصل کیں، اسی کے ساتھ کوہ اطلس کے غاروں، چوٹیوں اور صحرا کے حصوں میں فوجی ساز و سامان اور غذائی رسد کے محفوظ ذخائر اور قلعے تعمیر کیے، جو قدیم قلعے شکستہ ہو رہے تھے ان کی مرمت کرائی اور ان کو فوجیوں کے سپرد کر دیا۔ امیر کی انتھک محنت اور قبیلہ قبیلہ جا کر فرداً فرداً ملنے سے بہت سے قبائل ان کے ساتھ ہو گئے، خصوصاً بربری قبائل نے ان کی اعانت اور ہمدردی کا وعدہ کیا حالانکہ یہ قبائل دینی شعور کے فقدان کی وجہ سے فرانسیسیوں کے حملوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

امیر نے داخلی استحکام کے منصوبوں کی تکمیل کے ساتھ غیر ملکی طاقتوں سے بھی خط و کتابت کا آغاز کیا تاکہ ان سے تعلقات بہتر بنا کر فرانس پر سفارتی دباؤ ڈالا جاسکے۔ چونکہ دھرآن کے مغربی ساحل پر امیر کا قبضہ تھا اس لیے فرانس نے امیر کی سفارتی سرگرمیوں کو تاڑ لیا، اس نے مختلف عرب قبائل کے ذریعہ دھرآن کے ساحلی حصوں کو امیر کے قبضے سے نکالنے کی زبردست سازش کی جو آخرکار کامیاب ہو گئی، لیکن فرانسیسی فوج کے لیے سامان رسد کی سپلائی سنگین صورت اختیار کر گئی، اس لیے کہ امیر نے ایک عام فتویٰ جاری کر دیا تھا کہ جو شخص بھی فرانسیسی فوج کو کسی طرح کی مدد دے گا وہ مرتد قرار دیا جائے گا جس کی سزا قتل ہے۔ اس فتویٰ کی وجہ سے فرانسیسی حکام پریشان ہو گئے اور امیر کے ساتھ سلسلہ جنبانی کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ امیر کے پاس موجود چار فرنچ اسیروں کے مسئلہ کو لے کر فرانسیسی گورنر ڈیشیل نے خط و کتابت کا آغاز ستمبر ۱۸۳۳ء میں کیا۔ مسلسل تین خطوط کے جواب میں امیر نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا، چوتھے خط کا جواب بہت صاف اور کھرا تھا۔ لیکن ایک جملہ یہ بھی تھا کہ چونکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے اس لیے ان اسیروں کو واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس جواب پر ڈیشیل نے قاصد بھیجا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان معاہدہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ آپ تیار ہوں۔ امیر کے سامنے فرانسیسی حکام نے معاہدے کی جو بنیادیں پیش کیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ فرانسیسی فوج اپنے مقبوضہ علاقوں سے سامان رسد ضرورت کے مطابق خرید سکتی ہے۔ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی حالت ختم کی جائے۔ امیر کے زیر تسلط علاقوں میں فرنچ تاجروں کی آمد و رفت کی اجازت دی جائے، فرانس کے زیر اقتدار علاقوں میں امیر کے یہاں کے لوگ مسافر اور سیاح کی صورت میں پاسپورٹ اور راہداری کے کاغذات کے ساتھ آ سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے کوئی فوجی بھاگ کر امیر کے پاس چلا جائے

تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ امیر اس معاہدے میں ترمیم اور تبدیلی چاہتے تھے، لیکن فرنچ حکام نے مزید گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقع نہیں دیا اور یک طرفہ طور پر معاہدے کا اعلان اس تصریح کے ساتھ کر دیا گیا کہ امیر نے اس معاہدے کی منظوری دے دی ہے ادھر امیر نے بھی اعلان کر دیا کہ ہم اس یک طرفہ طور پر معاہدے کے کسی طرح بھی پابند نہیں ہیں۔ اس معاہدے کی اطلاع جب پیرس پہنچی تو حکومت نے ہدایات جاری کر دیں کہ امیر عبد القادر سے سالانہ جزیہ لیا جائے اسیروں کو بزور طاقت واپس لیا جائے، اگر امیر کو اسلحہ کی ضرورت ہو تو وہ فرانس سے خرید سکتے ہیں، لیکن نوعیت اور مقدار کا آخری فیصلہ فرنچ وزارت جنگ کرے گی۔

اگرچہ امیر نے اس نامعقول اور یک طرفہ معاہدے کو قبول نہیں کیا لیکن فرانس نے ایسا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ تمام عرب قبائل میں امیر کے خلاف بدگمانیاں پھیل گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی حسد اور گروہی عصبیتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، اور سرکشی و بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ان قبائل نے ٹیکس دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جہاد کے لیے جو اضافی ٹیکس لگایا گیا تھا حالتِ جنگ کے خاتمہ کے بعد اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ دوسری وجہ شورش کی یہ ہوئی کہ تھوڑے عرصہ میں امیر نے الجزائر سے لے کر مراکش اور تیونس تک میں جو غیر معمولی شہرت، اثر و رسوخ اور کامیابی حاصل کر لی تھی اس نے بعض قبائل کے قائدین میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ جس کا ایک سنگین نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی بار شورش پسندوں کے سرغنہ مصطفیٰ بن اسماعیل نے امیر کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ پھر جب ناکام ہو گیا تو بھاگ کر فرانسیسی حکام سے مل گیا اور امیر کے خلاف ہر طرح کی مدد کرنے لگا۔ لیکن امیر نے بہت جلد ان شورشوں پر انتہائی دانشمندی اور حکمت عملی سے قابو پا لیا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ ان کی فوجی گرفت ان علاقوں پر مضبوط ہو گئی، جس سے فرانسیسی اور بھی گھبرا گئے۔ ادھر ان کی تشویش اس وقت اور بڑھ گئی جب دھران اور مستغانم کے ساتھ مرکزی شہر قسنطینہ بھی امیر کے قبضے میں آ گیا۔

اگرچہ یک طرفہ معاہدے میں جغرافیائی طور پر اس بات کی تحدید نہیں کی گئی تھی کہ کون سے علاقے امیر کے قبضے میں رہیں گے، لیکن اس کے باوجود فرنچ گورنر نے امیر کے ان نئے قبضوں کے خلاف ایسا شدید احتجاجی مراسلہ بھیجا جیسے الجزائر فرانس کا ایک حصہ ہو۔ امیر نے اس احتجاجی مراسلہ کو نظرانداز کر کے کسی طرح کی گفتگو سے انکار کر دیا۔

چونکہ یک طرفہ معاہدے کے باوجود دونوں فریقوں کے درمیان مسلسل حالت جنگ چل رہی تھی اس لیے بعض انتہا پسند لیڈروں نے حکومت فرانس سے مطالبہ کر دیا کہ ڈیمیشیل کو گورنری سے معزول کر کے ایسا فوجی گورنر بھیجا جائے جو وہاں اپنا فوجی تفوق اور برتری ثابت کر دے اس مطالبہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مارسیلیا کے تاجروں نے شکایت کی تھی کہ ہماری مصنوعات پر الجزائر میں سخت پابندی ہے، امیر کے فتووں کی وجہ سے کوئی تاجر ہم سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے برعکس الجزائر کی مصنوعات فرانس اور دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں آزادی کے ساتھ پہنچ رہی ہیں۔ اس غیر معمولی مالی خسارے سے انھیں بچایا جائے۔ چنانچہ فرانس کی حکومت نے جنرل ٹریزل کو فوجی گورنر بنا کر الجزائر بھیج دیا۔

نئے فوجی جنرل نے دو مہینے تک الجزائر کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا، اس کے بعد اس نے رشوت کے ذریعہ دو بڑے قبیلوں کو توڑ لیا، اور ایک بڑی فوجی طاقت کے ساتھ امیر عبدالقادر پر یورش بھی کر دی، ادھر امیر بھی غافل نہیں تھے۔ انھوں نے گھات لگا کر اپنی مختصر فوجوں کی مدد سے ایسا اچانک بھرپور اور تیز حملہ کیا کہ فرانسیسی فوج کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا، ۲۰۵ ہ فوجی مارے گئے اور چار سو زخمی ہوئے۔ یہ شکست فرانس کی حکومت کے لیے بہت زبردست صدمے کا باعث بنی۔ اگرچہ ذرائع ابلاغ نے اس شکست کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی، لیکن حکومت کے مخالفین نے مطالبہ کیا کہ الجزائر سے فوج واپس بلالی جائے کہ بجز جانی اور مالی نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آرہا ہے۔ فرانس کی حکومت نے جنرل ٹریزل کو واپس بلا کر ان کی جگہ جنرل کلوزیل کو مقرر کر دیا جس نے بھرپور طاقت کے ساتھ امیر کے دارالحکومت العسکر پر حملہ کر دیا، ادھر امیر کو اس حملہ کی سن گن پہلے سے مل گئی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ اس بار مقابلہ ناممکن ہے اس لیے کہ دس ہزار اور اسّی ہزار کے درمیان کوئی تناسب نہیں۔ امیر نے پورا شہر چند گھنٹوں میں خالی کر دیا، لیکن جانے سے پہلے اہم تنصیبات کو برباد کر دیا تاکہ فرانسیسی فوج کے کچھ ہاتھ نہ لگ سکے۔ فرانسیسی فوج کو جب یہاں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو اس نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوری کوچ کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا ان قبائل پر فوری اثر ہوا جو امیر کے دارالحکومت کے سقوط سے متاثر اور بددل ہو کر امیر سے الگ ہو چکے تھے، انھوں نے از سر نو امیر کی اطاعت کا اقرار اور معاہدہ کیا۔ اس طرح دارالحکومت کے سقوط سے امیر کی فوجی اور سیاسی قوت واستحکام پر مطلق کوئی

اثر نہیں پڑا، بلکہ فرانسیسی فوج نے دوسرے علاقوں میں جس درندگی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے ان قبائل کو اور بھی متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔

ادھر جنرل کلوزیل نے ۱۸۳۲ء میں قسنطینہ کے ترک گورنر احمد بک سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے حملہ کر دیا۔ مستحکم جغرافیائی پوزیشن اور ترک فوجوں کی غیر معمولی شجاعت نے فرانسیسی فوجوں کے چھکے چھڑا دیے اور وہ خاصے جانی و مالی نقصان کے بعد شکست کا داغ لے کر واپس ہونے پر مجبور ہو گئی اس درمیان شہر تلمسان میں امیر کی فوجوں نے فرانسیسی فوجوں کو محصور ہونے پر مجبور کر دیا، جس کی وجہ سے فرانسیسی حکومت نے ایک دوسرے تجربہ کار جنرل بیگو کو الجزائر بھیجا، اس نے امیر عبدالقادر کی فوجی حکمت عملی (چھاپہ مار جنگ) کا جواب چھاپہ مار جنگ سے دینے کا منصوبہ بنایا، اس مقصد میں اس کو دو معرکوں میں فوری طور سے کامیابی بھی مل گئی، لیکن فرنچ حکام کو اندازہ ہو گیا کہ قسنطینہ اور دھران پر بیک وقت حملہ کرنے کے بجائے پہلے امیر عبدالقادر کی طرف سے اطمینان کر لیا جائے، چنانچہ قسنطینہ سے توجہ ہٹا کر جنرل بیگو نے امیر عبدالقادر سے صلح کی بات چیت کا ارادہ ظاہر کیا، اس زمانہ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ امیر برطانوی حکومت سے خط و کتابت کر رہے ہیں، اگرچہ برطانیہ نے امیر کے خطوط کا جواب نہیں دیا لیکن اس بات پر تیار ہو گیا کہ وہ فرانس کی توسیع پسندانہ پالیسی پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دے گا، ادھر امیر کے سفارت کاروں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مراکش کے ذریعہ امیر کو برطانوی اسلحے ملنے والے ہیں۔ ان حالات میں امیر صلح کی بات چیت کے لیے اس لیے تیار ہو گئے کہ وہ حالت جنگ کو ختم کر کے اپنی حکومت کے اثر و رسوخ اور دائرہ کو مزید وسعت دینا چاہتے تھے، وہ فرانسیسیوں کی اس سازش کی تہ تک نہ پہنچ سکے کہ اس معاہدہ کے ذریعہ فرنچ حکام امیر کو قسنطینہ کے معاملہ میں بے دست و پا کر کے اس پر قابض ہو جائیں گے۔

اگرچہ معاہدہ کی پابندی ۳۱ مئی ۱۸۳۷ء سے ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۹ء تک صرف دو سال پانچ ماہ کی گئی، لیکن اس معاہدہ کو الجزائر کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن تاریخی موڑ کہا جا سکتا ہے۔

(جاری)

سید غلام محی الدین
شبلی کتب خانہ، ندوۃ العلما، لکھنؤ

روس اور چین میں زندگی کی لہر

وقت کے اہم ترین بین الاقوامی مسائل میں روس کا اندرونی خلفشار اور "گراں خواب چین" میں بیداری کی نئی کروٹ ہے۔ کیا ان کے اثرات مسلمانوں کے حق میں مفید ہوں گے، یا یہ صرف ایک ایسا ڈرامہ ہے جس میں مسلمانوں کا حصہ دور کا جلوہ ہے؟

اس سوال کا جواب ان حالات کی روشنی میں تلاش کیا جا سکتا ہے جو اب تک مسلمانوں کے وہاں رہے ہیں۔ عام طور پر یہ گمان ہے کہ وہاں کئی نسلیں ایسی گزر چکی ہیں کہ اسلام کی بیخ کنی کی جا چکی، اور نئی نسلیں سوویت نظام کے اندر تحلیل ہو چکی ہیں۔ مگر افغانستان کے جہاد میں ایسے فوجیوں کا پایا جانا جو ایک بندوق کے بدلہ پنج سورہ حاصل کر رہے تھے۔ بتاتا ہے کہ مسلمان ایک سخت جان قوم ہے جس کے اندر اب بھی شرار آرزو باقی ہے۔

ذیل کا تبصرہ ان حالات پر ہے جو اس نئی کروٹ سے پہلے کے تھے، اسی کے بین السطور میں ہم مستقبل کا خاکہ دیکھ سکتے ہیں۔

(ادارہ)

سوویت روس کی حکومت کا ڈھانچہ زار کی حکومت سے کچھ مختلف نہیں رہا ہے۔ کلیت پسندی (Totalitarianism) پر اس کی بنیادیں قائم ہیں، بلکہ اکثر مفکرین کا یہ خیال ہے کہ اگر زار کی حکومت کے زمانہ میں روسی عوام ایک جابرانہ کلیت پسند حکومت کے عادی نہ ہو چکے ہوتے تو ان کے لیے اتنی مدت تک موجودہ روسی اشتراکی نظام کے تحت زندگی گزارنا ممکن نہ تھا۔ بہر حال انقلاب کے زمانہ میں روسی سامراج پسندی نے اپنا چولا بدل لیا تھا لیکن نظامِ حکومت جوں کا توں برقرار رہا۔ پھر بھی دنیا کے دوسرے حصوں میں مفتوحہ عوام نے نوآبادیاتی حکومتوں کا جوا اُتار کر پھینک دیا ہے، کہیں پُرامن جدوجہد کے ذریعہ

اور کہیں جنگ وجدال کے ذریعہ، خاص طور پر عالم اسلام میں نو آبادیاتی حکومتوں کے خلاف سب سے زیادہ بیزاری کا اظہار کیا ہے لیکن وسط ایشیا کے مسلم علاقے اب تک روس کے زیر نگیں ہیں حالانکہ ایرانی اور روسی آذربائجان میں کوئی فرق نہیں ہے، نہ لسانی، نہ مذہبی اور نہ نسلی۔ پھر روسی آذربائجان میں ویسی بیزاری کیوں نہیں پائی جاتی جیسی ایک زمانہ میں تبریز میں امریکی فوجی مشیروں کی موجودگی سے پیدا ہوگئی تھی۔ وہاں کوئی سرفروش قائد کیوں نہیں پیدا ہوا؟

اس سوال کا جواب مختلف انداز میں دیا گیا ہے۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ روس کے ماتحت مسلم علاقوں میں کافی بے چینی پائی جاتی رہی، لیکن اس کی خبریں ہم تک نہیں پہنچتی تھیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ روس کے آہنی پردہ کے اندر کی خبریں مشکل ہی سے ملتی تھیں، لیکن کسی شدید بے چینی کو چھپانا روسیوں کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ روس کی سرکاری مطبوعات سے ان بے چینیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر مذہب کی بیخ کنی کے لیے کیے جانے والے اقدامات سے ان کا پتہ چلتا ہے۔ اسلامیات کے فرانسیسی ماہر الگزنڈر بنگسن (ALEXANDER BENNIGSEN) کا کہنا ہے کہ روس میں اسلام کے احیاء کی تحریکیں مختلف شکلوں میں چل رہی ہیں۔ ان تحریکوں کے قائد وہ سرکاری علماء نہیں ہیں جن کو مختلف مسلم علاقوں کی جمہوریتوں میں سرکاری سرپرستی دے کر حکومت کی موافقت میں بیانات دلوائے جاتے ہیں بلکہ یہ تحریک ان صوفی سلسلوں کے ذریعہ چلائی جارہی ہے جو اشتراکیت اور روس کی بالادستی کے سخت مخالف ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں پچھلے پندرہ برسوں میں ان صوفی سلسلوں کے ذریعہ کی جانے والی کارروائیوں کی شہادت روس کے سرکاری مطبوعات اور اخباروں کی مدد سے پیش کی ہے لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بنگسن کے ذریعہ پیش کردہ شہادت زیادہ تر کوہ قاف کے شمالی پہاڑی علاقوں سے متعلق ہے جہاں کی کثیر آبادی ابھی تک غیر ترقی یافتہ ہے۔ ان شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات یہ صوفی حلقے تشدّد کا راستہ بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن اس سے روس کے دوسرے مسلم علاقوں کی بیداری پر کافی روشنی نہیں پڑتی۔

اکثر اوقات بعض واقعات سے بھی پس پردہ بے چینی کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۴م دسمبر ۱۹۸۰ء کو وسط ایشیا میں خرگیز سوویت ری پبلک کے وزیر اعظم کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ایک ماہ تک ماسکو کی سپریم سوویٹ میں اس بات پر بحث چلتی رہی کہ چین اور افغانستان سے

ملحق روسی علاقوں میں امن و امان کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے تاکہ دوبارہ اس قسم کے جرائم نہ ہوسکیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ قتل ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا یا اس میں حکومت کے مخالف عناصر کا ہاتھ تھا لیکن سپریم سویٹ کی پوری بحث میں اسلام پسند عناصر کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔

اس سوال کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ وسط ایشیائی باشندوں کو اس کا بخوبی احساس ہے کہ ان کے حالات دوسرے سامراجی ملکوں، جیسے برطانیہ، فرانس وغیرہ کے مقبوضات سے مختلف ہیں۔ روس ایک عالمی قوت بن چکا ہے اور دوسرے نوآبادیاتی ممالک کے خلاف ان کی سرحدیں روس سے ملی ہوئی ہیں، روس کی کثیر فوج ان کے ممالک میں موجود ہے جسے وہ کسی خطرہ کے وقت استعمال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے، اُن کی جمہوریتوں کو روسی وفاق سے الگ ہونے کی اجازت محض کاغذی ہے اور ان ممالک کے کلیدی عہدوں پر روسیوں کے قبضے کی وجہ سے روس کے خلاف کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی لہٰذا جب تک حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو آزادی کی تحریک سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس کا اظہار بھی حکومت کی جانب سے وقتاً فوقتاً کیا جاتا ہے، چنانچہ ۱۹۸۰ء میں مرکزی حکومت نے ٹیلی ویژن، اخبارات، افسانوں کے ذریعہ عوام کو لٹیروں (مسلم علاقے کے اولین حریت پسند جنھیں روسیوں نے لٹیروں کا خطاب دیا تھا) کے خلاف ہوشیار رہنے کی تلقین شروع کی تھی، حالانکہ پچھلے چالیس برسوں سے اس موضوع پر کچھ کہنا یا لکھنا ممنوع تھا۔ اس حالیہ مہم میں اس بات پر زور دیا گیا کہ یہ لٹیرے غیر ملکی سامراجی قوتوں کی شہ پر ملاّ اور صوفیوں کے بھیس میں کام کر رہے ہیں۔ روسی خفیہ پولیس کے اولین سربراہ چیکا (CHEKA) جس نے روسیوں کے خلاف جنگ کرنے والوں کو زیر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا، ہیرو بنا کر پیش کیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ روس ان طاقتوں کی سرکوبی ایک بار کرچکا ہے اور اگر ضرورت ہوئی تو دوبارہ انھیں کچلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔

مذکورہ بالا سوالات کے سلسلہ میں تیسرا نظریہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کی ذہنی تربیت اس طور سے کردی گئی ہے کہ وہ اب اپنے قومی شعور سے بے بہرہ ہوچکے ہیں، لہٰذا اب ان میں اپنی الگ شخصیت کے اظہار کا جذبہ باقی نہیں رہا ہے۔ اشتراکی حکومت کے تحت ان کی دو نسلیں گزر چکی ہیں، جس کے دوران برابر یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ ان میں اشتراکیت کے علاوہ اور کسی شے سے دلچسپی باقی نہ رہے۔ ۱۹۲۰ء میں مصطفٰے کمال کی پیروی کرتے ہوئے روسی حکومت نے ترک زبانوں کے

لیے لیٹن رسم الخط نافذ کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں لیٹن رسم الخط بدل کر روسی رسم الخط جاری کر دیا گیا تاکہ ان زبانوں کا کوئی رابطہ ترکی کی موجودہ زبان سے بھی باقی نہ رہے۔ ۱۹۲۸ء میں شرعی عدالتوں کا قیام غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور تمام مذہبی ادارے بند کر دیے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں اوقاف ضبط کر لیے گئے، جس کے بعد مدرسے اور دوسرے مذہبی اداروں کا قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اس کے بعد اسلام کی بیخ کنی کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں، زکوٰۃ کی وصولی پر پابندی لگا دی گئی، حج بند کر دیا گیا، اور رمضان میں روزہ رکھنے کی حوصلہ شکنی کی جانے لگی، مسجدوں کو کلب اور سینما گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران اس پالیسی میں قدرے تبدیلی آئی کیونکہ جنگ میں مسلمانوں کی حمایت مقصود تھی لیکن خروشیف (KHRUSHCHEV) کے زمانہ میں پھر اسلامی تعلیمات کی حوصلہ شکنی کا دور شروع ہو گیا۔ بہرحال ۱۹۶۰ء کے بعد روس نے اسلامی دنیا سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا کہ اسلام ابھی تک روس میں باقی ہے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس پالیسی کے نتیجہ میں اسلام دشمنی میں کچھ کمی واقع ہوئی، لیکن اس وقت بھی روس میں مسجدوں کی کل تعداد چند سو سے زائد نہیں ہے، جب کہ ۱۹۱۷ء میں تیس ہزار مسجدیں موجود تھیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں کی کل تعداد ایک کروڑ اسی لاکھ تھی اور اس وقت یہ تعداد ساڑھے چار کروڑ ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مسلم ممالک سے روس کے بڑھتے ہوئے تعلقات کے باوجود ان کے لیے اسلامی شعار اختیار کرنا آسان نہیں ہے۔

سوویت روس نے وسط ایشیا کے مسلم عوام کی زندگی کو اشتراکی نظریات کے ڈھانچہ میں ڈھالنے کے ساتھ ان میں اخوت اسلامی اور ترکی قومیت کے جذبات کو کچلنے کے لیے بھی اقدامات کیے ہیں۔ اس کے لیے دو طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں ایسے جدیدیت پسند لوگوں کی خدمات حاصل کی گئیں جو زار کی روسی حکومت سے نالاں تھے لیکن عوام کو ترقی کے نام پر جدید نظریات اور افکار قبول کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ اس میں انھیں دریائے والگا کے ساحل پر واقع قازان کے علاقہ میں خصوصیت سے کامیابی ہوئی۔ یہ ترقی پسند قومی آزادی کے نام پر اشتراکیت سے تعاون کرنے پر راضی ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد روسیوں نے ان ترقی پسند قائدین کو مختلف الزامات میں رفتہ رفتہ راستہ سے ہٹانا شروع کیا اور ترک

قومیت کے بجائے علاقائی نسلی اور لسانی تفریق کو ہوا دینا شروع کر دیا۔ دریائے والگا کے کنارے رہنے والے تاتاریوں اور ان کے قریبی علاقہ میں رہنے والے بشکیریوں (BASHKIRS) میں قریبی تعلقات ہی نہیں بلکہ ازدواجی تعلقات بھی تھے مگر ان دونوں کو الگ الگ صوبائی جمہوریہ کا درجہ دے دیا گیا۔ جس وقت بشکیر جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا، اس وقت ان کے علاقہ میں ان کی آبادی ۲۶ فیصد سے زائد نہیں تھی اور بیشتر سرکاری عہدوں پر تاتاری اور روسی فائز تھے۔ بشکیر زبان کا کوئی الگ رسم الخط بھی نہیں تھا بلکہ اسے تاتاری ترکوں کی زبان کی ایک مقامی بولی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز ان میں تفریق پیدا کرنے میں مانع نہیں سمجھی گئی۔

جنوب میں آذربائیجان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کو بھی مختلف صوبائی جمہوریتوں کے ذریعہ تقسیم کر دیا گیا۔ وسط ایشیا کے صحرائی علاقہ کو قزاقستان اور اس سے ملحق پہاڑی علاقہ کو خرگیز کا نام دے کر دو جمہوریتیں بنا دی گئیں حالانکہ خرگیز اور قزاقستان کی زبان ایک ہی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں خرگیز کی مقامی بولی کو ایک الگ زبان تسلیم کر لیا گیا۔

ترکستان کے علاقہ کو جو بحیرہ کیسپین سے چین تک پھیلا ہوا ہے، چار قومیتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس علاقہ میں تاجک فارسی بولتے تھے لیکن دوسرے تین علاقوں یعنی ترکمانیہ، ازبک اور کرپالک میں ترکی زبان بولی جاتی تھی، جن کی مقامی بولیوں میں معمولی اختلافات تھے۔ ۱۹۳۰ء میں کرپالک کے باشندوں کی زبان کو ترکی سے الگ تسلیم کر لیا گیا، حالانکہ ۱۹۳۹ء میں رائے شماری کے موقع پر صرف ۹ فیصد لوگوں نے اسے اپنی زبان بتلایا۔ اوّلاً ان سبھی زبانوں کے لیے لیٹن رسم الخط رائج کیا گیا لیکن بعد میں اسے بدل کر روسی رسم الخط نافذ کر دیا گیا۔

ترکستان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے اس علاقہ کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹنے کی مخالفت کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ان سبھی لوگوں کی زبان چغتائی ترکی ہے جن کی مقامی بولیوں میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہے لیکن روسیوں نے اسے ترکستان کی یک جہتی کی تحریک سمجھ کر ان کے خلاف سخت کارروائی کی اور بالآخر زبانوں کی یہ مصنوعی تقسیم اس علاقہ کے عوام کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔ بنگسن نے ۱۹۶۸ء میں اس پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کے نتیجہ میں قومی اور نسلی یک جہتی کا تصور کمزور ہوتا گیا، اور پچھلے پانچ برسوں میں اس کی جگہ مذہبی یگانگت کا تصور اُبھر رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اب ان علاقوں میں

بسنے والے لوگ اپنے آپ کو ازبک، ترکمان، تاتار وغیرہ سمجھنے لگے ہیں۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کے ایک اور پہلو کا ذکر کر دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ سوویت روس کے مسلمان اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہیں کیونکہ روسی سامراج یورپین سامراجی نظام سے مختلف ثابت ہوا ہے، اور اس نے اپنے محکوم اقوام کی مادی اور ثقافتی ترقی کے لیے قابلِ قدر اقدام کیے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن نے وسط ایشیا میں روسی پالیسی کے اثرات پر جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں اگر ایک طرف اس علاقہ کی خوشحالی کی تردید کی گئی تھی تو دوسری طرف اس کا اعتراف بھی کیا گیا تھا کہ اس علاقہ کے لوگوں کا معیارِ زندگی ان سے ملحق دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہتر ہوا ہے۔ ایک برطانوی مبصر کرنل جیوفری وہیلر (COL. GEOFFERY WHEELER) کا کہنا ہے کہ "اس بات پر سب متفق ہیں کہ وسط ایشیا کی اقتصادیات میں عظیم تبدیلی آئی ہے اور سوویت روس کے مسلمانوں کو اس بات کی شکایت کا بہت کم موقع دیا گیا ہے کہ ان کی حالت بہتر بنانے کے لیے حکومت نے اقدامات نہیں کیے ہیں۔ ان علاقوں میں خواندگی کی شرح ۹۰ فی صد ہو چکی ہے جب کہ ۱۹۱۷ء میں یہ شرح صرف ۴ فیصد تھی اور اس وقت تک ترکی میں بھی صرف ۴۵ فیصد لوگ خواندہ ہو سکے ہیں۔

سوویت روس کے مسلم علاقوں کی اقتصادی ترقی میں اشیار کی دستیابی اور روس کے دوسرے علاقوں سے اس کے رہن سہن میں فرق کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ وسط ایشیا میں اگر فی کس آمدنی دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں کم ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں خاندان عام طور پر بڑے ہوتے ہیں۔ شہروں کی آبادی میں تیز رفتاری سے ترقی نہ ہونے کی وجہ سے بے روزگاری اور مکانوں کی قلت کے مسائل نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ دراصل وسط ایشیا کے مسلمان دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں میں آباد ہونا پسند نہیں کرتے جس کی وجہ سے روس کے صنعتی علاقوں میں جہاں زیادہ لوگوں کی ضرورت ہے ان کو منتقل کرنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔

مقامی زبانوں اور ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں روسی حکومت کا رویہ یہ رہا ہے کہ مقامی جمہوریتوں کی سرکاری ملازمتوں میں اکثریت مقامی باشندوں پر مشتمل ہوتی ہے حالانکہ پارٹی کے کارکنوں اور اعلیٰ عہدوں پر روسی رکھے جاتے ہیں جو مقامی کارکنوں کی علاقائیت کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی سوویت پالیسی پر کسی قسم کی نکتہ چینی برداشت نہیں کی جاتی۔

اب تک جو جائزہ پیش کیا گیا ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ روس کے مسلمان اب روسی نظام میں جذب ہو چکے ہیں؟۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں کریمیا کے تاتاری مسلمانوں نے روسی نظام کی سخت مخالفت کی تھی، لیکن اسٹالن نے ۱۹۴۴ء میں انھیں وسط ایشیا، یورال اور سائبیریا میں منتقل کر دیا، جہاں سے اب تک وہ اپنے وطن واپس آنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اسی طرح والگا کے کنارے بسے ہوئے تاتاری اور بشکیریائی چاروں جانب سے روسیوں سے گھرے ہوئے ہیں اور قزاقستان کے باشندے خود اپنی مملکت میں اقلیت بن چکے ہیں لہذا ان کے لیے اب آزادی کا تصوّر بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے بالمقابل جنوبی علاقوں مثلاً تاجکستان، ازبکستان، ترکمانیہ اور آذربائیجان کے مسلمان اور آرمینیا اور گارجیا کے عیسائی ابھی تک اپنے آپ کو روسیوں سے مختلف سمجھتے ہیں، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ علاقے ہمیشہ روس کے زیرنگیں رہیں گے۔ آبادی میں اضافہ کے تناسب سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ مسلمانوں میں اضافۂ آبادی کا تناسب یورپین علاقوں کے مقابلہ میں تقریباً دُگنا ہے اور خود روسیوں میں اضافۂ آبادی کی شرح تقریباً برائے نام رہ گئی ہے، لہذا روس کو اپنی صنعتی ترقی اور فوجی قوت کو برقرار رکھنے کے لیے انہی لوگوں پر انحصار کرنا پڑے گا۔ اس کے اشارے بھی ملے ہیں کہ مسلم آبادی والے علاقوں میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ روسیوں کے لیے ملازمتوں اور ترقی کی راہیں مسدود ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں بسنے والے روسی اب واپس جانے لگے ہیں۔

نسلی اور علاقائی تفریق کی ہمت افزائی کا نتیجہ چند مہینوں قبل آذربائیجانی اور دوسری قومیتوں کے باشندوں کے درمیان فساد کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ یہ فسادات اس قدر شدید تھے کہ روسی حکومت کو انھیں دبانے کے لیے فوج کا استعمال کرنا پڑا۔ یہ خبر بھی آئی ہے کہ فسادات کے دوران آذربائیجانی لوگوں نے اسلامی پرچم استعمال کیا اور روسی حکومت کے خلاف نعرے لگائے۔ ایک دوسری خبر کے مطابق ایشیائی علاقوں میں روسی سرکاری کارکن اپنے کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں اور روسی علاقوں میں ان کی واپسی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

اسلام سے روسی مسلمانوں کی وابستگی پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اشتراکی حکومت کے قیام کے بعد اسلامی تعلیمات پر عمل کے سلسلہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں اس کے نتیجے میں یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اسلام سے اپنی وابستگی کا کھلم کھلا اظہار کر سکیں، لیکن روسی حالات کے مبصر

اس پر متفق ہیں کہ مسلمان اب بھی ختنہ، نکاح اور تدفین میں اسلامی رسوم کی پابندی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ خبریں موصول ہو جاتی ہیں کہ مشترکہ فارموں کے منیجر عیدالاضحیٰ کے موقع پر سرکاری ملکیت کی بھیڑیں مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں جب روسی فوجوں میں شامل کچھ مسلم فوجیوں کی لاشیں قزاقستان کے صدر مقام الماعطا (Alma ata) کو واپس لائی گئیں تو روسیوں نے انھیں فوجی اعزاز کے ساتھ روسی قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا جس کی وجہ سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کیونکہ مقامی لوگوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ فوجی مسلمان تھے لہذا انھیں مسلمانوں کی طرح انھیں کی قبرستان میں دفن کیا جانا چاہیے۔ بالآخر روسیوں کو مقامی آبادی کے مطالبہ کو ماننا پڑا۔ روسی حکومت کی اسلام دشمن کارروائیوں سے بھی لوگوں کی اسلام دوستی پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ روس نے ۱۹۸۳ء میں انچالیس (۴۹) اسلام مخالف کتابیں شائع کیں جب کہ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں ان کی تعداد علی الترتیب ۲۱ اور ۳۸ تھی۔ جولائی ۱۹۸۲ء تاشقند میں ایک خفیہ پریس کا پتہ چلایا گیا جس میں اسلامی لٹریچر کی طباعت کی جارہی تھی۔ ازبکستان کے شہر نما گاؤں میں جون ۱۹۸۴ء میں اسلامی مطبوعات شائع کرنے والے ایک ایسے زیر زمین ادارہ کا انکشاف ہوا جس کی شاخیں تاشقند تک پھیلی ہوئی تھیں۔ روسی اخبارات میں شائع خبروں میں بتلایا گیا تھا کہ اس ادارے نے مقامی زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی کتابیں چھاپ کر فروخت کی تھیں جن کی تعداد کم از کم ۱۲۰۰ تھی۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کی بیخ کنی کے باوجود اس کی تعلیم خفیہ طور پر گھروں میں دی جاتی ہے، مارچ ۱۹۸۵ء میں اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کردہ کیسٹ ضبط کرنے کی خبر روسی اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔

اسلامی طرز زندگی پر روسی مسلمانوں کے اب تک قائم رہنے کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ ان کے خاندان متحد ہوتے ہیں جن کے بزرگوں کی عزت کی جاتی ہے۔ زیادہ بچوں کو وہ معیوب ہونے کے بجائے مستحسن سمجھتے ہیں۔ شہروں میں رہنے والے روسی مسلمانوں نے مغربی لباس اور روسی زبان کو قبول کیا ہے لیکن وہ گھروں میں اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتے ہیں اور روسیوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا پسند نہیں کرتے۔ روسی حکومت نے مسلم علاقوں میں مذہبی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کئی بورڈ قائم کر دیے ہیں جن کا کام حکومت کی پالیسیوں کی حمایت کرنا اور غیر ملکی مہمانوں کو یہ یقین دلانا ہے کہ روسی مسلمان اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں آزاد ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان مذہبی اداروں کے سربراہ

کلیتاً روسی حکومت کے آلہ کار کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ روسی حکومت سے مسلمانوں کی وفاداری کے عوض کچھ نہ کچھ سہولتیں بھی حاصل کرلیں، چنانچہ ان کی کوششوں سے کئی کئی مسجدیں واگذار کی گئی ہیں۔ سرکاری مذہبی اداروں کے اکثر کارکن عربی زبان پر عبور رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے جامعہ ازہر، مراکش، لیبیا یا دمشق میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان علمار نے مزاروں پر حاضری دینے، زکوٰۃ جمع کرنے اور اس قسم کے کچھ دوسرے مذہبی اعمال کے خلاف فتاویٰ جاری کیے ہیں لیکن حکومت کے دباؤ کے باوجود انھوں نے ابھی تک سلوک و تصوّف کے خلاف کوئی بیان دینے سے احتراز کیا ہے۔ یہ علمار اشتراکیت کے خلاف بات کہنے سے احتراز کرتے ہیں بلکہ اس کے بجائے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اشتراکیت اسلامی تعلیمات کا ہی ثمرہ ہے۔ روسی حکومت کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر جریدہ "مسلمان اور مشرقی سویت" میں کوہ قاف کے مذہبی بورڈ کے صدر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ "سویت سائنس نے انسانی علم کی ترقی میں اہم مقام حاصل کرلیا ہے اور انسانی آزادی، مساوات، اخوت اور مختلف اقوام کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ دیا ہے۔ یہ سب قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے حاصل ہوا ہے۔" الحاد کے مبلغین اکثر یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ مذہبی علمار روسی اقلیتوں کے درمیان خصوصاً شمالی کوہ قاف، وسطی ایشیا اور قزاقستان کے عوام کو اسلام کے نام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

علمار کا ایک اجتماع شمالی کوہ قاف میں ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوا تھا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ اشتراکیت کا وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اس اجتماع میں علمار نے اس نظریہ کے جواز میں قرآن کریم کی آیتوں کا حوالہ پیش کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے، اور اشتراکیت کے اصول قرآن اور حدیث سے اخذ کیے گئے ہیں۔ الحاد روس کی سرکاری پالیسی کا ایک اہم جزو ہے، روس کے علمار اسے شرک یا کفر کہنے کے بجائے "جاہلیت" سے تعبیر کرتے ہیں گویا کہ یہ اسلام کے آنے سے قبل کا نظریہ ہے اور وقت کے ساتھ یہ دَور گزر جائے گا۔

اسی طرح روس کی مسلم جمہوریتوں کے سیاسی قائدین اپنے آپ کو روسی کیمونسٹ پارٹی کا نمائندہ ظاہر کرنے کے بجائے عوام کا نمائندہ کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (پارٹی کی نمائندگی کی ذمہ داری عام طور پر ان کیمونسٹ لیڈروں اور افسروں کے سپرد کردی جاتی ہے جو پارٹی یا حکومت میں کسی اہم منصب

پر فائز ہوتے ہیں)۔

مقامی لیڈر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا کام روسی حکومت سے اپنے عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات اور اختیارات حاصل کرنا ہے۔ اس طرح مذہبی اور سیاسی رہنما مختلف نظریات رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو عوام سے قریب رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ حکومت کے استبداد کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں سویت سماج کی پیدا کردہ سیاسی تنظیم سے ہی فائدہ اٹھانا ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنی قومی اور اسلامی شخصیت کو برقرار رکھنے کے لیے انہی تنظیموں سے کام لے رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چند برسوں میں انھوں نے اپنی قومی جمہوریتوں اور مرکزی حکومت میں اپنے جائز مقام کو حاصل کرنے کے لیے خاصی جدوجہد کی ہے۔ آذربائیجانی کامریڈ گیدار علیو (GAYDAR ALIEV) نے روس کے وزیر داخلہ کا عہدہ حاصل کرکے روسی حکومت کی طاقت ور پولیس اور خفیہ محکمہ کے۔ بی۔ جی (K.B.G) کے سربراہ کی حیثیت سے روسیوں کے لیے ایک تشویشناک مثال قائم کر دی ہے۔

روسی مسلمانوں میں ابھی تک اپنے آپ کو روسیوں سے مختلف اور خود کو ترک کے ساتھ مسلمان سمجھنے کا جذبہ فنا نہیں ہوا ہے۔ ان میں روز بروز یہ خیال مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے کہ وہ نسلی اور تہذیبی اعتبار سے روسیوں سے مختلف ہیں اور ان کے مفادات بھی مختلف ہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ روس ان ایشیائی اقوام کو اپنی ثقافت میں جذب کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے برعکس روسیوں اور غیر روسی محکوم اقوام خصوصاً ایشیائی باشندوں کی آبادی کا تناسب بڑھنے کے ساتھ روس مخالف جذبات میں ترقی کی امید کی جا سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مستقبل قریب میں روسی حکومت کے خلاف ایشیائی مسلم آبادی میں آزادی کی کسی تحریک کا امکان نہیں ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان پر روس کی بالادستی ضرور کم ہوتی جائے گی اور اگر دنیا کی سیاسی صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی تو اس سے انھیں آزادی حاصل کرنے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔

مولانا عزیز الرحمٰن علیم
مدرس معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

صاحبِ نور اللغات

مولوی نور الحسن نیّر کاکوروی

بہ حیثیت ایک شاعر

نیّرؔ کاکوروی اس دودمان قلندری کاکوری کے چشم و چراغ تھے، جو صدہا برس علم و عرفان اور تصوّف و سلوک کا سرچشمہ رہا، اس خاندان نے اپنی گرم نوائی اور مسیحا نفسی سے ہزارہا افراد کے مردہ دلوں کو نئی زندگی عطا کی، ایمانی نور اور اخلاقی شعور کے ذریعہ ان کی حیاتِ نو کو آب و تاب بخشی۔

بیشتر بزرگان کرام نے بادۂ علم و عرفان لٹانے کے ساتھ زمانے کے رنگ و آہنگ کے مطابق شعر و ادب کے کوچہ میں بھی قدم رکھا اور زبان و ادب کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ کیا۔

نیّرؔ کاکوروی کے والد ماجد حسان الہند حضرت محسنؔ کاکوروی فن نعت گوئی کے بلند ترین شاعر تھے، موصوف اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کا مقصد شاعری صرف نعت ہے، انھوں نے کیا ہی حسین تمنا کی تھی:

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیرےؐ خالی
نہ مرا شعر، نہ قصیدہ، نہ غزل

یہ خواہش ہے کروں میں عمر بھر تیریؐ ہی مدّاحی

نیّرؔ کاکوروی نے ۱۸۶۵ء میں عالمِ وجود میں قدم رکھا، اپنے دادا حضرت حسن بخش اور والد ماجد حضرت محسنؔ کاکوروی کے سایہ عاطفت میں عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم مکمّل کی، زمانے کے رواج کے مطابق والد ماجد کے ایماء پر انگریزی تعلیم کا آغاز کیا، جس کا اختتام قانون کے امتحان پر ہوا

اور اس کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔

نیرؔ کاکوروی بچپن ہی سے ذہین الطبع واقع ہوئے تھے، ادب اور شعر و شاعری سے کافی دلچسپی تھی۔ یہ لگاؤ اور دلچسپی منشی نعیم الدین نعیمؔ کی وجہ سے پیدا ہوئی، جو نیرؔ کے ماموں زاد بھائی تھے، چوں کہ منشی نعیم الدین کو شعر و سخن کا ذوق زیادہ تھا، عاشقانہ اشعار خوب کہتے تھے اور مولوی محمد محسن سے اصلاح لیتے تھے، ان کا پرتو نیرؔ کاکوروی پر بھی پڑا، چنانچہ چھ سات برس کی عمر ہوگی کہ حسب ذیل اشعار ان کی زبان سے اکثر سُنے جاتے تھے:

طفلی میں بھی شادی متوحش رہی ہم سے
چھٹی نہ ملی جمعہ کو بھی شنبہ کے غم سے

پھولے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے
پانی بھرے گھٹا، ترے بالوں کے سامنے
دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریف بوئے مشک، غزالوں کے سامنے

والد ماجد مین پوری میں ایک مدت تک پیشۂ وکالت کے سبب مقیم رہے، نعتوں کا بڑا حصہ انھوں نے مین پوری کی فضا میں لکھا تھا، وہاں کے عوام و خواص میں حضرت محسنؔ ہر دل عزیز تھے۔ لیکن جب ۱۹۰۵ء میں حضرت محسنؔ کا انتقال ہوگیا تو مین پوری کے صاحب ذوق اور حضرت محسنؔ کے عقیدت مندوں نے یادگارِ محسنؔ منانے کا فیصلہ کیا جس کی صدارت کے لیے حضرت نیرؔ سے درخواست کی گئی۔ حضرت عبدالواحد فداؔ نے جن کو حضرت داغؔ سے شرف تلمذ تھا اور حضرت محسنؔ کے ارادت مندوں میں سے تھے از راہ شفقت کہا کہ میر مشاعرہ کو غزل ضرور پڑھنا ہوگی، لہذا میں ایک غزل آپ کی طرف سے لکھے دیتا ہوں، اسے اپنی طرف نسبت کر کے پڑھ دیں، لیکن نیرؔ مرحوم کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا، خود ہی غزل کہی اور ۲ جون ۱۹۰۶ء کو محفل مشاعرہ کے انعقاد پر سنا دی۔ غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

دل کے پردے میں نظر آئے وہ جلوا کس کا
آپ ہی آپ جو کھنچ جائے وہ نقشا کس کا

غیر بھی سُن کے ہوں برہم وہ شکایت کِس کی
لب پہ آ آ کے جو رہ جائے وہ شکوا کِس کا
دل سا ہم درد چھٹا اپنے ہوئے بیگانے
ظلم غیروں سے بیاں کیجئے کِس کا کِس کا
اس کے کوچے کو تو مقتل ہی بنا دیکھا ہے
رکھ لیا نام مریضوں نے مسیحا کِس کا
دل کے کھونے کی شکایت ہے دل آجانے پر
اے آتش تم نے یہ انداز اڑایا کِس کا

اوّلاً آپ نے آتش تخلص رکھا بعد میں نیر کر لیا، کچھ دنوں بعد آخری مصرع کو بعد ترمیم یوں کر لیا:

نیّر انداز نرالا یہ اُڑایا کِس کا

اب نیّر مرحوم نے باقاعدہ مشق سخن شروع کر دی، کسی سے اصلاح لینا گوارا نہ تھا، صنائع بدائع کا درس والد ماجد سے حاصل کر چکے تھے، لیکن علم عروض سے آشنائی نہ تھی، اب اس علم کے اصول و قواعد پر عبور ضروری معلوم ہوا، عروض کی کتب متداولہ کا مطالعہ شروع کیا۔ بحریں یاد کیں، ان زحافات کی فہرست لکھی جو صرف اردو میں مستعمل ہیں، کچھ ماہ بعد اپنے مطالعے ذوق نظر اور اساتذہ کے پہلو میں رہتے رہتے ایک باقاعدہ شاعر بن گئے اور پُر وقار محفلوں میں باقاعدہ شرکت کرنے لگے۔

انہی ادبی محفلوں اور شعر و شاعری کی دنیا نے موصوف کو ایک ایسا لغت تیار کرنے پر آمادہ کیا جس کی ضرورت واقعی اردو زبان و ادب کو تھی۔

چنانچہ ۱۹ر فروری ۱۹۱۴ء کو ہردوئی کی نمائش کے پنڈال میں ایک محفلِ مشاعرہ میں شریک اور اس کے رکن رکین بھی تھے، بہت سے شعرا اپنا اپنا کلام سُنا کر داد تحسین حاصل کر رہے تھے: مصرع طرح تھا:

"ہم گلستاں میں رہے قطرۂ شبنم ہو کر"

جناب نیّر نے بھی چند اشعار کہے تھے:

کچھ عجب طرح سے کٹتے ہیں مرے لیل و نہار
دن بھی رہتا ہے مرے گھر میں شبِ غم ہوکر
ناتوانوں کی یہ صورت ترے کوچے میں رہی
درد کی طرح اٹھے گر پڑے شبنم ہوکر
اور تکلیف بڑھی جس قدر ادراک بڑھا
کچھ بھی راحت نہ ملی جوشِ جنوں کم ہوکر

اسی زمین میں ایک شعر تھا:

بے حقیقت ہے یہ دنیا کا بگاڑ اور بناؤ
ہم نے سب دیکھ لیا درہم و برہم ہوکر

پہلا مصرع کسی دوسرے شاعر کا تھا اور مصرع ثانی نیّر نے تضمین کیا تھا، اس میں "درہم و برہم" بمعنی پست و بلند استعمال ہوا تھا، صاحب ذوق شرکا محفل نے کہا اہلِ فارس "درہم و برہم" بمعنی خفا و ناراض بولتے ہیں، پریشان یا تہ و بالا کی جگہ مستعمل نہیں، مولانا نے اپنی بات کی دلیل میں مصحفی جیسے مسلم الثبوت استاد کا شعر سنداً پیش کیا:

تم کو نصیب روز بنانا ہو زلف کا
اپنا تو حال درہم و برہم بہت ہے یاں

اسی "درہم و برہم" کے قضیے نے علامہ موصوف کو اردو زبان کا ایک ایسا لغت تیار کرنے پر اُکسایا جس میں اسناد کا ہونا ہر قیمت ضروری ہو، لہٰذا آپ نے اپنی زندگی کا مقصد زبان و ادب ہی کی خدمت قرار دے دیا۔

نیّر مرحوم نے جس ذوق و شوق سے شعر گوئی کا آغاز کیا تھا، نور اللغات کی تدوین، الفاظ و محاورات کی جستجو، مستند شعرا کے کلام کی ورق گردانی جیسی مصروفیات نے اس کی مہلت ہی نہ دی کہ وہ شاعری کی طرف خاطر خواہ توجہ کر سکیں، لیکن جو کچھ ان کی فکرِ رسا اور نوکِ قلم نے لکھا وہ زبان و ادب کا ایک بیش بہا خزینہ ہے۔

نیّر مرحوم شعر و ادب کی دنیا میں سادہ اور سلیس انداز کے رسیا تھے زبان میں خواہ مخواہ

ثقیل اور نامانوس الفاظ کی ٹھونس سے انھیں بے حد نفرت تھی وہ چاہتے تھے کہ سلاست و روانی اور سادگی و صفائی سے تصویر کا رُخ اگر سامع کے سامنے آجائے تو گویا شاعر و فن کار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ورنہ اس کا تخلیقی عمل محض صنعت گری اور بے معنی تکلفات کے بوجھ تلے دب جائے گا۔ انھوں نے کہا:

"اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شاعری بنی نوع انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جو اس وقت پُراثر اور دل گداز ہوتا ہے جب اس میں عالی خیالی کے ساتھ واردات قلبی کا سادگی سے اظہار ہو، یعنی بناوٹ اور تکلف سے کام لیا جائے تو وہ فطری جذبہ نہیں اور نہ اس میں اثر کی مقناطیسی قوت ہوگی۔"

(رسالہ 'سہیل' علی گڑھ دسمبر ۱۹۲۶ء)

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نفس انسانی کا دنیا میں فنا ہو جانا
میری آنکھوں میں ہے بندے کا خدا ہو جانا

خوش ہیں عشاق جو ہوتے ہیں نئے روز ستم
درد نے سیکھ لیا بڑھ کے دوا ہو جانا

عشق کی بھول بھلیوں میں نہ بھٹکے نیّرؔ
اے چمک درد کی تو راہ نما ہو جانا

انسان جن گرد و پیش کے حالات سے دوچار ہوتا اور جس ماحول میں سانسیں لیتا ہے اس کا ذہن و دماغ، قلب و جگر اسی میں چلتا اور ڈھلتا ہے اور اس کے تن بدن سے وہی خوشبو نکلتی و پھیلتی ہے۔ نیّرؔ مرحوم کی گھریلو روحانی فضا، دین و مذہب کے پُر نور ماحول میں اس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ افکار و نظریات، زبان و گفتار، گندے و فرسودہ عناصر سے آلودہ ہو سکتے ہیں۔ اس پر مستزاد گردش روزگار اور مغربی ماحول کے تیز رو قدموں نے اس حساس انسان کو اور بھی سنجیدہ و متین بنا دیا تھا، ایسے میں ہوسناکی اور عشق و عاشقی کے مضامین کی بندش ایک فعل عبث تھی، تغزّل سے سخت متنفر اور بیزار تھے۔

نیّر مرحوم انھیں مضامین کی تلاش میں رہے جن سے ان کے قلب و جگر کو تسکین حاصل ہو، اسی لیے ان کی غزلوں میں بھی رب ذوالجلال اور سرور کائنات کی محبت و عقیدت اور آپ سے شرفِ ملاقات کی آرزو کا پہلو بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔

الٰہی مجھ کو ناکامی سے مایوسی نہیں ہوتی
تری رحمت سے اتنا بڑھ گیا ہے حوصلہ دل کا

کچھ تو محشر میں بھی ہے بندہ نوازی منظور
ورنہ نیّر کے بلانے کی ضرورت کیا ہے

دلِ بے تاب کی اس بت کو خبر ہے کہ نہیں
تیری آہوں میں خدا جانے اثر ہے کہ نہیں
جس کی رگ رگ میں کھٹک ہو وہ بتائے کیوں کر
درد دل ہے کہ نہیں، درد جگر ہے کہ نہیں
گنبدِ سبز میں آرام سے سونے والے
اپنے نیّر کی تجھے کچھ بھی خبر ہے کہ نہیں

نیّر کاکوروی، جس دودمان عالی کے گوہر شب چراغ تھے، جن نفوس قدسیہ کے زیر سایہ پروان چڑھے اور نعت پاک کے جس گلشن بہار کے جھونکوں نے ان کے مشام جان کو معطر کیا، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ شعر و ادب کا ذوق عالی رکھتے ہوئے نعت مبارک کے حسین کوچوں میں قدم نہ رکھتے۔

والد ماجد نے بیٹے کی پرورش و پرداخت میں خصوصی دلچسپی لی تھی، نعت کا جو کچھ حصہ حضرت محسن شام تک موزوں کر لیتے اسے بار بار جناب نیّر سے ورد کراتے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ محسن کے رنگ و آہنگ کو حضرت نیّر نے بھی قبول کر لیا۔ انھوں نے فخر کے ساتھ کہا تھا:

نعمتیں ہونے لگیں تقسیم جب روزِ ازل
دردِ دل پورا کا پورا رکھ دیا میرے لیے

نعت کی وادی میں قدم سنبھال کر چلنا پڑتا ہے، اس میں ذرا سی غفلت اور کوتاہیٔ نظر سے شاعر حدِ ادب کو پار کر جاتا ہے۔ بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے۔ بقول عرفیؔ :

عرفیؔ مشتاب کیں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

موصوف نے والد ماجد کی تربیت اور ان کے کلام کی ورق گردانی سے یہی سیکھا تھا، اس میں توازن و اعتدال برقرار رکھنا ہی اپنے مقصد کو پا لینا ہے، اسی لیے آپ کی نعتوں میں توازن کے ساتھ قرآن و حدیث کے معانی و مطالب کا عکس نظر آتا ہے، الفاظ کی ترتیب موصوف کی تھی لیکن فکری سرچشمہ ذات باری تعالیٰ اور رحمۃ للعالمین تھے، آپ کے کلام میں نکتہ سنجی اور رمز شناسی کے ساتھ زبان دانی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو "شمائل نبوی" سے چند اشعار :

اللہ تیری شان کی یہ جلوہ گری ہے ۔۔۔ چلتی ہوئی یہ سانس نسیمِ سحری ہے
ارماں نہیں چھپتا ہے وہ شوخی سی بھری ہے ۔۔۔ اک شمع ہے فانوس میں شیشے میں پری ہے

جس دل میں چمک ہی نہ ہو پھر نور کہاں ہے
خالی جو تجلی سے ہو وہ طور کہاں ہے

کیا جذبۂ صادق نے دکھائی مجھے تاثیر ۔۔۔ آنکھوں میں کھنچ آئی حرم پاک کی تصویر
دامانِ نگہ بجھ کے رہے کس لیے دل گیر ۔۔۔ ہم چشم مصلّٰی کا بنے واہ رے تقدیر

ہر بات بتاتی ہے پلک صاف جھپک کر
مصروف ہوئی سعیٔ صفا میں وہ لپک کر

جھکتی نہ اگر رحمتِ عالم سوئے پستی ۔۔۔ معمور نہ ہوتی کبھی آدم کی یہ بستی
افلاک رسالت کی نہ ہوتی کہیں ہستی ۔۔۔ ایمان کے تاروں کے لیے خلق ترستی

یہ مہر نہ ملتا کبھی یہ ماہ نہ ملتا
بالفرض یہ ملتے مگر اللہ نہ ملتا

۱۹۰۸ء میں ایک مسدّس "خورشید بدر" لکھا، اس کی تدوین و ترتیب میں جناب نیّر نے اپنی فکری و ذہنی صحت مندی سے پوری طرح کام لیا۔ جب بھی موقع ملتا دو چار شعر موزوں کر لیتے۔ یہ مسدس موصوف کی زبان دانی، نکتہ آفرینی، تشبیہ و استعارے پر عبور، خیالات کی پاکیزگی، کردار کی شرافت اور قرآن و حدیث سے محبت اور نبی کریم سے عشق کا پتہ دیتا ہے۔ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے اس مسدّس پر تبصرہ کرتے ہوئے (اردوئے معلیٰ علی گڑھ، جولائی ۱۹۱۱ء میں) لکھا تھا:

"اس مسدس میں جملہ لطائف شعری موجود ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، صنائع سب قابل مدح و ثنا ہیں، بیان سلیس اور زبان فصیح ہے، ..... کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نبی ﷺ میں جناب نیّر کو بھی وہی شرف خصوصیت حاصل ہے جو ان کے مقدس والد مرحوم کو تھا۔"

اب مسدّس کے چند بند ملاحظہ فرمائیں، جو حالات غزوۂ بدر سے متعلق ہیں، یہ بات ذہن نشین رہے کہ پندرہ رمضان شریف کو لشکر اسلام بدر کے میدان میں عشاء کے وقت آیا۔

آئی ہے آج رات عجب آن بان سے — مہ ہے جلو میں مہر درخشاں کی شان سے
ظلمت کا نام مٹ گیا سارے جہان سے — اُتری زمیں پہ رحمتِ حق آسمان سے
مشتاق کو یہ شب ملی عزّت تو دیکھئے
لیلیٰ ہے گھر میں قیس کی قسمت تو دیکھئے

یہ رات ہے کہ دیدۂ مازاغ کی ضیا — طوطی سواد طور کا یا بولتا ہوا
والّلیل پہ ہے سورۂ والفجر حاشیا — لکھا ہوا ہے یا شب معراج کا پتا
نازل زمیں پہ قدرت پروردگار ہے
کیسی خزاں یہاں تو ہمیشہ بہار ہے

سرو چمن بہ شکل علم سر فراز ہے — مہندی کی ہر روش صف اہلِ نماز ہے
بلبل نیاز مند گل بے نیاز ہے — سنبل شبیہ حضرت گیسو دراز ہے

لالہ ہے سر بکف کہ جو موقع ذرا ملے
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں جا ملے

قمری نے کیا اذاں پڑھی مینار سرو پر | ہر شاخ نخل بہر دعا ہے جھکائے سر
اٹھی وضو کو موج لب جوبچشم تر | سبزہ نے جا نماز بچھا دی اِدھر اُدھر

ناز و نیاز کی وہ جماعت بپا ہوئی
بلبل کی کیوں قضا ہو جو گل کی ادا ہوئی

اب نعت اور حلیہ مبارک پہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

محتاج اس کو شوق میں حاجت روا کہیں | ہم سے گناہ گار شفیع الوریٰ کہیں
پابند شرع یوں تو حبیب خدا کہیں | وارفتگی بڑھے تو خدا جانے کیا کہیں

توحید میں شریک کوئی دوسرا نہیں
لیکن خدا حبیبِ خدا سے جُدا نہیں

خُلقِ عظیم، لطفِ خدا، شاہِ دوسرا | نورِ حُدوث، ماہ قِدَم، مہر کبریا
فانوس و شمع و شعلۂ شمع خدا نما | فخر رسل، حبیبِ خدا، شاہِ انبیا

حسن بیاں کو خاص شرف ہے قبول کا
آنکھوں میں پھر رہا ہے سراپا رسول کا

تصویر بے مثال ہے چہرہ حضور کا | نقشہ جما ہوا ہے یہاں شمع طور کا
خیرہ نگاہ ہوتی ہے عالم ہے نور کا | کیوں نشہ چھا گیا ہے شراب طہور کا

آئینہ جمال الٰہی ہے رو برو
لا یمکن الثناء کما کان حقہ

نزاکت خیال و نکتہ سنجی:

پتلی سیاہ ڈورے سپیدی ہیں لال لال | آنکھیں بنی ہیں امت مرحوم کی مثال
ہم سے سیاہ کاروں کا پتلی میں ہے جمال | بینا دلوں کا رنگ سپیدی میں ہے کمال

چھائی شفق ہے آنکھ میں خون شہید کی
اللہ کیا رسائی ہے مشتاق دید کی

پلکیں دراز گوش مبارک ہیں دل پسند مظہر شعاع نور کی ہے بینیٔ بلند
رخسارے نرم نرم تو نازک ہیں جوڑ بند باتیں ہیں معجزہ تو دہن حق کی چند بند
تصویر خامشی میں ہے راز و نیاز کی
ہنسنے میں اک کلی ہے گل نیم باز کی

سب سے آخر میں سراپائے رسول مقبولؐ کی تکمیل کے بعد اظہار تشکر یوں فرماتے ہیں:

صد شکر کامیاب ہوئی اپنی آرزو آنکھوں میں ہے رسول کی تصویر ہو بہو
لازم ہے کر کے آب خجالت سے اب وضو باصد حضور قلب کھڑے ہو کے قبلہ رو
پاکر سہارا آپ کا اپنی دعا کے ساتھ
باصد ادب یہ عرض کروں میں اٹھا کے ہاتھ

اے رب ذو الجلال توانا کے ناتواں اے ناز مفلسان و نیاز تونگراں
اے نور آسماں و زمیں سرّ دو جہاں اے راز دار حکمت پوشیدہ و عیاں
ذرہ کی تو چمک ہے تو قطرہ کی آب ہے
جس دل میں تو نہیں ہے وہ خانہ خراب ہے

خاک اس دہن میں جس میں نہ ہو تیری گفتگو خوں ہو وہ دل کہ جس میں نہ ہو تیری آرزو
ویران ہو وہ دشت نہ ہو جس میں تیری ہو وہ باغ ہو خراب نہیں جس میں تیری بو
جنت ترے فراق میں اک سرد آہ ہے
دوزخ ترے وصال میں ترچھی نگاہ ہے

اے رب کارساز یہ ہے میری التجا آساں ہو تیری راہ کا ہر ایک مرحلا
شکوہ فلک سے ہو نہ مجھے بخت سے گلا تیرے حضور کی مجھے جاگیر ہو عطا
وحدت دوئی کے رنگ میں یوں روبرو رہے
آنکھوں میں ہو رسول ترا، دل میں تو رہے

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیاں

دین بمقابلہ دنیا:

ان سطور کی اشاعت تک ہو سکتا ہے بلغاریہ کے مسلمانوں کی جلاوطنی کا واقعہ پرانا ہو چکا ہو، لیکن ایمان وعزیمت اور دین کے لیے دنیا قربان کرنے کی جو روشن مثال بلغاروی مسلمانوں نے قائم کی ہے اس کی تابانی مرورِ ایام کے ساتھ بڑھتی جائے گی، یہ درست ہے کہ ان کے آبار واجداد ترک تھے لیکن ان کی کئی پشتیں بلغاریہ کی سرزمین میں پیوندِ خاک ہو چکی ہیں، اب تو انہیں یہ بھی یاد نہ ہوگا کہ ان کے آبار واجداد ترکی کے کس خطے سے آئے تھے SON OF THE SOIL (فرزندِ زمین) کی تعریف ان پر پوری طرح صادق آتی ہے، اس کے باوجود انھیں جلاوطنی کا زخم سہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ دین وایمان سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے جو کمیونسٹ عناصر کے نزدیک سنگین ترین جرم ہے۔

بلغاریہ کے مسلمان کمیونسٹ حکومت کی چیرہ دستیوں کا شکار برسوں سے ہو رہے تھے ان پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ اپنا اور اپنی بستیوں کے اسلامی نام بدل دیں۔ اسلامی عبادات اور دینی شعائر سے دست کش ہو جائیں، اسلامی طریقے کے مطابق نکاح نہ کریں اور نہ اسلامی طریقے کے مطابق اپنے مُردوں کو دفن کریں، بہ الفاظ دیگر اپنی اسلامی شناخت باقی نہ رکھیں، ملحدانہ معاشرہ میں پورے طور پر ضم ہو جائیں، مسلمانوں نے اس کی مزاحمت کی اور اپنی شناخت کھونے پر آمادگی ظاہر نہیں کی جس کے نتیجے میں ان پر روزی کے دروازے بند کیے گئے، قید وبند کی سزائیں دی گئیں، گھروں میں شب کی تاریکی میں چھاپے مارے گئے، انھیں آرام وچین کی زندگی سے محروم کیا گیا، غرض کمیونسٹ حکومت نے ہر طرح

کا دباؤ ڈالا، ظلم و ستم کا ہر نسخہ آزمایا، لیکن ترک مسلمانوں کے ذہن و دماغ سے ایمان کا نشہ نہ اُترا اور نہ ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہوئی۔ کیمونسٹ عناصر بوکھلا اٹھے اور انھوں نے اپنی دانست میں سب سے بڑی سزا کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کو بلغاریہ کی سرزمین سے ڈھکیلنا شروع کر دیا، ایک اندازے کے مطابق روزانہ دو سو خاندان سرحد پار کر کے ترکی میں پناہ لینے لگے، اس طرح پناہ گزینوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔

دین سے ربط و تعلق اور اسلامی شعائر سے وابستگی ترک مسلمانوں کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ وہی ترک مسلمان ہیں جنھوں نے ذبح ہو جانا گوارہ کر لیا لیکن حرم کے احترام میں اپنے دفاع کے لیے ہاتھ نہیں اُٹھایا، ایک مرتبہ پھر انھوں نے دین پر دنیا کو قربان کر کے دین سے اپنی اٹوٹ وابستگی کا ثبوت فراہم کیا ہے، ان کی قائم کردہ ایمان و عزیمت کی یہ تابندہ مثال ہم کمزور مسلمانوں کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوگی اور ان کی جلا وطنی کی یاد کمزور دلوں کے لیے تقویت کا باعث ہوگی۔

ہالینڈ میں مسلمانوں کی ثقافتی سرگرمیاں:

چار سو برس تک انڈونیشیا ہالینڈ کے زیر اقتدار رہا ہے، اس کے نتیجے میں انڈونیشی مسلمانوں کی ہالینڈ میں آمد و رفت شروع ہوئی، کچھ نے وہاں مستقل بود و باش اختیار کر لی، اس طرح انڈونیشی مسلمانوں کے ذریعہ ہالینڈ کے قدیم باشندوں کا مسلمانوں اور اسلام کا تعارف ہوا، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے رہن سہن سے کچھ لوگ متاثر ہوئے اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ الدعوۃ ریاض میں شائع شدہ ایک مراسلہ کے مطابق ہالینڈ میں اس وقت تقریباً چار لاکھ مسلمان رہائش پذیر ہیں، ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دوسرے ممالک سے جا کر آباد ہو گئے ہیں اور وہ لوگ بھی جو ہالینڈ کے قدیم باشندے ہیں، اسلامی تعلیمات کی کشش نے ان کے دلوں کو موہ لیا ہے۔

ہالینڈ کے دستور نے مذہب کی پوری آزادی دے رکھی ہے، اپنی پسند کا دین اختیار کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے پر کوئی قدغن نہیں ہے، کوئی اپنا مذہب تبدیل کرلے تو کوئی طوفان نہیں اٹھتا، مذہب تبدیل کرنے والے اور اس کے ہم مذہب دوسرے افراد کی جان و مال کو کوئی

خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ دستور نے جس چیز کی ضمانت دی ہے وہ محض کاغذ کی زینت بن کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس پر عمل بھی ہوتا ہے۔ عبادت گاہوں کی تعمیر میں نہ صرف یہ کہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کیجاتی بلکہ حکومت مالی تعاون کرتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً اکتیس مسجدیں حکومت کے مالی تعاون سے تعمیر ہوئی ہیں، اسلامی شریعت کے مطابق ذبیحہ کی بھی حکومت نے پوری آزادی دے رکھی ہے، بالفاظ دیگر ہالینڈ میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے اور اسلام کے فروغ کی راہ میں کوئی قانونی دشواری حائل نہیں ہے۔

تمام تر سہولتوں کے باوجود مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ایسا ہے جس سے اہلِ درد فکر مند ہیں، اس مسئلہ کا تعلق کسی قانونی پیچیدگی یا سرکاری رکاوٹ سے نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب قلتِ سرمایہ ہے، سرمایہ کی کمی کے سبب مسلمانوں کی اپنی درسگاہیں نہیں ہیں، اگر ہیں تو ضرورت سے بہت کم ہیں، مجبوراً مسلم بچے کنیسا کے تحت قائم اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ کنیسا نے عیسائیت کی تبلیغ اور اس کے فروغ کے مقاصد کے تحت اسکول قائم کیے ہیں، وہاں اس کی توقع فضول ہوگی کہ مسلم بچوں کو دینی تعلیم اور اسلامی عقائد سے روشناس کرایا جائے گا۔ اس لیے حالات پر نظر رکھنے والے خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایسی درسگاہوں میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے بچے عیسائیت کے قالب میں ڈھل کر اسلام سے کہیں بیگانہ نہ رہ جائیں، اور اپنی شناخت کھو نہ دیں، اس صورت حال کی تلافی کے لیے بعض تنظیمیں کوشاں ہیں، اور اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے مختلف تدبیریں کر رہی ہیں، اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً دینی اجتماعات کا اہتمام کرتی ہیں جہاں تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور عقیدہ سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں، تقریروں اور سیمینار کا نظم ہوتا ہے، دینی کتابیں پڑھنے کو دی جاتی ہیں، کیسٹ سے دینی موضوعات پر تقریریں سنوائی جاتی ہیں، تعطیلات کے زمانے میں تربیتی کیمپ لگائے جاتے ہیں، ان سرگرمیوں کی بدولت مسلم بچے دین سے بالکل بے بہرہ تو نہیں رہتے لیکن یہ جز وقتی پروگرام کافی نہیں اس سے ان کی ذہنی و فکری تربیت پورے طور پر نہیں ہو پاتی ہے، جو تنظیمیں اس نوع کے پروگرام مرتب کرتی ہیں اور اس کے لیے جسمانی اور مالی قربانی پیش کرتی ہیں، وہ قابلِ قدر ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں، البتہ دینی درسگاہوں کی کمی کا مسئلہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے، اس سے اغماض اور چشم پوشی مناسب نہیں ہے، سادہ دلوں پر

عیسائی درسگاہوں کے زیر اثر جو نقوش ثبت ہو جائیں گے وہ چند تقریروں یا ایک دو تربیتی کیمپوں سے دھل نہیں پائیں گے، اس لیے ابتدا ہی سے دینی نقوش ثبت کرنے کی فکر وسعی ہونی چاہیے، یہ کام اپنی مستقل درسگاہوں کے قیام کے بغیر ممکن نہ ہو سکے گا۔

اسلامی خطّاطی کی نمائش:

ایک اخباری اطلاع کے مطابق سوئزرلینڈ کے شہر زیورخ میں اسلامی خطاطی پر مشتمل ایک نمائش ہو رہی ہے، محرم ۱۴۰۱ھ سے یہ نمائش اردن کے دارالسلطنت عمان میں منتقل ہو جائے گی. اس نمائش میں اسلامی خطاطی کے نادر اور بیش قیمت نمونے پیش کیے گئے ہیں، جن کے بارے میں اہلِ فن کی رائے ہے کہ یہ آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔

اسلام نے جاندار چیزوں کی تصویر کشی ممنوع قرار دے رکھی ہے، اس لیے مسلم آرٹسٹوں نے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان جائز میدانوں میں تلاش کیا ہے ان میں ایک اہم میدان خطاطی کا ہے، چنانچہ مسلم خطاطوں نے بیش بہا طغرے تیار کیے ہیں جن کے ذریعہ فن خطّاطی میں اپنی فنّی مہارت کا زندہ ثبوت پیش کیا ہے، اسلامی خطاطی کی اس نوع کی نمائش درحقیقت اس بات کی خاموش دعوت وتبلیغ ہے کہ اپنے ذوقِ فن کی تسکین ناجائز طریقوں ہی پر منحصر نہیں ہے، اسلام نے اس کے لیے جائز و مباح راہیں بھی کھول رکھی ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد:

دو امریکی ماہرین اعداد و شمار نے دنیا کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا جائزہ لینے کے بعد انکشاف کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۸۰ ملین (ایک ارب آٹھ کروڑ) ہے، ان ماہرین کا دعویٰ ہے کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مسلمانوں میں شرح نمو زیادہ ہے، موجودہ رفتار اگر باقی رہی اور اسلام میں نئے لوگوں کا داخلہ اسی شرح سے جاری رہا تو ۲۰۰۰ء تک مسلمانوں کی تعداد ۱۹۰۰ ملین یعنی ایک ارب نوے کروڑ ہو جائے گی، بالفاظ دیگر دنیا کی کل آبادی کا ہر چوتھا فرد مذہب اسلام کا ماننے والا ہو گا۔ مذکورہ بالا انکشاف سوئزرلینڈ کے ایک رسالہ

نے شائع کیا ہے، گزشتہ چند برسوں سے مسلمانوں کے اعداد و شمار، ان کا شرح نمو اور مختلف ممالک میں اسلامی بیداری کے آثار مغربی اخبارات اور رسالوں کا پسندیدہ موضوع ہیں، آئے دن کوئی نہ کوئی تجزیہ شائع ہوتا رہتا ہے، ان کے پس پردہ دراصل یہ ذہن کام کرتا ہے کہ دنیا اور خاص طور سے عیسائی دنیا کے سامنے مسلمانوں اور اسلام کا ہوّا کھڑا کیا جائے، ان کی بڑھتی ہوئی آبادی پر روک لگانے کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں، اسی طرح جس ملک میں اسلامی بیداری کے آثار نظر آئیں اس کو کچلنے کے لیے نئے نئے رنگروٹ تلاش کیے جائیں، مغرب کا آدمی آج بھی اسلام سے خوفزدہ ہے، وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کچھار سے کوئی صلاح الدین ایوبی اٹھے اور اس کے لیے مسئلہ بنے۔ صلاح الدین ایوبی کا وجود تو بڑی بات ہے وہ تو جنرل محمد ضیاء الحق کا وجود بھی برداشت کرنے کا روادار نہیں ہے، اس لیے مغربی اخبارات و رسائل میں مسلمانوں کے اعداد و شمار اور ان کے شرح نمو کے بارے میں جو تجزیاتی مضامین آئیں انھیں اس تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

تطوان میں اسلامی تربیتی اکاڈمی:

مراکش کے مشہور شہر تطوان میں جمعیۃ الثقافۃ الاسلامیۃ (کونسل برائے اسلامی ثقافت) نامی ایک تنظیم قائم ہے جو مسلم نوجوانوں کے درمیان دعوتی اور تربیتی کام کرتی ہے، ندوۃ الشباب العالمیۃ جیسی مسلم نوجوانوں کی دوسری تنظیموں کے تعاون واشتراک سے وقتاً فوقتاً تربیتی کیمپ لگاتی ہے، اس طرح اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں زیر تعلیم نوجوانوں کو فکری غذا فراہم کرنے کی خدمت انجام دیتی ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۲ء میں عالمی سطح کا ایک تربیتی کیمپ کا انتظام کیا جس کا شعار اسلامی اخوت تھا، اس میں اکیس ممالک کے طلبہ شریک ہوئے، اسی طرح ۱۹۸۶ء میں ایک تربیتی کیمپ لگایا جس میں مغرب (مراکش) کے علاوہ خلیجی ممالک کے طلبہ بطور خاص شریک ہوئے، اسی طرح یورپ میں رہائش پذیر یا زیر تعلیم مسلم نوجوانوں نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔

تطوان میں قائم اس ثقافتی کونسل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ شہر یورپ سے قریب تر ہے اور یہاں پر مغربی ممالک کے سفارت خانے ہیں۔ ان کی مختلف کلچرل تنظیمیں ہیں،

ان سفارت خانوں اور تنظیموں کے پاس سرمایہ یا وسائل کی کمی نہیں ہے، اس لیے ان کی جانب سے متعدد تعلیمی اور ثقافتی ادارے مصروف عمل ہیں، اپنے وسائل اور وظائف کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں چنانچہ اس کا اثر نوجوانوں کے افکار، خیالات اور رجحانات پر پڑتا ہے، دوسری طرف تطوان سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر شہر سبتہ کے اندر بہائیت کا مرکز قائم ہے، وہاں سے بہائی مبلغین مسلم نوجوانوں کے عقائد پر شب خون مارنے کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، ان حالات کا سامنا کرنے اور ان کا سدّباب کرنے کے مقاصد کے تحت یہ ثقافتی تنظیم وجود میں آئی ہے، اس کے بانی اور ذمہ دار یونی ورسٹیوں کے صاف ذہن رکھنے والے اساتذہ ہیں، اب ان لوگوں نے اپنے دائرہ کار میں وسعت دینے کے لیے" المجمع التربوی الاسلامی" اسلامی تربیتی اکاڈمی کے نام سے ایک نیا منصوبہ شروع کیا ہے۔

اس اکاڈمی کے تحت کئی ذیلی ادارے ہوں گے جو اپنے اپنے میدان میں کام کریں گے:

۱۔ ایک جامع مسجد مع جملہ لوازمات تعمیر کی جائے گی جس میں دو ہزار نمازیوں کی گنجائش ہوگی، امام اور مؤذن کی رہائش گاہ ہوگی، ۱۶۸۷ مربع میٹر پر مشتمل ایک بڑا صحن ہوگا۔

۲۔ درسگاہ کی عمارتیں تعمیر کی جائیں گی، جس میں ابتدائی، پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کے معیار کی تعلیم الگ الگ عمارت میں دی جائے گی۔ ایک شعبہ ائمہ اور مبلغین کی تیاری کے لیے خاص ہوگا، کمزور طلبہ جو آنے جانے پر قادر نہ ہوں گے ان کے لیے رہائش کا نظم ہوگا، ایک شعبہ مختلف زبانوں کی تعلیم کے لیے ہوگا۔

۳۔ ایک حصہ میں لکچر ہال ہوں گے، بڑی لائبریری ہوگی، اور ایک لائبریری چھوٹے بچّوں کی کتابوں کے لیے خاص ہوگی۔

۴۔ ایک عمارت میں آوٹ ڈور ڈسپنسری ہوگی، ضروری دفاتر ہوں ہوں گے اور بعض ملازمین کی رہائش گاہیں ہوں گی۔

۵۔ اکاڈمی کی عمارت اور اس کے ملحقات کی دیکھ بھال کے مصارف کے لیے ایک تجارتی سنٹر قائم کرنے کا پروگرام ہے، جس میں متعدد دوکانیں ہوں گی، ان کی آمدنی سے اکاڈمی کی ضروریات کا تکفل کیا جائے گا۔

سرمایہ کی فراہمی کے لیے کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد بن المکیؒ العذانی الحسنی اوران کے معاون پروفیسر مصطفیٰ اخویف نے گزشتہ دنوں سعودی عربیہ کا دورہ کیا اور رابطہ کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں، ایک رپورٹ کے مطابق رابطہ اور مؤتمر عالم اسلامی تنظیم کے شعبہ اسلامی اتحاد فنڈ نے تعاون کی پیش کش کی ہے اور اس مقصد کے لیے ایک خطیر رقم کی منظوری دی ہے۔

موسوعۃ التاریخ الاسلامی:

قاہرہ سے آمدہ خبروں کے مطابق مصری وزارت اوقاف کے شعبہ شئون اسلامیہ (اسلامی امور) کی اعلیٰ سطحی کمیٹی نے موسوعۃ التاریخ الاسلامی (تاریخ کی انسائیکلوپیڈیا) تیار کرنے کا عزم کیا ہے۔ خیال ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ سیرت اور سنت نبویہ کے عالمی مرکز کی طرف سے اشاعت پذیر ہوگا۔ دوسری طرف سیرت نبویہ کمیٹی نے جس کے صدر ڈاکٹر محمد طیب نجار ہیں سیرت کے موضوع پر مطالعہ کی تیاری شروع کر دی ہے، جامعہ ازہر میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اور کمیٹی کے رکن ڈاکٹر عبدالعزیز غنیم کے بیان کے مطابق فن تاریخ کے ممتاز اسکالروں سے اس موسوعہ کی تیاری میں مدد لی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد اور وقیع کتاب تیار ہو سکے۔

حفظِ قرآن پر سزا میں تخفیف:

'اخبار العالم الاسلامی' مکہ مکرمہ میں اشاعت پذیر ایک خبر کے مطابق سعودی عرب کے امن عامہ کے ڈائریکٹر جنرل عبداللہ بن عبدالرحمٰن آل الشیخ نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ "الحائر" کے جیل خانہ سے ابھی حال ہی میں ایک قیدی رہا کیا گیا ہے، جس نے جیل میں پورا قرآن شریف حفظ کیا ہے چنانچہ بطور انعام اس کی سزا کی نصف مدت معاف کر دی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ جب سے خادم الحرمین الشریفین فہد بن عبدالعزیز کا اعلان آیا ہے کہ حفظ قرآن کے نتیجے میں نصف سزا معاف کردی جائے گی، اس وقت سے قیدیوں کے اندر حفظ قرآن کا ذوق و شوق بڑھ گیا ہے۔ اس وقت متعدد جیل خانوں کے اندر قیدیوں کی ایک تعداد حفظ قرآن میں نظر آتی ہے۔ دوسری طرف جیل کے ذمہ دار ایسے قیدیوں کے ساتھ عام طور سے رعایت کا معاملہ کرتے ہیں، اور جن لوگوں کا حفظ مکمل ہو جاتا ہے، بغیر کسی پس وپیش کے ان کو رہا کر دیتے ہیں۔

ماهنامه

ذکر وفکر

دهلی

جلد نمبر : (۶) ــــــــ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۴۱۰ھ

شمارہ نمبر : (۶) ــــــــ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۸۹ء

ترتیب

افتتاحیہ	۱۔ مذاکرات	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲
مقالات	۲۔ اسلام اور علم	" " "	۷
جائزے	۳۔ امیر سید عبدالقادر حسنی الجزائری (۲)	مولانا نذر الحفیظ ندوی	
تحقیقات	۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقریت (۲)	پروفیسر حبیب الحق ندوی	
اور	۵۔ وفیات (مشیل عفلق)	سید زبیر احمد	
ادبیات	۶۔ عالم اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیاں	مولانا شفیق الرحمن ندوی	۵۰

مولانا عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

مارکسیت کا دیو آنا ہیبت ناک، ضخیم اور خونخوار تھا کہ اس کی جان نکل گئی مگر اس کا رعب و دبدبہ اب بھی قائم ہے۔ کس کو وہم بھی ہو سکتا تھا کہ ایشیا سے لے کر یورپ تک جس نظام حکومت کا جال پھیلا ہوا تھا وہ مکڑی کا جال ثابت ہوگا، بکھر جائے گا اور وہ بھی آنا فانا، دیکھتے دیکھتے، اسی نسل میں، اور ہم خود اپنی زندگی میں اس کا زوال دیکھ لیں گے؟۔

دس بیس سال پہلے نہیں صرف ڈیڑھ دو سال پہلے تک کون سوچ سکتا تھا کہ یورپ و امریکا کے اخبارات میں اس موضوع پر مقالات و تحقیقات شائع ہوں گے کہ مارکسیت کے بعد دنیا کا نظام؟

یعنی مارکسیت فنا ہو چکی ــــ اب سوچئے کیا کرنا ہے؟

جس نظام حکومت کو برپا کرنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے ہوں، جس کا نام لے کر سیکڑوں عبادت گاہیں مسمار کی گئی ہوں، جہاں خدا کا نام لینا رجعت پسندی ہو، جس قلمرو نے انسان کے جسم ہی کو غلام نہیں بنایا ہو بلکہ اس کی فکر کو بھی ایک سانچے میں ڈھالنا حکومت کا حق سمجھا ہو۔ اس سے محبت و نفرت، پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار بھی چھین لیا ہو۔ "اشتمالیت" کا یہی مفہوم ہے کہ حکومت کو "سوچنے اور سمجھنے" کا رُخ متعین کرنے کا حق ہے، ایسے آہنی حصار بلکہ لعنتی جہنم میں جہاں انسان اور چوپایہ میں کوئی فرق روا نہ رکھا گیا ہو، اس کو "ترقی پسند" کہا جاتا ہو۔ کوئی نیم خواندہ، طالع آزما، بال اور ناخن بڑھالے، تہذیب و اخلاق سے بغاوت کو اپنا شعار بنالے وہ بیک گردش قلم ذہین و زیرک، عاقل و دانا، بن جاتا ہو، انٹلکچوئل ہونے میں دیر نہیں لگتی ہو، ایسے نظام زندگی۔ جس کو آپ مذہب ہی کہیے جس کی گرفت مشرق و مغرب پر گہری اور سخت ہو، افسانوں کے ذریعے، ناولوں کے راستے سے، فلسفہ سیاست کے نام پر، گھر گھر جس کی بازگشت سنائی دے رہی ہو، اس کا مٹنا آسان نہیں ہے، ستر سال کی بین الاقوامی

کرنے کے بعد جو نظام عائد کیا گیا ہو اس کے اثرات چند مہینوں یا ہفتوں میں تو ختم نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اب بھی شام اور عراق کے اخبارات میں اس مرعوبیت کی بازگشت سنائی دے رہی ہے کہ :

"شیر مرا نہیں ہے ذرا اس کو اونگھ لگ گئی ہے"

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السّلام کا قصہ مذکور ہے کہ ان کی روح قبض کر لی گئی تھی، مگر سب سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے عصا کا سہارا لیے کھڑے ہیں اور جنوں سے کام لے رہے ہیں، مدت یہاں تک گزری کہ ان کے عصا کو گھن کے کیڑے کھانے لگے، لکڑی جب اندر سے کھوکھلی ہو کر گر پڑی اس وقت لوگوں کو یقین آیا۔ جو جن ان کی سرکردگی میں غلاموں کی طرح پابند ہو کر کام کر رہے تھے وہ شرمندہ ہوئے اور بولے ہم ناحق اتنے دنوں تک غلامی کی ذلت برداشت کرتے رہے۔ ایک پیغمبر جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے ان سے مزدکیت کو تشبیہ دینا بے ادبی ہے۔ اشارہ صرف اس امر کی طرف ہے کہ کسی کی ہیبت دل پر بیٹھ جائے تو عرصہ تک اس کے مرنے کا یقین نہیں آتا۔ کمیونزم فنا ہو چکا، یہ فلسفہ ناقابلِ عمل اور غیر انسانی ثابت ہو چکا، مگر اب بھی اس کے ہوا خواہ ماننے میں تأمل کر رہے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ " مارا چہ ازیں قصہ، گاؤ رفت و خر آمد"۔ ظاہر ہے روس میں اگر مارکسیت ختم ہو گئی تو زیادہ سے زیادہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے پر پھیلائے گا، کوئی اور ازم آجائے گا، اسلام کا کلمہ تو اس سرزمین پر بلند نہیں ہو رہا ہے۔ جہاں وہ برسراقتدار آئے ہوئے ہیں وہاں کون سا نمونہ انھوں نے قائم کیا ہے کہ ان سے توقع کی جائے کہ دوسری سرزمین کو نہال کر دیں گے۔ ہاں اس پوری داستان میں ایک گوشہ ایسا سامنے آیا ہے جو مسلمانوں کے لیے کچھ کام کا موقع فراہم کر سکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ روس نے ۱۹۱۷ء کے دستور میں ترمیم کر دی ہے جس کے رو سے اس قلمرو کے باشندے اپنے عقیدہ و مذہب کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس ضمن میں عبادت گاہیں وہ استعمال کر سکتے ہیں اور شاید نئی عبادت گاہ بنانے پر سے بھی پابندی اٹھالی گئی ہے۔ اس ترمیم کا سب سے پہلے فائدہ مسیحی مبلغوں اور ان کی انجمنوں نے اُٹھایا، ان کے پاس مکمل فہرست تھی کہ ۱۹۱۹ء سے پہلے کتنی عبادت گاہیں (گرجا) تھیں جو شہروں کی توسیع کے ضمن میں، یا زراعتی فارموں کے لیے مارکوں کے لیے منہدم کر دی گئیں،

کے نام بطور ہدیہ بائیبل کے نسخے بھیجنا شروع کیے جن کی تعداد نومبر ۱۹۸۸ء سے مارچ ۱۹۸۹ء تک دو لاکھ بیس ہزار نسخہ ہے۔

سوویت حکومت نے ایک شرط لگائی ہے کہ کوئی باشندہ اپنے پسند یا اپنے مذہب کی کتاب باہر سے منگانا چاہے تو اس کے لیے زر مبادلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے مشنریوں نے تو روز اوّل سے ہدیہ (گفٹ) کے طور پر انجیل بھیجنا شروع کر دیا۔ مگر مسلمانوں کو ایک تو اطلاع دیر سے ہوئی اور جب اطلاع ہوئی تو ان کو یہ معلوم نہیں کہ کتنی مسجدیں اور کس کس شہر میں آثار قدیمہ کے ماتحت موجود ہیں جو صرف سیّاحوں کے لیے کھولی جاتی ہیں۔ رہا وہ مسجدیں جو منہدم کی جا چکیں ان کا کوئی شمار کسی کے پاس نہیں ہے، نیز یہ کہ قرآن کریم کے کتنے نسخے اصل متن عربی میں وہاں بھیجے جائیں اور کتنے نسخے روسی ترجموں کے ساتھ۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اب ضرورت پڑی تو معلوم ہوا کہ روسی زبان میں یوں تو کچھ ترجمے ہیں، مگر ایک بھی مستند ترجمہ نہیں ہے جس کو مسلمانوں نے کیا ہو یا جس کی علمائے اسلام نے تصدیق کی ہو۔ اور عربی متن پڑھنے والے اس ۷۰ سال میں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، کتنے شہید کر دیے گئے، کتنے ملک بدر کر دیے گئے اور اب ان کے پوتے پرپوتے عربی رسم الخط سے بھی ناواقف ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ کہاں سے اور کس طرح چھپ چھپا کر کچھ لوگ عربی رسم الخط میں قرآن پڑھتے رہے اور "انڈر گراونڈ" یہ انتظام رکھا کہ ان کے بچّے اسلام کے نام سے آشنا رہیں۔

مسلمانوں کی طرف سے ایک قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ شیخ الازہر علامہ جاد الحق علی جاد نے ایک عالم ڈاکٹر محمد ابراہیم جبوتی کو اس کا جائزہ لینے کے لیے روس بھیجا ہے کہ سردست وہاں کتنے نسخے قرآن کریم کے عربی متن میں مطلوب ہیں؟ ایسے ویڈیو کیسٹ جن میں قرآن کا متن، اس کے بعد اس کا روسی ترجمہ ہو، تیار کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ مصر کے سیاسی تعلقات روس سے رہے ہیں بلکہ ایک زمانہ میں امریکہ کے مقابلہ میں روس ہی مصر کا حمایتی تھا اس لیے روسی زبان سے واقف مصر میں کچھ لوگ ہیں۔ قاہرہ میں روسی سفارت خانہ نے اپنے کلچرل بیورو میں روسی زبان سکھانے

بہر حال اب امید کی ایک کرن دکھائی دی ہے کہ امام المحدثین امام بخاری کے وطن بخارا میں اب ان کی الجامع الصحیح کو ہاتھ لگانا جرم نہیں رہے گا، ترمذ کا شہر جس کا نام بھی بدل دیا گیا ہے اب وہاں سنن ترمذی پڑھی پڑھائی جا سکے گی، امام نسفی، البیرونی، خوارزمی کے وطن میں لوگ اعلانیہ اذان دے سکیں گے، مسجدیں صرف سیاحوں کو دکھانے کے لیے نہیں بلکہ قبلہ رو ہو کر سجدہ ریز ہونے والے مسلمانوں کے لیے کھول دی جائے گی۔ امام بخاری کی ہزار سالہ برسی منا کر عربوں کے سیاسی نفوذ کو دعوت نہیں دی جائے گی بلکہ بخاری کی جمع کردہ احادیث کا رواج ہوگا۔ یہ باتیں اب دور کی نہیں قریب کی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان حالات کے بدلنے میں مسلمانوں کے دست و بازو کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ برعکس بات بگاڑنے اور مجرمانہ کردار ادا کرنے میں بعض ایسی حکومتوں کا دخل رہا ہے جو بدقسمتی سے مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک پر قابض تھیں۔ دور کیوں جائیے ترکی میں عدنان مندریس سے پہلے تک لوگ قرآن گھروں میں اور راتوں کو پہاڑوں کے دامن پر یا کسی کھوہ میں جا کر اس طرح پڑھا پڑھایا کرتے تھے گویا حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کا پلان تیار کر رہے ہوں۔

مکہ مکرمہ کی یونیورسٹی جامعہ ام القریٰ میں ایک شعبہ غیر عرب طلبہ کو عربی پڑھانے کا قائم ہے۔ راقم الحروف کے ذمہ بھی اس شعبہ کا ایک گھنٹہ ہفتہ میں دو روز تھا، وہاں ہر ملک کے طلبہ تھے، ترکی طلبہ کو قرآن کریم کی تلاوت میں بہت ممتاز پا کر ان سے پوچھا کہ عرب طلبہ سے بہتر تجوید کے ساتھ آپ کس طرح قرآن پڑھ لیتے ہیں؟ ان میں سے ایک طالب علم نے بتایا کہ ہم لوگ نصف شب کے بعد ایک پہاڑی کے پیچھے جا کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا جو چیز اس درجہ کاوش اور اہتمام سے سیکھی جائے گی وہ اسی درجہ بہتر شکل میں حاصل ہوگی۔

"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ"[۱]

بے شک یہ کتاب ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کی تصدیق برابر ہو رہی ہے اور ہر زمانہ میں ہوئی، اور نہ جانے کتنے الحادی درندے، مارِ سیاہ بن کر راستے میں آئے اور فنا ہوئے، آج "لال کتاب" کو سرخ آندھی اُڑا کر لے گئی کل "سبز کتاب" پر خزاں

کا ایک جھونکا آئے گا، اور "ھشیمًا تذروہ الریاح" کے مانند کر دے گا، خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی اور وہیں رہے گی ۔

'ذکر و فکر' کی چھٹی جلد کا یہ آخری شمارہ ہے، آئندہ ماہ کا پرچہ چوتھے سال کا پہلا شمارہ ہوگا۔ مکہ مکرمہ کے ایک "بزرگ دوست" مولانا محمد مسعود شمیم صاحب نے اس کے ابتدائی پرچوں کو دیکھ کر اپنی دعاؤں، نیک تمناؤں اور کئی سال کے لیے کافی ہونے والی چندہ کی رقم کے ساتھ تحریر فرمایا تھا کہ بچّے کے پاؤں پالنے میں خوب صورت لگ رہے ہیں، "اللہ نظر بد سے بچائے اور پروان چڑھائے" اسی طرح کی دعاؤں اور ہمّت افزائیوں سے یہ پرچہ چل رہا ہے۔ اس تین سال کے عرصہ میں اہل علم نے پذیرائی کی، ہمت بڑھائی، جس سے ہمیں کام جاری رکھنے کا حوصلہ ہوا، دوسری طرف سے ہمّت شکنی اور تحقیر کے خطوط بھی ملے جس سے دل افسردہ ہوا۔ ہم معمولی درجے کے عام انسان ہیں، تعریف سے خوش ہو جاتے ہیں اور توہین سے دل گرفتہ ہوتے ہیں، ان صوفیائے کرام کی خاکِ پا کو نہیں پہنچ سکتے جن کے لیے دنیا کی مدح و ذم یکساں ہوتی ہے، خلق کا اقبال و ادبار (سامنے بڑھنا، یا پیچھے مڑنا) ان کے قلب میں جنبش نہیں ڈالتا۔

سرمدؔ غم عشق بوالہوس را ندہند   سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار   ایں دولت سرمد کس را ندہند

عربی صحافت میں ایک اچھا موضوع چل رہا ہے کہ اس صدی کی بہترین کتابیں کون سی ہیں، جنھوں نے فکر و نظر میں، قدیم نظریات میں یا شعور کی بیداری میں انقلاب انگیز کام کیا ہے۔ 'ذکر و فکر' کے صفحات پر بعض رائیں نقل کی جائیں گی اور یہاں کے علماء و اہلِ فکر کو بھی دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ اپنے علمی تجربات سے ہمارے قارئین کو روشناس کرائیں۔ وباللہ التوفیق

مولانا عبداللہ عباس ندوی

اسلام اور علم

رابطۂ عالم اسلامی کے موسم ثقافی ۱۴۰۰ھ کے موقع پر یہ مقالہ عربی میں پیش کیا گیا۔
مقالہ کے بعد اس پر جو تبصرے ہوئے ان میں سے تعریف و تحسین کے الفاظ حذف کرکے اصل اعتراض کو بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ (ع ع ن)

آسمانی صحائف میں صرف قرآن مجید ہے جس نے علم و معرفت کو صرف 'الہیات' یا مافوق الطبیعات تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ علم کے تنوع، وسعت اور اس کے ناپیدا کنار ہونے کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:

"وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ"[1]

اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے۔

(یہ مختصر سی آیت اپنی بلاغت کے لحاظ سے بجائے خود ایک معجزہ ہے، اثباتی انداز میں اس بات کو کسی اور زبان میں ادا کرنے کی کوشش کیجیے[2] تو کامیابی نہیں ہوگی۔)

---

[1] سورۂ یوسف ۷۶،

[2] مثلاً اردو میں آپ کہہ سکتے ہیں، 'علم کی گہرائی اور وسعت و تنوع کی کوئی انتہا نہیں ہے، علم کی کوئی تھاہ نہیں ہے، علم کا میدان بے پایاں ہے، علم ایک دریائے ناپیدا کنار ہے، اسی طرح فارسی میں، انگریزی میں اور جو زبانیں آپ جانتے ہوں ان میں سوچیے بغیر حرف نفی لگائے اس مفہوم کو نہیں بیان کر سکتے۔ اور اس پر بھی وہ پورا مفہوم جو قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے نہیں

قرآن نے جس سیاق میں یہ بات کہی ہے وہ مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق مضمون نہیں ہے بلکہ اسی دنیا سے متعلق اور تدبیر و حکمت، سیاست و مصلحت پر عمل کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے۔

سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں جو اولین وحی ہیں، بتا رہی ہیں کہ انسان کی تخلیق جس طرح قدرتِ خداوندی کو ظاہر کرتی ہے اسی طرح اس کو قلم کا استعمال سکھانا۔ اور نامعلوم کو معلوم کرنے کا سلیقہ دینا خدمتِ الٰہی کا اعلیٰ ترین مظہر ہے، جو خدا جمے ہوئے خون (علق) میں جان ڈالتا ہے اسی نے انسان کو علم دے کر تمام مخلوقات پر شرف دیا ہے،

"اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم الذی علّم بالقلم، علّم الانسان مالم یعلم۔"[1]

(اے محمدؐ!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو، اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

حیات بخشنا اور علم دینا، دونوں کا ایک ساتھ ذکر اور ایک ہی سلسلۂ بیان میں کہ اس مالک حقیقی کا نام لیجیے جس نے تخلیق اور تعلیم سے اپنے بندے (انسان) کو نوازا۔ علم کی اہمیت بتا رہا ہے، نیز تاریخی لحاظ سے ان آیات کا وحی اول ہونا ثابت ہے، جس میں کسی زمانہ میں کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ معاندین یہود و نصاریٰ نے بھی قرآن کریم کے ترجمے کیے اور سورتوں کی ترتیب باعتبار وحی قائم کی، وہ بھی مانتے ہیں کہ پہلی آیتیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئیں وہ یہی آیتیں تھیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ لفظ "اِقرأ" (پڑھیے) قبل نبوت اور بعد نبوت کے زمانوں کے درمیان حد بندی کی لائن ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے قبل نبوت کے زمانہ کو جاہلیت (IGNORANCE) کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

دنیا میں جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہیں: ان میں مال و متاع، جاہ و منصب، عزت و وجاہت سب کچھ ہے۔ مگر کسی نعمت کے بارے میں یہ نہیں کہا ہے کہ اس میں اضافہ کی تمنا کرو۔ یہ دعا نہیں سکھائی کہ انسان کہے "رب زدنی مالاً" (اے اللہ! میرے مال میں اضافہ کرتا رہ) یہ دعا ضرور تلقین کی

کہ "رب ارزقنی" (اے اللہ! مجھے رزق دے) مگر اس میں قناعت اور توسط کی راہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ صرف علم ہی ہے جس کے لیے یہ دعا سکھائی ہے:

"رب زدنی علماً"[۱] (میرا پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔)

جو لوگ صاحب علم ہیں ان کے مقام کی اہمیت قرآن کریم نے اس انداز میں بتائی ہے کہ ناخواندہ یا بے علم لوگوں کے مقابلہ میں ان کو بلند دکھایا ہے:

"قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون ○"[۲]

"کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟"

یہ اندازِ بیان ایسا ہے جیسے آپ کہیں کہ کیا شیر اور مکھی برابر ہو سکتے ہیں؟ لغت میں اس سوالیہ لفظ "ھل" (کیا؟) کو 'سوالِ انکار' کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے، مذکورہ قرآنی آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اہلِ علم اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے۔

اصحاب علم و معرفت کا درجہ اللہ نے اپنے بندوں نے درمیان ممتاز رکھا ہے۔

"یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت"[۳]

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔"

بے علم ایسے ہی ناقابلِ التفات اور مضر لوگ ہیں کہ ان سے اعراض کرنے اور ان کی صحبت سے بچنے کا حکم قرآن نے دیا ہے، اور اس کا یہ پہلو واضح ہوتا ہے کہ علم کی کیا اہمیت ہے:

"واعرض عن الجاھلین"[۴]

"اور جاہلوں سے کنارہ کر لو"

قرآن کریم نے اور مقامات پر جہاں جہاں وضاحت کے ساتھ یا اشارہ سے اس امر کی تاکید کی ہے ان سب کو اس مقالہ میں یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی صرف چند آیات جو مفہوم کو نمایاں طور پر پیش

گر رہی ہیں انہی پر اکتفا کرتے ہوئے اب ہم احادیثِ نبویہ کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان قرآنی اشارات و احکامات کو اللہ کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سمجھا، اور آپ کے عمل سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

مشہور حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة"

"علم کا طلب کرنا فریضہ ہے ہر مسلمان مرد اور عورت پر"

مجھے معلوم ہے کہ بعض معاصر محدثین اس حدیث کو ضعیف بتاتے ہیں، اور اطلبوا العلم ولو بالصین (علم طلب کرو خواہ چین جا کر علم حاصل کرنا ہو) کو موضوع شمار کرتے ہیں۔ لیکن دوسری احادیث سے اس مفہوم کی توثیق اس طرح ہوتی ہے کہ اگر یہ روایت باللفظ ضعیف بھی ہے تو بالمعنی بالکل صحیح ہے۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث: (۱) صدقة جارية۔ أو (۲) علم ينتفع به۔ أو (۳) ولد صالح يدعو له۔

جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے سارے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے سوائے اس کے کہ اس کی تین باتیں باقی رہ جاتی ہیں: (۱) صدقہ جاریہ (ایسا رفاہ عام کا کام جس سے خلق خدا برابر فائدہ اٹھاتی رہے)۔ یا (۲) ایسا علم جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ یا (۳) ایسی اولاد یا کوئی لڑکا چھوڑ گیا ہو جو اس کے لیے دعائے مغفرت کرے۔

اس حدیث میں علم کے ساتھ "ینتفع بہ" کا لفظ بتا رہا ہے کہ محض تفریحی، لفاظی، سحر و جادوگری کا علم ایسا نہیں ہے جس سے کسی کو فائدہ پہنچ سکے۔ دعائے ماثورہ میں اس لیے "تلقین فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے علم نافع طلب کیا جائے اور علم غیر نافع سے پناہ طلب کی جائے۔

"اللّٰھم انی اعوذ بك من علم لاینفع"

اے اللہ! ہم تجھ سے ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں جو فائدہ نہ پہنچانے والا ہو۔

علم اللہ کی قدرتِ عطا و بخشش کا مظہر ہے اور تخلیق آدم کے بعد سب سے اہم نعمت علم ہی ہے

روح کو ختم کر دیتا ہے اسی طرح علم کے حاصل کرنے کا مقصد بھی صرف رضائے الٰہی ہونا چاہیے۔

من طلب العلم لیُباھِیَ بہ العلماء ویُمارِیَ بہ السفہاء ویصرف وجوہ الناس الیہ ویقول: أنا رئیسکم فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

جس نے علم اس لیے حاصل کیا کہ اس سے علماء کے درمیان اپنی بڑائی جتلائے یا ناواقفوں کے درمیان اپنا سکہ جمائے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے کہ "میں تم میں بڑا ہوں" تو ایسے شخص کو چاہیے کہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ تلاش کر رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو ترغیب دی کہ 'لکھنا' سیکھیں، غزوۂ بدر میں بعض قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ مدینہ منورہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔

علم کے لیے مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی، پہلی حدیث جو نقل کی گئی اس میں وضاحت ہے کہ علم کا حصول ہر مرد و عورت کا فریضہ ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اہم مسائل احکام شریعت کو معلوم کرنے میں صحابۂ کرامؓ رجوع کرتے تھے[1] احکام شریعت سے صرف واقفیت ہی نہیں بلکہ اہم مسائل میں قرآن کریم سے استدلال بھی بعض خواتین سے ثابت ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک بار منبر پر خطبہ دے رہے تھے، اس زمانہ میں بعض لوگ اپنی بیٹیوں کے مہر زیادہ مانگتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز کے طور پر فرمایا کہ مہر کے تعین میں امہات المومنین کا اسوہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ایک خاتون نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ پابندی از روئے قرآن درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وآتیتم احداھن قنطارًا فلا تاخذوا منہ شیئًا۔[2]

اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں کچھ مت لینا۔

---

[1] خذوا نصف دینکم من ھذہ الحمیراء، یعنی دینی معلومات کا نصف حصہ اس گوری رنگت والی سے حاصل کرو۔ موضوع ہے۔ (الدر المنیف فی الموضوع والضعیف تحقیق عبد الفتاح ابو غدہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اَصَابَتْ امرَأَۃٌ وَ اَخطَأَ عُمَرُ"[1]

عورت نے ٹھیک بات کہی، عمر سے خطا ہوئی۔

استاد احمد امین 'فجر الاسلام' میں لکھتے ہیں:

اسلام نے مندرجہ ذیل تین اسباب کی بنا پر علمی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا:

اسلام کی تبلیغ کے لیے پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت تھی، اس لیے قدرتی بات تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر لاحق ہوئی کہ لوگ حصول علم کی طرف متوجہ ہوں،

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں جو سابقہ امتوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کو سمجھنا اور مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ لوگ پڑھنا سیکھیں تاکہ اسرائیلی روایات کا مطالعہ کرسکیں۔

اور سب سے اہم سبب یہ تھا کہ قرآن کی تعلیم نے ان کے اندر غور و فکر کا مادہ پیدا کیا، ان کو دعوت دی کہ وہ آسمان، زمین، چاند، ستاروں، صبح و شام کی تبدیلی، لیل و نہار کی گردش، ہواؤں کے چلنے، پودوں کے اُگنے، پرندوں کے اڑنے پر غور کریں اور سوچیں کہ یہ سب کچھ خود بخود بلا ارادہ و مشیت عمل میں نہیں آرہا ہے، قرآن کریم نے ان کی فکر و نظر کو مدعو کیا کہ وہ ان امور پر غور کریں۔

"أَوَ لَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِن شَيْءٍ"[2]

کیا انھوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں کی؟

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کی توجہ صرف دینی علوم کی طرف تھی، دینی علوم سے مقصود وہ آیات و احادیث ہیں جن کی شرح و تفسیر ایک دوسرے سے نقل کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل، تاریخ غزوات (مغازی) کو قلم بند کرنے کا ذوق عام تھا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی حدود سلطنت میں توسیع ہوئی تو طب، یونانی فلسفہ و منطق، ریاضیات، علم الفلک سے مسلمانوں کو

دلچسپی ہوئی۔

طبقات الامم کے مؤلف قاضی صاعد بن احمد الطلیطلی لکھتے ہیں:

ابتدا میں مسلمانوں کی کاوشِ علمی کا محور قرآن و حدیث تھا یا سیرت نبوی۔ ہاں ایک علم طب بھی ضرور تھا، جو خال خال عرب جانتے تھے، چونکہ اس علم کی ضرورت انسان کو ہمیشہ اور ہر جگہ رہتی ہے اور چونکہ اسلام نے اس کا انکار نہیں کیا بلکہ ترغیب دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اثر مروی ہے آپؐ نے فرمایا:

یا عباد اللّٰہ تداووا فان اللّٰہ عزّ وجلّ لم یضع داءً إلّا وضع لہ دواءً، إلّا واحدًا وھو الھرم۔

اللہ کے بندو! دوا علاج کرتے رہو۔ کوئی مرض اللہ نے ایسا نہیں پیدا کیا ہے جس کا علاج بھی پیدا نہ کیا ہو۔ ہاں بڑھاپے کے سوا (یعنی اس کا کوئی علاج نہیں ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کا اس درجہ اہتمام تھا کہ مدینہ منورہ کے باہر بھی آپ جزیرۂ عرب کے مختلف علاقوں میں ایسے معلّمین کو بھیجتے جو لوگوں کو قرآن پڑھنے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

اسلامی فتوحات کے بعد صحابہ و تابعین صرف تعلیم کی غرض سے مختلف شہروں میں جا کر قیام کرتے اور لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے، قرآن کریم کی تلاوت کا طریقہ اور احکام شریعت بتایا کرتے تھے۔

مسجدیں، علمی درسگاہیں تھیں:

مسجد، عبادتِ نماز کے علاوہ بھی دوسرے انواع عبادت کے کام آتی تھیں، مسلمانوں کی مجلسِ شوریٰ مساجد ہی میں منعقد ہوا کرتی تھیں، ان کی سیاسی و اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے دعوتِ اسلام کو بڑھانے اور پھیلانے کا کام مسجدوں میں ہوا کرتا تھا، علم قرأت کے واقف علماء تجوید کی تعلیم دیتے، علمائے تفسیر و حدیث کے حلقۂ درس علاحدہ ہوتے، قاضی حضرات مسجد ہی میں فریقوں کے بیانات اور گواہیاں اور حلف لیتے اور فیصلہ دیتے۔

اساتذہ و معلّمین کی خدمات کی ابتدا قاری حضرات سے ہوئی جو لوگوں کو قرآن کریم کا تلفظ

کا سلسلہ شروع کیا تھا[1] اور عوام کو ہدایت ہوتی تھی کہ جمعہ کے روز مسجد میں جمع ہوا کریں اور دینی معلومات حاصل کریں۔

مسلمانوں نے مسجدوں کو پہلے دینی درسگاہ بنایا، کیونکہ تعلیم ہمیشہ اجتماعی طور پر دی جاتی تھی اور اجتماع کی جگہ مسجد ہی تھی۔ اساتذہ کو تنخواہ دینے کا سلسلہ پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوا ہے[2]۔ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں مصر کی جامع عمر بن العاص کے متعلق ابن سعید نے لکھا ہے:

مصر کے مرکزی شہر (قاہرہ) میں علمائے کرام کا حلقۂ درس تھا۔ ہر عالم طلبہ کے وسط میں مسند تدریس پر بیٹھتا۔ ان حلقوں میں کہیں تجوید قرآن کی مشق ہوتی کہیں فقہ اور نحو کے درس ہوتے تھے۔ میں نے معلوم کیا کہ ان طلبہ کا ذریعۂ رزق کیا ہے؟ — تو مجھے بتایا گیا کہ زکاۃ اور دوسرے اقسام کے عطیے اور ہدایا پر ان کی گزر ہوا کرتی ہے[3]۔

ابن عبدون الاشبیلی کہتے تھے کہ مساجد عبادت کی جگہیں ہیں، یہاں ان کو مکتب کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بچے طہارت کے آداب سے واقف نہیں ہوتے اور ان کے کپڑوں میں نجاست بھی ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ ضروری ہی ہے کہ مسجد ہی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو ان کی چھتوں پر اس کا نظم کیا جائے[4]۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں عام طور پر مسجدیں مدرسہ اور مکتب کے لیے استعمال ہوا کرتی تھیں اور ابتدائی کتابوں سے لے کر حدیث و تفسیر کے علوم بھی یہیں پڑھائے جاتے تھے۔

مشہور سیاح المقدسی (چوتھی صدی ہجری) علمائے فقہ کے حلقہ ہائے درس کی تعریف کرتا ہے، اس نے مشرقی ممالک میں قاریوں، اور ادیبوں کو تعلیم دیتے ہوئے دیکھا۔

علوم دینیہ کے علاوہ مسجدوں میں زبان و ادب کی بھی تعلیم ہوا کرتی تھی، اور ان حلقہ ہائے درس میں عام مسلمانوں کو بیٹھنے اور استفادہ کرنے کی اجازت تھی[5]۔

---

[1] ہٹی۔ تاریخ عرب (انگریزی) مطبوعہ لندن ۱۹۴۳ء ص ۳۵۴

[2] حسین مونس، المساجد (سلسلۃ عالم المعرفۃ)، کویت ۱۹۸۴ ص ۳۵

[3] احمد المقری التلمسانی نفح الطیب، ج ۱ بیروت ۱۹۸۸، ص ۳۱۴

مرکزی شہروں کی بڑی بڑی مسجدیں جو کسی زمانہ میں ابتدائی کتابوں کی تعلیم اور تجوید قرآن کریم کے لیے مکتب کا کام دیا کرتی تھیں، آگے چل کر یونیورسٹیاں بن گئیں، اندلس کی مسجد قرطبہ، مغرب کی جامع قرویین، قاہرہ کی جامع ازہر، دمشق کی مسجد اموی، ٹیونس کی مسجد زیتونہ۔ یہ سب مسجدیں مکتب سے مدرسہ، اور مدرسے سے جامعہ (یونیورسٹی) میں تبدیل ہو گئیں۔ انہی قرآنی مکتبوں کے ذریعہ عالم اسلام میں ہر جگہ علم کی روشنی پھیلی مغربی سوڈان کے شہر تمبکٹو میں سولہویں صدی عیسوی (دسویں صدی ہجری) میں تین بڑی مسجدیں تھیں جن میں مشہور مسجد "سنکری" جو بعد میں یونیورسٹی بن گئی اور جو اب بھی مغربی سوڈان کی بڑی درسگاہ ہے اور تمام علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ ہے[1]

مدارس اور جامعات (یونیورسٹیز) کا قیام:

ابتدائی تعلیم کے مکتب جن کو عربی میں "کُتّاب" کہتے ہیں ہر مسجد کے ساتھ ملحق ہوا کرتے تھے۔ اگر مسجد سے ملحق سائبان اور حجرے نہ ہوتے تو یہ کام مسجد کی دالانوں سے لیا جاتا تھا۔ ان مکاتب کی ابتدا تو دراصل صرف قرآن مجید پڑھنے، حفظ کرنے اور تجوید و قرأت کے لیے ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ہی نماز، روزہ، طہارت کے مسائل بتائے جاتے تھے، سیرت نبویہ اور سیر الانبیاء کے اسباق بھی ہوتے تھے، بعد میں زبان و لغت، حساب، علم العروض کی طرف توجہ دی جاتی۔ چونکہ اصل مقصد ان مسجدی مکاتب کا یہ تھا کہ یہاں سے لوگ شریعت کے احکام پڑھ کر نکلیں اس لیے ان مکتبوں سے پڑھ کر نکلنے والوں کو فقیہ کہا جاتا تھا، جیسا کہ اب بھی نائجیریا، یوگنڈا وغیرہ میں رواج ہے۔

اس زمانہ میں جس کو یوروپ میں تاریک صدیاں کہا جاتا ہے اور یورپین سوسائٹیاں جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھیں، اس وقت اسلام کے زیر نگیں ممالک میں درسگاہیں قائم تھیں، اور علم کا حصول عبادت الٰہی سمجھا جاتا تھا۔

مشہور مغربی سیّاح ابن بطوطہ ہندوستان کے ایک ساحلی شہر "ملیبار" کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں خواتین کے اندر قرآن حفظ کرنے کا رواج تھا۔

ورأيت بالمدينة ثلاثة عشر مكتبًا لتعليم البنات وثلاثة
وعشرين مكتبًا لتعليم الاولاد ولم أر ذالك في سواها۔[1]

میں نے اس شہر (ملیبار) میں تین مدرسے لڑکیوں کے اور ۲۳ مدرسے لڑکوں کی تعلیم
کے دیکھے۔ یہ بات اس شہر کے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔

تنبکتو جو نہر سوڈان کے مغربی موڑ پر ایک شہر ہے[2] اس میں سولھویں صدی عیسوی (دسویں صدی ہجری) میں مدرسوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے ایک سو اسّی کے درمیان تھی[3]

اہلِ اندلس کے اندر حصول علم کا شوق بہت زیادہ تھا، یہ لوگ علوم دینیہ کے علاوہ صنعت وحرفت کی تعلیم کی طرف بھی متوجہ تھے۔ ایک اندلسی عالم ابن سعید کا بیان ہے کہ:

> اہلِ اندلس کا طلبِ علم میں جواب نہیں، وہ صرف معارف اسلامیہ ہی نہیں بلکہ صنعت وحرفت میں بھی دستگاہ رکھتے تھے اور اس کے حصول کے لیے جانفشانی کرتے تھے۔ اگر علم کتابی میں کوئی کمال حاصل نہ کر سکا تو چاہتا تھا کہ صنعت کے میدان میں نمایاں ہو۔ بیکار اور دوسروں پر بار بن کر رہنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ علما کی ان کے یہاں بڑی قدر و منزلت تھی، لوگ دور دراز سے سفر کر کے ان کے پاس آتے اور ان کی صحبت میں چند دن گزارنا عبادت سمجھتے، لیکن باوجود ان اوصاف کے یہ عجیب بات ہے کہ وہاں مدارس کے لیے علیحدہ عمارتیں بنانے کا رواج نہ تھا، مسجدوں ہی کو وہ مدرسہ سمجھتے تھے۔ فقیہہ (عالم دین کا مرتبہ سب سے اونچا تھا، یہاں تک کہ حکام وقت کو بڑے آداب والقاب سے یاد کرنا چاہتے تو اس کے نام کے آگے 'فقیہہ' بڑھا دیتے۔ یہ صورت حال ساتویں صدی ہجری کی ہے۔ ادبا، ماہرین لغت، علم نحو کے فضلا، سب پر فقیہ کو فوقیت حاصل تھی۔"

قرطبہ میں علم وفن کا عروج تھا، کسی شاعر نے قرطبہ کی تعریف ان دو شعروں میں کی ہے:

بأربع فاقت الامصار قرطبةٌ	منهن: قنطرة الوادي وجامعها
هاتان اثنتان، والزهراء ثالثةٌ	والعلمُ أعظم شئ وهو رابعها

---

[1] ابن بطوطہ۔ رحلة ابن بطوطة بیروت ۱۹۶۸ء ص ۵۴۵

"قرطبہ کا شہر چار باتوں میں دوسرے شہروں پر فائق ہے، ان میں سے ایک وادیٔ قرطبہ کا پُل ہے، اور اس کی مسجد، یہ دو ہوئے۔ قصر زہرا تیسرا ہے۔ اور ان سب میں افضل و اعلیٰ بات جو چوتھی ہے وہ یہ کہ وہاں علم ہے۔"

تاریخ اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے پہلا مرکز بیت الحکمۃ جو عباسی خلیفہ مامون الرشید نے سنہ ۲۲۵ھ (سنہ ۸۳۰ء) میں قائم کیا تھا۔ اس مرکز میں حکمائے یونان کے علوم کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، اس مرکز سے ملحق علم فلک کی تعلیم کے لیے ایک رصدگاہ بھی تھی۔ قاضی صاعد بن احمد لکھتے ہیں: جب خلافت کی مسند پر مامون الرشید متمکن ہوا، اس نے روم کے والیانِ ریاست سے روابط قائم کیے اور ان کے پاس فلاسفۂ روم کے جو علوم تھے ان کی چھان بین کی، ان والیانِ حکومت نے مامون الرشید کو افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس کی قلمی یادداشتیں بھیجیں۔ مامون نے اچھے اور کامیاب مترجمین کو جمع کرکے ان سے ان کی کتابوں کا ترجمہ کرایا، اور لوگوں کو ان کے پڑھنے کی ترغیب دی۔ ان علوم منطق و فلسفہ کو پڑھ کر علمائے اسلام، نصرانی دانشوروں سے مناظرہ کرتے اور مامون کے دربار میں ان کے مقابلے ہوتے جن سے وہ محظوظ ہوتا۔ ان علماء کو انعام و اکرام سے نوازتا، تاکہ ان کا ذوق بڑھے۔

عباسی دور کے عروج کا یہ زمانہ تھا؎ اس وقت بغداد کا علمی مرکز روم کے علمی مرکزوں کا ہم پلّہ ہوگیا تھا۔ اور جہاں تک تیسری صدی ہجری کا تعلق ہے اس عرصہ میں کوئی ملک بھی بغداد کا ہم پلّہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسلامی تاریخ، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، نحو، بلاغت، نقد، جغرافیہ، علوم فلکیات، کیمیا، طب، منطق میں جو کتابیں مرتب ہوگئی تھیں عالم اسلام آج تک انہی کو علوم کا مصدر اور اصل الاصول مانتا ہے، مثلاً چاروں فقہی مسلک کے اصول، حنفی، حنبلی، شافعی، مالکی اسی دور میں مدون ہوئے، صحاح ستّہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اسی عصر میں تمام و کمال کو پہنچی۔

(جاری)

؎ اسلامی علوم میں یونانی منطق و فلسفہ کا رواج اسی وقت سے ہوا، اور اس وقت اور بعد کی صدیوں میں جو کتابیں

مولانا نذر الحفیظ ندوی

امیر سیّد عبدالقادر حسنی الجزائری

(دوسری اور آخری قسط)

فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر نے پہلے دفعہ میں فرانس کے قبضہ کو الجزائر کے دو مرکزی شہروں اور بعض ساحلی علاقوں پر تسلیم کرلیا، دوسرے اور تیسرے دفعات میں دونوں فریقوں کے زیر تسلّط علاقوں کی حد بندی کی گئی، اس تحدید سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرانس نے الجزائر کے ایک تہائی حصہ سے زائد علاقوں پر امیر کے قبضے کو تسلیم کرلیا اور پانچ ساحلی علاقوں نیز صحرائے کبریٰ کے بعض حصہ کو اپنے پاس رکھ کر فرانس نے اہم فوجی ٹھکانوں اور قلعوں سے دستبرداری امیر کے حق میں دے دی۔

دفعہ ۴ میں یہ طے پایا کہ فرانس کے علاقہ میں رہنے والے مسلمانوں پر امیر کا کوئی حکم نہیں چلے گا، فرانسیسی باشندے امیر کے زیر تصرّف علاقوں میں سکونت اور نقل وحرکت کے لیے آزاد ہوں گے، اس طرح فرانس کے زیر قبضہ علاقوں میں مسلمانوں کو مذہبی شعائر پر عمل کرنے اور سکونت کی بھی اجازت ہوگی۔ چھٹے دفعہ میں امیر ہر سال فرانسیسی فوجوں کو تیس ہزار کیلو گندم، جوار اور پانچ ہزار گائے مہیا کریں گے۔ اس بات کی صراحت نہیں کی گئی کہ یہ غذائی رسد سالانہ جزیہ کے طور پر ہوگی یا تعاون اور امداد کے طور پر، ساتویں اور دسویں دفعہ کے مطابق امیر کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ فرانس سے اسلحہ خرید سکتے ہیں اور تجارت بھی کرسکتے ہیں۔ بارہویں دفعہ میں دونوں طرف سے مجرموں کے تبادلہ کی بات تسلیم کی گئی، دفعہ ۱۳، اور ۱۴ میں امیر نے اس بات کا عہد کیا کہ الجزائری ساحلوں کو فرانس کی اجازت اور مشورے کے بغیر کسی تیسرے ملک کو استعمال کرنے نہ دیں گے اور الجزائر کی ضروریات کا سامان فرانسیسی مارکیٹ سے خریدیں گے۔

ان مندرجہ بالا دفعات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امیر کے حق میں یہ معاہدہ کسی طرح بھی نہیں

معاہدے اور امیر کے پاس موجود دستاویزات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بعد میں فرانس کے بعض مورخین نے اس کو تسلیم کیا کہ فرانس نے معاہدہ میں اپنی مرضی سے ترمیم اور تبدیلی کی تھی۔ لیکن اس وقت کے حالات اور فرانس کے زبردست پروپیگنڈے نے امیر کو اس معاہدہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا' قبائلی حسد اور غدّاری نے بھی امیر کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ فرانس کی طرف سے مطمئن ہو کر داخلی استحکام کی طرف اپنی ساری توجہ صرف کر دیں اور جو قبائل بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہیں ان کی تادیب کر کے حالات کو مزید درست کریں۔

فرانسیسی اس معاہدے سے فارغ ہو کر امیر کی طرف سے مطمئن ہو گئے' اور انھوں نے قسنطینہ پر بھرپور فوجی یورش کر دی۔ عثمانی حکومت نے اپنا بحری بیڑہ مدد کے لیے روانہ کیا لیکن فرانسیسی بحریہ نے پہلے ہی سے ناکہ بندی کر دی تھی۔ دوسری طرف عثمانی حکومت اپنی کمزوری کی وجہ سے سفارتی ذرائع سے اس معاملہ کو حل کرنا چاہتی تھی۔ ادھر سے مایوس ہو کر قسنطینہ میں موجود ترک افواج اور وہاں کے باشندوں نے بڑی بے جگری سے فرانسیسی فوج کا مقابلہ کیا، مضبوط قلعہ اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے فرانسیسی فوجوں کو حملے میں دشواری پیش آ رہی تھی، آخر کار فرنچ فوجوں نے بارودی سرنگوں کا استعمال کر کے مضبوط و مستحکم قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اس کے بعد بھی پورے شہر پر قبضہ کرنے کے لیے ایک ایک گھر پر ان کو جنگ کرنی پڑی' اس کے نتیجہ میں دو ہزار فرانسیسی فوج کام آئی اور خود فرنچ جنرل بھی مارا گیا۔

قسنطینہ پر قبضہ مستحکم کر کے فرانسیسیوں نے امیر عبدالقادر کی طرف توجہ کی جو داخلی استحکام میں مصروف تھے، تیجانی سلسلۂ طریقت کے لوگوں نے بھی امیر کی مخالفت کر دی تھی جس سے نمٹنے میں امیر کو خاصے جانی اور مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔

نئے فرنچ جنرل فالیہ نے اپنی حکومت کو ایک تفصیلی رپورٹ میں اطلاع دی کہ امیر کی طاقت صلح کے بعد بہت بڑھ گئی ہے۔ تمام قبائل ان کے زیر اثر آتے جا رہے ہیں، اگر الجزائریوں کا دینی شعور اسی طرح وہ بیدار کرتے رہے تو فرانس کے مفاد کے لیے زبردست خطرہ پیش آئے گا۔ امیر

کے بعد حکومت فرانس نے خود فالیہ کے سپرد یہ کام کر دیا کہ وہ مناسب تدبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ فالیہ نے فرانس سے ایک لاکھ آٹھ ہزار فوج طلب کی اور پانچ سو ملین فرانک کے اخراجات طلب کیے جو مہیا کر دیے گئے۔ ان انتظامات سے فارغ ہو کر جنرل فالیہ نے امیر کے ساتھ مختلف حیلوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، خطوط کے ذریعہ امیر پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے فرانس کے زیر اقتدار علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے جو معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ فرنچ جنرل نے اپنے خطوط میں بعض ایسے قلعوں اور فوجی چھاؤنیوں کا مطالبہ کیا جو امیر کے زیر تسلط تھے۔ جنرل نے اپنے ایک خط میں اہانت آمیز جملے بھی استعمال کیے، ان مسلسل ناحق مطالبوں اور بے جا الزامات کے جواب میں امیر نے قیمتی تحفے تحائف کے ساتھ ایک وفد پیرس روانہ کیا اور بادشاہ لوئی فلپ کو خط بھی روانہ کیا، لیکن حکومت فرانس نے سرکاری سطح پر وفد کی پذیرائی تو کی البتہ خط کے جواب سے گریز کیا اور کہا کہ جنرل فالیہ ہی سے اس سلسلہ میں رجوع کیا جائے، حکومت نے سارے اختیارات انھیں دے رکھے ہیں۔ امیر نے مشورے کی خاطر مجلس شوریٰ طلب کی۔ امیر فرانس کے بعض مطالبات مان لینے کے حق میں تھے، وہ ہر قیمت پر جنگ سے گریز کرنا چاہتے تھے، اس لیے کہ انھیں دونوں طرف کی فوجی قوت کا خوب اندازہ تھا۔ امیر نے فروری ۱۸۳۹ء میں فرانس کے حکمراں لوئی فلپ کو جو خط بھیجا تھا اس کے بعض جملوں سے جنگ و جدل سے گریز، کسی بڑی طاقت کے ساتھ امکانی حد تک تصادم سے بچنے کی خواہش اور کوشش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔۔ امیر نے لکھا:

"۔۔۔۔ اسلام کی آمد کے بعد سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان لڑائیاں برابر ہوتی رہی ہیں۔ مسلمانوں کے جہاد کا مقصد دین کی حفاظت اور عقیدے کا دفاع ہے، جب کہ عیسائیوں کا مقصد محض دنیا طلبی ہے ۔۔۔ میں صلح کی دلی خواہش رکھتا ہوں، لیکن جن قبائل نے عیسائی تسلط سے بچنے کی خاطر ہم سے مدد طلب کی ہے ہم ان کی درخواست کیسے ٹھکرا سکتے ہیں ۔۔۔۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے مقابلہ میں ہماری فوجی قوت صفر کے برابر ہے، لیکن اگر جنگ کی نوبت آ گئی تو ہم براہ راست مقابلہ کے بجائے چھاپہ مار جنگ کو پسند کریں گے، اگر آپ ہمارے ساتھ صلح چاہتے ہیں تو ہم بھی اس کے لیے تیار ہیں کہ صلح و آشتی کی صورت میں تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں، لیکن آپ نے اگر ہمیں جنگ کے لیے مجبور کر دیا تو یہ سمجھ لیجیے کہ الجزائر میں فرانسیسی استعمار کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔"

پر قبضہ کر لیں لیکن جلد یا بدیر آپ کو بہر حال یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔

مجلس شوریٰ نے صلح و صفائی کی تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد جنگ کی منظوری دے دی کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

۲۲ اکتوبر ۱۸۳۹ء کو امیر کو یہ اطلاع ملی کہ فرانسیسی جنرل نے قسنطینہ کے چاروں طرف فرانسیسی کسانوں کو آباد کر دیا ہے اور جن علاقوں پر امیر کی حکمرانی ہے ان سے ہو کر فوجی دستوں کے ساتھ فرنچ جنرل نے گزرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی امیر نے فرنچ نو آبادیات کے گورنر کو الٹی میٹم دے دیا، لیکن اس نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ امیر نے ایک فوجی یورش کے ذریعہ نو آبادکار فرانسیسیوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اس حملے سے گھبرا کر ساحلی علاقوں میں آباد فرانسیسی نو آبادکار بغیر مطالبہ کے بھاگ کھڑے ہوئے، بعض علاقوں سے خود فرانسیسی حکومت نے اپنے باشندوں کو واپس بلا لیا۔ اس فوجی یورش کا جواب فرانسیسیوں نے اس وقت دیا جب باقاعدہ ایک لاکھ آٹھ ہزار فوج کی نئی کمک الجزائر آگئی، چنانچہ ۱۸۴۰ء میں ملیانہ اور مدیہ جیسے شہروں پر فرانسیسی فوج نے قبضہ کر لیا۔

فرنچ جنرل بیگو نے امیر کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے تیز چھاپہ مار جنگ کی حکمت عملی اختیار کی، اس نے تمام فرانسیسی فوجوں کو تنگ فوجی وردی کے بجائے الجزائر کی آب و ہوا کے مطابق ڈھیلے ڈھالے لباس پہننے کا حکم دیا، تیسرے اس جنرل نے درندگی، سفاکیت اور بربریت کے سارے رکارڈ توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان تینوں فیصلوں کے حیرت انگیز نتائج نکلے۔ ایک فرنچ فوجی افسر کی شہادت کے مطابق فرانسیسی حکمت عملی کی وجہ سے سات سال کے عرصہ میں الجزائریوں کی تعداد چار ملین سے گھٹ کر تین ملین رہ گئی، لیکن ایک الجزائری مورخ نے (جو اس زمانہ میں الجزائر کی اس جنگ کے عینی شاہد تھے اور بعد میں فرانسیسی وزارت دفاع کے شائع شدہ دستاویزوں کا مطالبہ بھی کیا تھا) یہ لکھا ہے کہ دس ملین سے گھٹ کر یہ تعداد تین ملین رہ گئی، یعنی سات ملین انسان اس سات سالہ جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ فرانسیسی فوج کس طرح وحشت و بربریت سے کام لیتی تھی اس کے لیے صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔

جنرل بیگو کے ایک معاون سینٹ ارنو نے ۴ مئی ۱۸۴۳ء کو اپنی ڈائری میں لکھا:

"ہماری تدبیروں سے بندوق اور توپ کے گولے بچ رہے ہیں، ہم عام طور سے بستیوں

بغیر مطالبہ کے گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، اس کے بعد ہم لوگ جی بھر کر گھروں کو لوٹتے اور بعد میں آگ لگا دیتے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

"۔۔۔۔ آہ آج کتنا شاندار تاریخی دن تھا، ہمارے حملوں سے گھبرا کر بوڑھے، بچے، جوان، مرد و عورت ایک ہزار کی تعداد میں قریب کے ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، ہم نے غار کے منہ کو لکڑیوں سے بند کر کے ان لکڑیوں میں آگ لگا دی۔ اس طرح بغیر گولی چلائے ہم نے ایک ہزار انسانوں کو گھٹ گھٹ کر مرنے پر مجبور کر دیا۔ ہمارے پاس صرف پانچ مقتول اور چالیس زخمی ہیں، ان زخمیوں کو بھی جلانا ہی بہتر ہے تاکہ ہماری گولیاں باقی بچ جائیں۔"

جب فرانسیسی پارلیمنٹ میں اس درندگی اور بربریت کے خلاف بعض ممبروں نے تنقید کی تو وزیر اعظم مارشل سولٹ نے جواب دیا کہ "اگر یہ طریقہ یورپ میں اختیار کیا جاتا تو اس کو ہم درندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن افریقہ کے وحشیوں کے لیے تو یہی طریقہ مناسب ہے۔" اس بیان کے بعد فوج کو ہدایت کر دی گئی کہ جب حملہ کیا جائے تو کسی کو زندہ نہ چھوڑا جائے کہ وہ بعد میں اخباری نامہ نگاروں کو کوئی بیان دے سکے۔

اس بربریت کے برعکس امیر عبدالقادر اسلامی شرائط کے مطابق جہاد کر رہے تھے، اسیران جنگ کے ساتھ ان کے حسن سلوک کا اعتراف فرانس جیسے دشمن نے بھی کیا۔

اس پندرہ سالہ جنگ میں امیر کو کامیابی کم، ناکامی زیادہ ملی، اس میں دشمن کا کردار تو تھا ہی اپنوں نے بھی غداری و خیانت اور حسد کی وجہ سے غیر معمولی نقصان پہنچایا۔ تمام فوجی چھاؤنیاں، قلعے اور شہر آہستہ آہستہ فرانسیسی قبضے میں آ گئے، آخری فوجی چھاؤنی "تقدمت" نام کی باقی رہ گئی تھی وہ بھی ۱۸۴۲ء میں نکل گئی۔ اب امیر نے گشتی چھاؤنی کا سہارا لیا، جس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ امیر کو فرانسیسی فوجوں پر غیر معمولی کامیابی ملی، اس لیے کہ امیر کی فوج اپنے ملک کے صحرائی اور پہاڑی راستوں سے خوب واقف تھی، اور مقامی باشندوں کا تعاون ان کو ملتا تھا۔ امیر نے اس گشتی چھاؤنی کو بھی شہر کا درجہ دے دیا تھا،

عدالتیں لگائی جاتیں، تنخواہ تقسیم کرنے کے لیے الگ انتظام کیا جاتا۔ شرعی احکامات کی تنفیذ تو چلتے پھرتے بھی ہوتی تھی۔ بچوں کے لیے مکتب کھولنے اور بڑوں کو فوجی تربیت دینے کا اہتمام کیا جاتا۔ لیکن خواتین اور بچوں کے لیے یہ چلتی پھرتی زندگی راس نہیں آئی اور ان کی بڑی تعداد موت کا شکار ہو گئی۔

ان سنگین اور غیر معمولی حالات میں امیر نے ہر طرح صلح کی کوشش کر ڈالی، پیرس کی حکومت کو متعدد خطوط ارسال کیے، لیکن فرانسیسی حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی، اسی درمیان میں مئی ۱۸۴۳ء میں یہ حادثہ پیش آیا کہ "زمالہ" کے علاقہ میں اچانک فرنچ فوجوں نے شب خون مار دیا جہاں امیر کی فوج موجود تھی۔ امیر تو اپنے صبا رفتار گھوڑے کی وجہ سے گرفتاری سے بچ نکلے، لیکن ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں کی بڑی تعداد گرفتار ہو گئی۔

جنرل بیگو نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امیر کے سامنے صلح کی تجویز پیش کی جو انھوں نے مسترد کر دی اور مراکش جانے کا فیصلہ کیا، وہاں پہنچ کر امیر نے مراکشی عوام کی ہمدردی حاصل کر لی، عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر سلطان مراکش عبدالرحمٰن نے فرانس کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا، لیکن اس میں مراکش کی فوجوں کو بری طرح ناکامی ہوئی۔ اس سے مجبور ہو کر سلطان نے فرانس کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور امیر کے بارے میں یہ طے پایا کہ ان کو مراکش کے حدود سے نکال دیا جائے گا۔ امیر نے مجبوراً الجزائر کا رخ کیا، یہاں ایک فوری حملے میں چھ سو فرانسیسی فوجی امیر کی قید میں آ گئے اور خاصی تعداد مقتول اور فرار ہوئی۔ اس کا اثر وقتی طور سے ہوا، لیکن پھر حالات امیر کے خلاف ہو گئے اور انھیں مجبوراً مراکش جانا پڑا، جہاں مراکشی فوج کے ساتھ ان کی افسوسناک مڈبھیڑ ہوئی، اس شکست سے انھیں غیر معمولی صدمہ ہوا۔ پہلے انھوں نے سوچا کہ خاموشی سے صحرائی راستہ اختیار کر کے حجاز کا رخ کیا جائے، لیکن جب یہ سوال سامنے آیا کہ زخمیوں، بچوں اور خواتین کا کیا ہوگا تو امیر نے یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیے کہ اگر فرانس کے ساتھ جنگ سے ہمیں امید کی کوئی کرن نظر آتی تو ہم آخری سانس تک لڑتے، لیکن مشیت خداوندی کے آگے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

فرانسیسی فوج کے ایک اعلیٰ افسر کو مطلع کر دیا گیا کہ امیر ہتھیار ڈالنے اور خود کو سپرد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے بعد ہی امیر اور ان کے قافلے کو شہر 'طولون' پہنچا دیا گیا تاکہ وہاں سے بحری جہاز کے ذریعہ اسکندریہ یا فلسطین بھیج دیا جائے۔ اس درمیان میں فرانس میں انقلاب ہو گیا جس نے شہنشاہیت کا

امیر کے ساتھ ۹۰ آدمیوں کا قافلہ تھا۔ ان سب سے نپولین سوم نے خود ملاقات کی اور انھیں آزادی دے دی کہ وہ ترکی، شام، مصر اور حجاز کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امیر نے تحریری طور پر فرانس کی حکومت سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ فرانس کے خلاف آئندہ کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ امیر کا یہ احساس تھا کہ ہمیں شکست اس لیے ہوئی کہ ہم اپنے دین سے منحرف ہو گئے تھے۔

۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک امیر فرانس کے قید میں رہے، اس کے بعد ان کو آزاد کیے جانے کا حکم دیا گیا، ۱۸۵۵ء تک امیر اور ان کے قافلے نے ترکی کے شہر بروصہ میں قیام کیا، پھر فرنچ حکومت کی اجازت سے دمشق چلے آئے، یہاں ۱۸۶۰ء میں ایسا حادثہ پیش آیا جس میں عیسائیوں کی ایک تعداد مقتول ہوئی، امیر اور دمشق کے سربرآوردہ علما و مشائخ نے عیسائیوں کی خاصی تعداد کو قتل ہونے سے بچایا، اور انھیں اپنے یہاں جگہ دی۔ امیر کے اس کارنامے کا پورے یورپ میں بڑا شہرہ ہوا، فرانس اور دیگر یورپی ملکوں نے امیر کے نام شکریہ کا خط اور متعدد تحفے بھیجے۔

دمشق میں امیر کا معمول یہ تھا کہ فجر سے بہت پہلے بیدار ہو کر اپنے معمولات (وظائف) وغیرہ پورے کرتے، فجر کی نماز بلکہ تمام نمازیں پابندی کے ساتھ قریبی مسجد میں باجماعت ادا کرتے۔ رمضان المبارک میں ان کی عبادت و ریاضت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا، دن کے باقی اوقات میں علما، صلحا کے ساتھ مجلس ہوتی، اور علمی و ادبی مناقشے ہوتے۔ مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی کرتے، خود زہد و تقشف کی زندگی گزارتے، دمشق میں ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔

امیر عبدالقادر کے نو صاحبزادے تھے، ان میں سے دو بڑے لڑکے مستقلاً ترکی میں بس گئے اور حکومت کے مشاورتی بورڈ کے رکن ہوئے۔ ایک لڑکے نے اپنے والد کی وفات کے بعد الجزائر کا رخ کیا اور آخر تک فرانس سے لڑتے رہے۔

امیر نے علمی و ادبی اور دینی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لیے جہاد کے معرکوں میں بھی ان کا یہ ذوق ان سے جدا نہیں ہوتا تھا، جہاں بھی فرصت ملتی علم و ادب کے تذکرے اور صوفیا و مشائخ کے مجاہدوں اور ان کی عبادتوں اور ایثار و قربانی کا ذکر ہوتا۔ فرنچ مؤرخین نے امیر کی شجاعت و دلیری، بے خوفی، جرأت، ہمت، اخلاص، زہد و تقشف اور مالی و جانی قربانیوں اور دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کا کھل کر اعتراف کیا

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی

مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقریت

(دوسری اور آخری قسط)

خلافتِ عثمانیہ اور مسلمانانِ برصغیر ہند و پاک کی روحانی وابستگی:

۱۸۵۷ء کے المیہ کا زخم مسلمانانِ ہند و پاک کے دلوں میں ہنوز ہرا تھا۔ وہ برطانیہ سے نفرت کر رہے تھے کیونکہ اس کے سلب و نہب، قتل و خون کے مناظر تازہ تھے بمشکل سے نصف صدی بیتی تھی۔ ابھی تو المیہ کے عینی شاہدین زندہ تھے جو اپنی نئی نسل کو داستانِ جگر پاش سنا رہے تھے۔ المیہ کی یہ کہانی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ عالمِ اسلام اور خلافتِ اسلامیہ یعنی ترکی کو ختم کرنے کی سیحی سازشیں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ ترکی مسلم قوت کی علامت تھا۔ برصغیر کا ہر مسلم برطانیہ کے خلاف ہوگیا۔ اخبارات، رسائل اور مجلات نے ترکوں کے ساتھ حمایت کا اعلان کر دیا۔

اس وقت چونکہ 'الہلال' پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے اور تفصیلات کے لیے زمیندار اور کامریڈ کی طرف رجوع کرنے کی درخواست کی جا رہی ہے لہٰذا ترکی حمایت کے چند نمونے صفحات 'الہلال' سے پیش کیے جاتے ہیں۔

الف: ترک کے سب سے بڑے نقیب کی حیثیت سے 'الہلال' نے ہر ہفتہ کئی کئی صفحات شئونِ عثمانیہ کے زیرِ عنوان حالاتِ حاضرہ کی اشاعت شروع کی۔ اس میں نامورانِ غزوہ بلقان، شہادت بطلِ حریہ، احرارِ اسلام، مکاتیب الحربیہ، مسئلہ شرقیہ، بلقان اقوام کی تحریک، دولتِ عثمانیہ کا مستقبل، برید فرنگ، وغیرہ وغیرہ عناوین مسلسل شائع ہوتے رہے۔

، رمئی (۱۹۱۳ء) کے شمارے میں شئونِ عثمانیہ حادثہ ادرنہ (ص۱۸) بالخصوص اداریہ الہلال 'حولِ ادرنہ' (ص۲۹۷-۹۹۹) ملاحظہ ہوں۔ جو آج بھی ایمان کو تازہ اور اتحادِ اسلامی کی آرزو کو جوان دون

اعانت مہاجرین عثمانیہ مجروحین طرابلس و بلقان (ص۲۰۴-۲۰۵) نیز ناموران غزوہ بلقان (ص۲۸۵-۲۸۶) کے تحت اسی وابستگی روحانی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ترکوں کی امداد کے لیے ایک الہلال فنڈ قائم کیا گیا۔ مسلمانوں نے دل کھول کر چندے دیے۔ ہر ہفتہ فہرست زر اعانت اور مخیرین کے اسماء گرامی شائع ہوتے رہے (ص۲۹۱-۲۹۲)۔ ۱۱ر جون ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں کارزار طرابلس، مظالم بلقان (ص۴۰۶-۴۰۷) میں بھی روح کارفرما ہے۔ ۱۸ر جون (۱۹۱۳ء) کے شمارہ کے شذرات (ص۴۱۲-۴۱۶) اور مقالہ ناموران غزوہ بلقان (۴۲۶ - ۴۲۷) نیز شئون عثمانیہ (ص۴۲۸) ملاحظہ ہو۔ ۲۵ر جون کی اشاعت میں کارزار طرابلس (۴۵۰ - ۴۵۱) میں یہی روح منعکس ہے۔ ۲ر جولائی کو مسئلہ شرقیہ بلقان اقوام کی تحریک (۱۶-۱۸) زیر نظر رہے۔ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس موضوع پر ۱۶ر جولائی کو بھی ایک مقالہ شائع ہوا (ص۵۶-۵۷) اسی شمارہ میں انگلستان ترکی اور ہندوستان کے زیر عنوان (ص۵۵) مقالہ منظر عام پر آیا، نیز دولت عثمانیہ کے مستقبل (ص۵۳) کے بارے میں ایک مقالہ شائع ہوا۔ ۲۳ر جولائی کے شمارے میں واقعہ تسخیر ایڈریانوبل اور شذرات میں تسخیر ادرنہ (ص۶۲-۶۴) کے زیر عنوان ترکوں کی فتح پر ایمان پرور مقالہ مولانا نے لکھا۔ جس کی چند عبارتیں ہدیۂ ناظرین ہیں:

"۔ ۔ فاتحان عثمان شہر میں داخل ہو گئے۔ دنیا ناامید ہو چکی تھی۔ یورپ سمجھ چکا تھا کہ ترک جاں بلب ہیں۔ اب وہ اقدام کے قابل ہی نہیں رہے۔ لیکن قدرت کاملہ کے دست اعجاز نے اسی بیمار سے تندرستوں کو شکست دلائی۔ ترکوں کا اجتماع ہوتے ہی بلغاری مرعوب ہو کر بھاگ گئے۔ ۔ ۔"

'الہلال' میں یورپ کی اسلام دشمن پالیسی پر بھی مقالات آتے رہے اور ان کے مظالم پر نقد و جرح کا سلسلہ جاری رہا۔ ۳ر جولائی کو دول یورپ کی کارروائی اور عثمانیوں پر کیوں مظالم ہوں، (ص۵۵)، نیز مسئلہ شرقیہ بلقان (۹۰ - ۹۱) کے زیر عنوان مضامین شائع ہوئے۔ ۶ر اگست کو یورپ کے اس نعرہ پر تنقید کی گئی۔

"ترکوں سے نجات حاصل کرو ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔"

مظالم بلقان پر ۲۰ر اگست کا شذرہ (ص۱۵۵-۱۵۷) لائق ملاحظہ ہے۔ حمایت ترکی پر الہلال اور دیگر

اور سنہ کے زیر عنوان ۳ ستمبر (ص۱۸۱ـ ۱۸۹) کا مقالہ اسی روح کی آواز ہے۔ الہلال پریس پر مقدمہ کی روئیداد پہلی اکتوبر کے شمارہ (ص۲۵۳) میں موجود ہے۔ الہلال کے دیگر جرائم میں ایک جرم یہ بھی تھا کہ یہ پرچہ ترکی جاتا تھا اور وہاں سے مراسلات آتے تھے (ص۲۹۵) حمایت اور امداد کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان میں قرآن کریم کی تفاسیر کے ہدیہ جات کی رقم بھی ترکی جانے لگی۔ ۵ رنومبر کے شمارہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"ترجمہ اردو تفسیر جس کی قیمت اعانت مہاجرین عثمانیہ میں شامل کی جاتی ہے۔۔۔" (ص۳۵۴)

ہر شمارے میں اس اشتہار کا اعادہ ہوتا رہا۔ اسی شمارہ کے ص۳۷۰ پر دولت عثمانیہ کے مستقبل پر ایک مقالہ ملاحظہ ہو۔ اس موضوع پر ۱۲ رنومبر کو بھی مقالہ شائع ہوا (ص ۳۹۳-۳۹۴) ۲۶ رنومبر کو جنگ بلقان کی مہلک انجامی (ص ۴۰۴-۴۰۵) کے زیر عنوان مقالہ آیا۔ ۱۰ ردسمبر کو شئون عثمانیہ بعد از جنگ (ص ۴۴۱-۴۴۲) کے زیر عنوان افکار شائع ہوئے۔ ۱۷ ردسمبر کو صلح نامہ دولت عثمانیہ و یونان (ص۴۵۷-۴۵۸) شائع ہوا، اور ۲۴ ردسمبر کو الہلال کے اداریہ میں مستقبل بلاد عثمانیہ (ص ۴۷۷-۴۸۰) کے عنوان سے ایک اہم مقالہ شائع ہوا۔

۱۹۱۳ء کے الہلال سے ترکی اور یورپ کے مابین تصادم اور اہلِ ہند کی حمایت کا جو خاکہ سامنے آتا ہے۔ اس سے مسلمانانِ ہند و پاک کی روح پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے۔ اسی روح نے خلافت تحریک کو برپا کیا جو بہ الفاظِ دیگر 'تحفظ ترکی' کی تحریک تھی جسے برطانیہ نے ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا۔ برطانیہ مسلمانوں کے جذباتی تعلق کو ترکی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف مسلمان نہ صرف تحریر و تقریر اور مالی امداد پر کمربستہ تھے بلکہ ترکی ٹوپی کے استعمال کے ذریعہ اپنی حمایت کا برملا اعلان کر دیا اور تحریکِ خلافت کے ذریعہ برطانیہ کے مدمقابل کھڑے ہو گئے، کیونکہ یہ تحریک ترکی کی اخلاقی، دینی بلکہ سیاسی تائید میں تھی۔

ترکی کی حمایت اور برطانیہ کی مخالفت:

۱۹۱۲ء میں جوں ہی اٹلی نے برطانیہ اور دیگر مسیحی قوتوں کے اشارہ پر ترکی کے ولایت شرق طرابلس پر حملہ کیا ہندوستان میں کہرام مچ گیا۔ اٹلی کے مال کا بائیکاٹ ہوا، اور 'الہلال'، 'زمیندار' اور

ریاستوں کو اُبھارا اور ترکی پر حملہ کروا دیا۔ اس پر ہند و پاک کے جذبات اس قدر بھڑکے کہ ترکوں کی تائید میں مظاہرے ہونے لگے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی قیادت میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک طبّی وفد بلقان روانہ کیا۔ مسلمان والنٹیر بن کر ترکی جانے اور لڑنے کے لیے بھرتی ہونے لگے۔ مگر برطانیہ نے اس کی اجازت نہ دی۔ اسی اثنا میں برطانیہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر نے ایک سڑک نکلوانے کی غرض سے کانپور کی مسجد کے ایک کونہ کو شہید کروا دیا۔ احتجاج پر مسلمانوں کے خلاف ۱۳ راگست ۱۹۱۳ء کو گولی چلی۔ مسلمان شہید ہوئے۔ اس اثنا میں مسجد مچھلی بازار کانپور کا قضیہ کھڑا کر کے برطانیہ نے مسلمانوں کے ذہن کو ترکی کی اعانت سے ہٹا کر داخلی انتشار کی طرف مبذول کرا دیا۔ خود الہلال میں سال بھر سے زیادہ اس پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ مشہد اکبر کانپور کے زیر عنوان ۳ رستمبر ۱۹۱۳ء کا مقالہ (ص ۱۷۹۔ ۱۸۲) لازوال تحریر ہے اس میں برطانوی مظالم کو آشکارا کیا گیا۔ مسلم وفد مولانا محمد علی جوہر اور وزیر حسین کی قیادت میں لندن گیا۔ (پاکستان ناگزیر تھا) از سید حسن ریاض جامعہ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۶۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام (لا ممبر ہند) نے اس کا تصفیہ کرایا، لیکن مسلمان مطمئن نہ ہوئے اور برطانوی حکومت کے خلاف ہو گئے، نفرت بڑھتی گئی۔

جنگ بلقان کے ختم ہوتے ہی پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی۔ اب برطانیہ اور ترکی حریف بن گئے۔ لندن ٹائمز نے ترکوں کی پسند کے زیر عنوان توہین آمیز مقالہ لکھا۔ محمد علی جوہر نے اسی عنوان کے تحت کامریڈ میں دندان شکست جوابات دیے۔ برطانیہ نے کامریڈ کی اشاعت بند کر دی۔ محمد علی اور شوکت علی نیز حسرت موہانی نظر بند کر دیے گئے۔ مسلمانوں نے مسلم سپاہیوں کو ہند سے ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجنے کے خلاف احتجاج کیا (ایضاً ص ۶۳)۔ یہاں کے مسلمانوں کو یہ بھی شدید ناگوار گزرا کہ عربوں نے ترکوں کے خلاف ایسے نازک وقت میں بغاوت کی جب وہ اسلام دشمن مسیحی قوتوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اس بغاوت سے ترک جس نے چھ سو برس یورپ کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کی تھی تباہ ہو جائے گا اور عربوں کی گردنوں میں ترکوں کے بجائے مسیحی اقوام کی حکومت کا قلادہ پڑ جائے گا۔ (ایضاً)

مسلمانوں کو بڑی مسرت ہوئی جب ترکی نے ادرنہ پر قبضہ کیا، کیونکہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک

کریٹ قبرص وغیرہ نیز بلغاریہ، بوسنیہ، ہرزی، گو دینیہ، اور افریقہ میں مصر و طرابلس وغیرہ)۔

مسلمانوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ پورا جزیرہ عرب، عراق، حجاز، شام اور فلسطین نیز مقامات مقدسہ کو خلیفۃ المسلمین کے ماتحت دیا جائے (ایضاً ص۵۸)

یہ کشمکش جاری تھی کہ پہلی جنگ عظیم ختم ہوگئی اور ۱۴ رمئی ۱۹۲۰ء کو معاہدہ سیورے کی خبر ہندوستان آئی اور یہاں گھر گھر صف ماتم بچھ گئی۔ سارے برصغیر میں احتجاجی جلسے شروع ہو گئے۔ مدراس میں ۷ رجنوری ۱۹۱۹ء کو سیٹھ یعقوب حسین کی زیر صدارت، لکھنؤ میں ۲۶ رجنوری ۱۹۱۹ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی زیر صدارت احتجاجی جلسے ہوئے۔ اسی طرح لکھنؤ میں ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس سر ابراہیم ہارون جعفر کی صدارت میں ہوئی اور دہلی میں ۲۳ رنومبر ۱۹۱۹ء کو فضل الحق کی صدارت میں عظیم جلسہ ہوا۔

لکھنؤ کانفرنس میں حرمین کی خلافت اور اماکن مقدسہ کے تحفظ پر غور و خوض کے بعد طے پایا کہ اس کے مستقل تحفظ کا نظم کیا جائے۔ بمبئی کے نمائندوں نے کانفرنس کو مطلع کیا کہ بمبئی کے سیٹھوں نے قبل ہی مجلس خلافت کے نام ایک انجمن قائم کر لی ہے۔ اسی کو آل انڈیا انجمن بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی قائم کی جائے جس کا مرکز بمبئی ہو، کانفرنس میں تجویز منظور ہوگئی۔ اس طرح کل ہند خلافت کمیٹی قائم ہوگئی۔ اس کے صدر سیٹھ چھوٹانی اور سکریٹری حاجی صدیق کھتری مقرر ہوئے۔ رہائی کے بعد اس کے سکریٹری مولانا شوکت علی بنا دیے گئے۔

خلاصۂ کلام:

اسلام کے علمبردار عربوں نے دین کو شش جہات پھیلایا اور نامور فتوحات کے ذریعہ تاریخ کے صفحات میں نئے ابواب کا اضافہ کیا۔ لیکن جب ان میں ضعف آیا اور زوال شروع ہوا تو قدرت نے اسلامی دعوت کو مزید مستحکم رکھنے اور عقیدہ کی خدمت کے لیے ترک عسکری جوہر کو مائل بہ اقدام کر دیا[1] ترکان عثمان نے صدیوں حرمین شریفین کی خدمت کی اور عالم اسلام کے خلیفہ رہے۔ ان کے سیاسی اقتدار سے یورپ ہمیشہ ہراساں رہا۔ مائیں بچوں کو لفظ ترک سے ڈرایا کرتی تھیں

---

[1] ملاحظہ ہو جاحظ (۱۵۹۔ ۲۵۵) کے نظریات مندرجہ ذیل تالیف میں رسالۃ فی فضائل الاتراک

تو شہنشاہان یورپ سلطان ترکی کی جانب سے آئے ہوئے اپنے نام مراسلات پر فخر کیا کرتے تھے۔ حالانکہ القاب مراسلہ میں عام طور پر حسب ذیل الفاظ ہوا کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منجانب سلطان ترکی سرور ہفت براعظم اور ہفت بحر، سدا کامران و فیروزمند۔ شاہ (یورپ) کے نام سدا ہزیمت خوردہ اور نامراد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ بین الاقوامی سیاسی تفوق یورپ کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ ہمیشہ ترکی کو نہ صرف یورپ بلکہ مقبوضات ایشیا و افریقہ سے بھی ختم کرنے کے درپے رہے۔ چار سو سال تک پیہم صلیبی جنگوں کے ذریعہ شرق اوسط کے مسلمانوں کو بالعموم اور ترکوں کو بالخصوص فنا کرنے کی سعی جاری رہی، لیکن ترک نژاد صلاح الدین ایوبی نے بطانوی رچارڈ کی کمان میں یورپ کی متحدہ صلیبی افواج کو شکست دے دی اور ان کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ آخر ۱۹۱۶ء کے بعد عربوں کی مدد سے برطانیہ ترکوں کو شرق اوسط سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

زوال ہر سیاسی اقتدار کا مقدر ہے۔ ترکوں کا ضعف بھی شروع ہوا اور انتظامیہ کی کمزوری کی وجہ سے عربوں میں بیزاری پیدا ہوئی۔ مطالبہ اصلاح بھی شروع ہوا۔ برطانیہ اور فرانس دو متحارب اور رقیب مسیحی قوتوں کو سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ نت نئے طریقوں سے ترکوں کے خلاف نفرت کو اس درجہ بھڑکا دیا کہ عرب، ترک خون کے پیاسے ہو گئے اور مستقبل سے غافل ہو کر لارنس آف عربیا جیسی شخصیت کی معیت میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی۔ برطانیہ کامیاب ہوا۔ ترک ہارا اور عرب ناکام و نامراد بلکہ رسوا ہوئے۔

یہ تمام مناظر عبقری جوہر دماغ مولانا آزاد کی نظروں میں ۱۹۱۲ء سے گھوم رہے تھے۔

عالم اسلام پر گھٹا ٹوپ صلیبی بادل :

ماضی و حال پر ایک طائرانہ نظر :

مولانا کی دور بینی :

قرآن کریم کی مختصر سی آیت، لن ترضیٰ عنك اليهود ولا النصارىٰ حتىٰ تتبع ملّتهم۔ یعنی یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کبھی خوش ہو ہی نہیں سکتے اگر مسلمان ان کی ملّت میں مدغم بھی ہو جائیں۔ آج بھی برحق ثابت ہوئی۔ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ دو ہزار سالوں کے مسیحی مذاہب کے بعد

مل کر پھر اسلام اور مسلمانوں کو فنا کر دینے کے درپے ہیں۔

"یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم"۔ (سورۂ مائدہ آیت ۵۱)

آج عالم اسلام پر گھٹا ٹوپ صلیبی بادل اسی طرح چھا رہے ہیں جس طرح گیارہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک میدان کارزار میں چھائے رہے۔ سنہ ۱۰۹۹ء سے سنہ ۱۴۶۴ء تک تقریباً ۴½ سو سال صلیب کی دس معرکہ آرائیاں (TEN ROUNDS) یروشلم، فلسطین اور شرق اوسط کے ارد گرد جاری رہیں۔ آخر ترک نژاد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیب کی کمر توڑی۔ پھر ملوک سلاطین اور خاص کر سلطان بیبرس نے ان کا خاتمہ کیا۔ بعد میں قوت عثمانیہ کے عروج اور قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد مسیحی یورپ کی صلیبی عسکری قوت کا خاتمہ ہو سکا۔

صلیب کی ان تاریخی جنگوں پر ایک طائرانہ نظر اور حالیہ عالمی صلیبی سازشوں کا باہمی موازنہ کرنے کے بعد ہی قاری حضرت مولانا آزادؒ کی سیاسی بصیرت اور دینی جوش کو سمجھ سکتا ہے۔ صلیبی یورپ نے جس طرح عالم اسلام کی شہ رگ پر قبضہ کر رکھا ہے کسی نابینا سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ مسلمان اس قدر کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں کہ حالی کا مسدس پڑھ کر مرثیہ تو کر سکتے ہیں لیکن حل تلاش نہیں کر سکتے۔ مسلم حکمراں روس و امریکہ کے غلام بن کر عالم اسلام کی مزید رسوائی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ اس المیہ سے نکالنے کے لیے مولانا آزاد نے جنگ کا آغاز سرزمینِ ہند سے شروع کیا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ یہ اور بات ہے کہ تاریخ کے فیصلے بدلے نہیں جا سکتے۔

یہود و نصاریٰ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے، اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنا ان کے مذہبی اور سیاسی منشور کا جز و اعظم تھا۔ فلسطین اور یروشلم خلافت اسلامیہ کا ایک حصہ تھا۔ مسیحی زائرین حضرت عیسیٰؑ کے مقام پیدائش کی زیارت کے لیے ہر سال سارے یورپ سے آیا کرتے تھے۔ متعصب پادری اور پوپ (POPE) واپسی کے بعد ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتے رہے اور یروشلم کی بازیابی و فتح کو مذہب و سیاست کا رکن رکین قرار دے دیا۔ وہ بادشاہوں، چرچوں اور عوام کو ہمیشہ جنگ پر آمادہ کرتے رہے۔ آخر نومبر سنہ ۱۰۹۵ء میں پوپ کی مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس مقام کلرمانٹ میں

ملے پایا کہ یورپ کے گوشہ گوشہ سے ترکوں کو نکالا جائے۔ اجلاس کے دسویں دن یعنی ۲۸ نومبر ۱۰۹۵ء کو پوپ اربن نے معرکۃ الآرا تقریر کی، جنگ صلیب کو واجب قرار دیا، اور دشمنانِ خدا یعنی مسلمانوں کے خلاف صلیب برداری کو فرض قرار دیا۔ چارلس ملز (CHARLES MILLS) نے اپنی معروف کتاب "تاریخ صلیب" (THE HISTORY OF CRUSADES) جلد اول کے صفحات ۴۵ سے ۵۶ تک پوپ اربن کی تقریر کو بارہ صفحات پر تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ پوپ اربن کی شعلہ بیانی کا نمونہ ملاحظہ ہو، جو آج بھی صلیبی قوتوں کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ پوپ نے کہا:

"عزیزانِ ملت!

ترکوں کو مٹانے اور فنا کرنے کے سلسلہ میں جس قدر جانکاہ کوشش تم کرو گے اسی قدر عنداللہ ماجور ہو گے، تمہیں پناہ دوام حاصل ہوگا۔ عزیزو! ذرا اپنی حالیہ جدوجہد اور کاوشات کا موازنہ اس عظیم قربانی کے ساتھ کرو جو تم ترکوں کو نیست و نابود کرنے کے سلسلے میں کر سکتے ہو۔ بھلا دونوں میں کوئی اتصال ہے؟ آج تمہاری زندگی کی محنتیں، سازشوں اور شرانگیزیوں میں صرف ہو رہی ہیں۔ کہاں سازش کی مصروفیات اور کہاں دشمنانِ خدا (ترکی) کو مٹانے کی سعادت، جس کی تلقین میں تمہیں کر رہا ہوں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ۔ ۔ ۔"

(ملزص۴۶۔ راقم الحروف کی تالیف فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات صفحات ۸۴۔۸۶)

اس تقریر کی گونجیں مولانا آزاد کے ذہن میں موجود تھیں۔

پوپ کے اعلامیہ اور فتوی جہاد کے بعد سارا یورپ صلیب بردار بن گیا۔ کیا شاہ اور کیا گدا، سبھوں کے سر پر مسلمانوں کا خون کھولنے لگا۔ شرق اوسط پر مسیحی یلغار شروع ہو گئی، صلیبی افواج کی دس خوں ریز چڑھائیاں ہوتی رہیں۔ سات لاکھ صلیبی افواج پر مشتمل ڈویژن نے یروشلم کی طرف خروج کیا، یہ خونخوار درندے زندگی کے لیے موت اور آبادی کے لیے ویرانی کے دیو بن گئے۔ راستہ میں زندگی کے ہر نشان کو مٹاتے چلے گئے۔ آخر یروشلم پر چڑھائی کی گئی، معرکہ آرائی، مردم خوری اور بدکاری کے مناظر ناقابلِ بیان ہیں۔ آخر ۵ جولائی ۱۰۹۹ء کو یروشلم کا سقوط ہوا اور لاطینی حکومت قائم ہوئی۔ تین دنوں تک قتل عام میں ستر ہزار مسلم شہید ہوئے، گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اُس وقت چونکہ

دس ہزار مسلمان شہید ہوئے، شہر میں گھوڑوں کے ٹخنوں تک خون کی ندی بہنے لگی۔ نیم جان بچوں، بوڑھوں
عورتوں کی سسکتی لاشیں تڑپتی ہوئی بہنے لگیں۔ گوڈ فرے کی قیادت میں لاتینی حکومت قائم کی گئی۔ اگر
ان تفصیلات کا موازنہ آج اسی فلسطین اور سقوط یروشلم کے ساتھ کیا جائے تو شاید حالیہ درندگی اور صلیبی
روح، ماضی کی درندگی اور صلیب کے سامنے مات ہو جائے گی۔ ۱۹۱۷ء میں بالفور اعلامیہ کے بعد سے
عرب آبادیوں کے انخلا اور یہودیوں کی خفیہ و اعلانیہ درآمد سے لے کر تشکیل ریاست اسرائیل (۱۹۴۸ء)
تک اور ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ تک کا موازنہ کیا جائے اور ۷ر جون ۱۹۶۷ء میں سقوط یروشلم
کے مناظر پر نظر ڈالی جائے، تو منظر زیادہ دردناک ثابت ہوگا۔ گوڈ فرے اور لاتینی حکومت، باوجود
درندگی اور بہیمیت کے مسلمانوں کو فلسطین سے نیست و نابود نہیں کر سکی، جب کہ آج یورپ کی صلیبی
حکومتوں نے اسرائیل کو قائم کر کے فلسطین کا نام و نشان بھی مٹا دیا اور فلسطینی قوم کو فنا کرنے کی ساری
اسکیم مکمل کر لی۔ روس کو اشتراکی اور بے دین قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن وہ بھی روز اول سے صلیب بردار
رہا ہے۔ ماوراء النہر کی ۱۶ مسلمان ریاست کو ۱۸۸۴ء تک ہضم کر کے ۱۹۷۹ء میں افغانستان کو ہضم
کرنے کے لیے اتنی بڑی فوج بھیجی کہ شائد صلیب کے دس راؤنڈ کی مشترکہ فوج اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔
افغانستان آج ریگستان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ سب صلیبی ہاتھوں کا کرشمہ تھا۔

صلیب کے سابقہ راؤنڈ پر طائرانہ نظر: آج یہ راؤنڈ جاری ہے:

نصف صدی کے بعد پھر صلیبی یلغار شروع ہوئی۔ ۱۱۴۷ء میں ۹ لاکھ افواج پر مشتمل صلیبی ڈویژن
نے چڑھائی کی اور صلاح الدین ایوبی کے ساتھ معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔ ۲ر اکتوبر ۱۱۸۷ء کو صلاح الدین
ایوبی نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کیا، یورپ میں کہرام مچ گیا اور تیسری صلیب' زیر قیادت شاہ انگلستان
رچارڈ شیر دل اور صلاح الدین کے درمیان ہوئی۔ سارا یورپ رچارڈ کے ساتھ آیا، فوج کشی ہوئی اور
معرکہ ارسوف میں شیر دل رچارڈ بلکہ یورپ کی مشترکہ مسیحی صلیبی قوت کی کمر توڑ ڈالی گئی۔ اس معرکہ کی تفصیلات
لین پول نے اپنی کتاب صلاح الدین کے صفحہ ۳۱۴ پر رچارڈ کی سوانح سے نقل کی ہیں۔
رچارڈ کی یہ شکست ۱۹۱۷ء تک برطانیہ کے جگر کا ناسور بنا رہا۔ ۵۵ سال کی عمر میں تاریخ

امراض پھیلے، انھوں نے صلاح الدین کو بھی متاثر کیا۔ سارے عالم اسلام پر سوگواری چھاگئی۔ چوتھی صلیب ۱۲۰۲ء۔ ۱۲۰۴ء میں بھی یورپ کی متحدہ عسکری قوت نے یروشلم کی بازیابی کی ناکام کوشش کی۔ اس میں لاطینی قوت نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا۔ پانچویں صلیب کی یلغار ۱۲۱۷ء میں ہوئی۔ چرچ کاؤنسل کی قرارداد میں فتوحات مصر کا منصوبہ تیار ہوا۔ ڈھائی لاکھ صلیبی افواج میں اندھے، لنگڑے، لولے اور کوڑھی تک شریک ہوئے۔ چھٹی صلیب ۱۲۲۸ء میں شاہ جرمن فریڈرک کی ڈپلومیسی پر ختم ہوئی، اور ساتویں صلیب ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰ میں شاہ فرانس کی رزم آرائی اور دمیاط کی فوج کشی پر تمام ہوئی۔ صلیبی یورپ اور چرچ کو جب یقین ہوگیا کہ وہ اپنی متحدہ عسکری قوت کے باوجود مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے تو انھوں نے نئی اُبھرتی ہوئی منگول کی عسکری قوت کے ساتھ معاہدات کیے۔ منگول دربار میں پسران چنگیز کی بیگمات نستوری (NESTORIAN) عیسائی تھیں اور حکومت کی پالیسی میں دخیل تھیں۔ خود ہلاکو کی زوجہ خاص (DOKUZ KHATUN)۔ نستورن عیسائیہ تھی اور مسلمانوں سے نفرت کرتی تھی۔ ہلاکو کا کمانڈر انچیف (KITABUGA) بھی نستوری عیسائی تھا۔ بغداد کے حملہ کے موقع پر کتبوگا (KITABUGA) نے ہی فوجی کمان سنبھالی۔ کہا جاتا ہے کہ ہلاکو کی زوجہ خاص بھی اس میں شریک تھی۔

تائیدِ غیبی مسلمانوں کے ساتھ ہوئی۔ اسی اثنا میں سلاطین مملوک کا ظہور و عروج ہوا۔ جنھوں نے صلیب و منگول کے متحدہ محاذ (AXIS) کا قلع قمع کر ڈالا۔ سلطان بیبرس کی معرکہ آرائیاں تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں۔ شکست پیہم کے باوجود صلیبی حوصلہ کمزور نہیں ہوا۔ چرچ اور سلاطین یورپ دونوں صلیبی فوج کشی کی تیاریاں کرتے رہے۔ ۱۲۷۰ء میں آٹھویں صلیب کی فوج کشی کی تیاری انگلستان کے ہنری سوم نے کی۔ لیکن ضعیف العمری اور علالت کی وجہ سے وہ اس سعادت سے محروم رہا ہے۔ اس نے تیس سالہ اڈواڈ کو صلیب کی وصیت کی۔ اڈواڈ نے حسب وصیت تیاری شروع کی۔ لیکن شاہان یورپ نے ساتھ نہیں دیا۔ ۱۲۷۱ء میں وہ حملہ آور ہوا لیکن سلطان بیبرس نے اسے شکست فاش دی اور ساحلی علاقوں سے اہلِ صلیب کا انخلا کر ڈالا۔ پہلی اکتوبر ۱۳۶۵ء کو نویں صلیب کی چڑھائی الکزنڈیا پر ہوئی۔ شہر کی بے نظیر تاراجی تاریخ کی بے نظیر مثال ہے۔

تائیدِ غیبی کے طور پر ترک کی عثمانی قوت کا ظہور و عروج بھی اسی عرصہ میں ہوا۔ منگول کے مقبوضات پر ۱۳۲۳ء تک

کی قوت ختم ہوگئی اور آرمینیا کا صلیبی حاکم لیو ششم بھاگ کر فرانس پہنچا۔ چودھویں صدی کے اوائل عشرات سے ہی ترکی قوت اُبھر چکی تھی۔ اہل یورپ ترک قوت سے گھبرانے لگے۔ مراد کی قیادت میں ترک طاقت روز افزوں ترقی کرتی گئی۔

محمد ثانی ۱۴۵۱ء میں تخت نشین ہوا اور ترک بحری و بری قوت کی حیثیت سے مغرب کے نقشہ پر اُبھر آئے۔ قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضہ کے ساتھ ہی صلیب کی قوت ٹوٹ گئی۔ اور بزنطین کی طاقت ختم ہوگئی۔ شکست خوردگی کے باوجود چرچ کی آرزو صلیب ختم نہیں ہوسکی۔ پوپ پائس ثانی نے اپنے ذاتی اخراجات پر صلیب کا بیڑہ تیار کیا۔ یورپ کے تمام بادشاہ اور عوام سابقہ ہزیمت اور تباہی کو دیکھ کر اس صلیب کے مخالف تھے۔

چنانچہ ۸ر جولائی ۱۴۶۴ء کو صحت کی کمزوری کے باوجود سینٹ پیٹر اسکوائر کی ایک تقریب میں صلیب برداری کی مذہبی رسم ادا کی اور مشکل سے ایک بحری بیڑہ تیار کیا۔ پوپ کے رفقا اور شاہان یورپ نے اسے صلیبی جہاد سے باز رکھنے کی تلقین کی۔ ۱۴ر اگست ۱۴۶۴ء کو پوپ مرگیا۔ اس کی موت کے ساتھ یہ دسویں صلیب بھی پانچ سو سالہ کشت و خون کے بعد ختم ہوگئی۔ بظاہر صلیب کا دور ختم ہوگیا، مگر روح صلیب باقی رہی۔ یورپ کی متحدہ عسکری قوت اسلام اور مسلمانوں کو شرق اوسط سے مٹانے میں ناکام رہی۔ یورپ میں صنعتی انقلاب (انڈسٹریل انقلاب) شروع ہوا اور سارا عالم اسلام اہل یورپ کے زیر استعمار (COLONIALISM) آگیا۔ اسی دور میں صلیبی روح کام کرتی رہی۔ اسلامی تاریخ، کلچر، قانون کو مسخ کیا گیا اور یروشلم پر قبضہ کا پلان تیار ہوتا رہا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد فلسطین پر امام صلیب برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے بالفور اعلامیہ کے ذریعہ ریاست اسرائیل کی تشکیل کی منظوری دیدی اور یہودیوں کی درآمد جاری رکھی۔ آخر ۷ر جون ۱۹۶۷ء میں یروشلم کا سقوط ہوا اور اہل فلسطین کی تاراجی کا منصوبہ زیر عمل آیا جس کی طرف اشارات گزر چکے ہیں۔ اسرائیل کے نقشہ پر مکہ مدینہ اور خیبر کی فتح بھی شامل ہے۔ خاکم بدہن عربوں کی کمزوریاں اسرائیلی آرزوؤں کو تقویت نہ بخشے!

مولانا ابوالکلام آزاد کی نگاہ دوربین نہ صرف ماضی کی داستان صلیب پر تھی بلکہ مستقبل کی صلیبی سازشوں پر بھی تھی۔ ان کی آنکھوں نے اہل فلسطین کی بربادی کا نقشہ قبل از وقت دیکھ لیا تھا۔ لبنان کی

کے گھٹا ٹوپ بادل سے، جو جنگ عظیم کے بعد چھا رہے تھے، وہ ان سے آشنا تھے۔ اسی پس منظر میں مولانا آزاد کی سیاسی پالیسی یا فلسفہ (POLITICAL PHILOSOPHY) کی تشکیل ہوئی۔ برطانیہ کی کمر کو توڑنے کے لیے مولانا کی نظر میں ہندوستان کی آزادی ضروری تھی۔ یہ آزادی ملک کی اکثریت (یعنی ہندوؤں) کے ساتھ تعاون و اشتراک کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس فلسفہ کو عام شہری سمجھ نہ سکے، نہ ہی خواص کے ذہن میں یہ بات کھٹک سکی۔

مولانا کی داخلی پالیسی یعنی ہندوستان میں کانگرس کی صدارت اور قیادت کو اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے زندگی کے ہر لمحہ کو اسی جنگ آزادی کے لیے وقف کر ڈالا۔ ہندوستان میں اپنوں اور غیروں دونوں نے بدنام کیا، اتہامات والزامات تراشے، لیکن مستقبل بیں مجاہد خاموش رہا صرف اپنی منزل کی طرف نگاہ جمائے رہا۔ ہندوستانی سیاسی رہنماؤں میں صرف یہی ذات واحد ہے جس نے نکتہ چینیوں کا جواب نہیں دیا۔ معترضین سے اُلجھنے کے بجائے ان کے لیے دعائیں کیں۔ اس کی شہادت کے لیے جامع مسجد کا آخری یادگار خطبہ آج بھی موجود ہے جو بنگلہ دیش اور پاکستان میں پسپا اور برباد ہونے والے مہاجرین کے لیے آج بھی مرہم کا کام کر رہا ہے اور مولانا کی لاثانی بصیرت کی شہادت دے رہا ہے۔

تحریک آزادئ ہند میں مولانا آزاد کا تابناک کردار:

مولانا ابوالکلام نے پہلی جون ۱۹۱۲ء کو ساحل بنگال سے آزادی کی اذان دی، جب 'الہلال' کا شمارہ اپنی بلاخیز قوتوں کے ساتھ افق بنگال پر نمودار ہوا۔ بلاغت و فصاحت کا یہ معجز نما پرچہ صلیبی قوتوں کے امام برطانیہ کے کلیجہ میں خنجر آبدار کی طرح چبھ گیا اور گلے کا کانٹا بن گیا۔ ہندوستان کی آزادی کا صور اور برطانیہ کے انخلاء کی تحریک چل پڑی۔ الہلال نے ایک طرف جہاں مسلمانوں کے مذہبی شعور کو گدگدایا وہاں دوسری طرف آزادی کی نعمت و سعادت سے آگاہ کیا اور تیسری طرف محبّت کا درس دیا۔ برادرانِ وطن ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کی تلقین بھی کی جس کے بغیر نہ آزادی کا حصول ممکن تھا نہ ہی اخراج برطانیہ کی آرزو کی تکمیل ممکن تھی۔ ساحل بنگال سے ساحل سندھ تک آزادی کی آگ بھڑک اُٹھی۔ خلافت عثمانیہ کے تحفظ کی تحریک نے ہندو مسلم دونوں کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا۔ الہلال اب نہ صرف مسلمانوں، بلکہ ہندوؤں کی آرزوں

کراچی تک الہلال کی صفیں بچھ گئیں۔ مولانا آزاد کے قلم کی گرمی سے تاج برطانیہ پگھلنے لگا۔ ۱۹۱۴ء میں الٰہ آباد کے انگریزی روزنامہ پاینیر (PIONEER) نے اپنے اداریہ میں مطالبہ کیا کہ کلکتہ سے جرمنیت کی تحریک (PRO GERMANISM) اُٹھ رہی ہے، اسے فوراً روکا جائے۔ الہلال کا پرمٹ منسوخ کر دیا گیا۔ اِدھر الہلال بند ہوا، اُدھر البلاغ مطلع نور پر طلوع ہو گیا۔

مولانا آزاد کو بنگال بدر کیا گیا اور صوبجات پنجاب، یوپی اور مدراس میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ آخر سرزمینِ بہار نے امام الہند کا استقبال کیا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو سرفروشانِ راہ حریت کا امام اعظم رانچی کے جیل میں نظر بند کیا گیا۔ چند سالوں تک اس مجاہد اعظم کی آواز بند کر دی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ کوئی دوسرا لیڈر مطلع آزادی پر اس زور و شور سے نمودار نہیں ہوا تھا۔ آزادیٔ ہند کا پہلا مجاہد جیل کی صعوبات سے دوچار ہوا۔ خود گاندھی جی مطلع آزادی پر نمودار نہیں ہوئے تھے۔[1] اے۔ بی۔ راجپوت اپنی کتاب مولانا آزاد (لاہور ۱۹۵۷ ص ۵۱) میں رقم طراز ہیں کہ جب مجاہد اعظم امام الہند مولانا آزاد جیل گئے گاندھی جی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے گجرات میں اپنی مہم چلا رہے تھے۔

---

[1] جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی زندگی سے متعلق بعض معلومات دلچسپی سے خالی نہیں۔ گاندھی جی کی آمد وہاں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ہوئی۔ دو مسلمان تاجر خاندان مقدمہ بازی میں مبتلا تھے۔ حکومت نے انھیں اجازت دی کہ وہ ہندوستان سے کسی وکیل کو اپنی وکالت کے لیے بلا سکتے ہیں۔ اس طرح گاندھی جی وہاں ۱۸۹۹ء میں آئے اور ۱۹۰۶ء تک مقیم رہے، اور مختلف قسم کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۰۶ء میں وہ ہندوستان واپس آگئے اور تین سالوں کے بعد پھر ۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ واپس آگئے۔ ۱۹۱۴ء میں وزیر اعظم جنوبی افریقہ مسٹر اسمتھ کے ساتھ گاندھی جی نے ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق کوئی ہندوستانی آئندہ جنوبی افریقہ آنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے افریقہ کی سفید فام حکومت گھبرا رہی تھی۔ اس معاہدہ سے جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانی عوام ناخوش ہوئے کیونکہ وہ اپنے اعزا کو ہندوستان سے بلانا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کی عدم مقبولیت کا یہی عظیم سبب تھا جس کی بنا پر گاندھی جی ۱۹۱۴ء میں جنوبی افریقہ سے ہمیشہ کے لیے ہندوستان واپس آگئے اور پھر کبھی جنوبی افریقہ نہیں جا سکے۔ یہ وہ دور تھا جب پہلی جنگ عظیم کی آگ بھڑک رہی تھی اور ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد کی شہرت بذریعہ الہلال نصف النہار پر تھی۔ درحقیقت ہندوستان

مولانا کا انقلاب پرور قلم جیل میں بھی بے قرار رہا۔ ترجمان القرآن کی تالیف اسی بے قرار ذہن کی پیداوار ہے۔ قرآن کریم کی بالکل اچھوتی تفسیر پیش کی اور قرآن میں آزادیٔ فکر و نظر کے رموز کو آشکارا کیا۔ سورۂ فاتحہ کی لاثانی تفسیر لکھ ڈالی اور ثابت کیا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے والا اور ہدایت کی دعا مانگنے والا خدا کے سوا کسی کی غلامی کو قبول ہی نہیں کر سکتا ہے۔ توحید کا متوالا صرف خدا سے ہی استعانت و ہدایت کا طلبگار ہوتا ہے۔

مولانا نے ۱۹۱۵ء میں البیان لکھی اور عبقری حافظہ کی مدد سے تذکرہ نامی خود نوشت سوانح تیار کر ڈالی جو ۱۹۱۶ء میں نمودار ہوئی۔ جیل میں مصادر کی نایابی کی وجہ سے حافظہ پر اعتماد ناگزیر تھا۔ ترجمان القرآن جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک نمودار ہوا۔ اس کے مسودات کو برطانیہ نے غائب کروا دیا۔ لیکن عبقری حافظہ سے وہ پھر نمودار ہو گیا۔ غبارِ خاطر ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آئی اور مولانا کی انشاء پردازی، حافظہ اور شعر و شاعری کے ذوق کی دستاویز بن گئی۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے ذریعہ وہی کام لیا جو ابن تیمیہ وغیرہ نے اپنی تحریروں سے یونانی فلسفہ کے خلاف لیا تھا۔ ابن تیمیہ کے خیال میں یونانی فلسفہ کا قبول عام ہی مسلمانوں کے تنزل و زوال کا سبب تھا۔ کم و بیش یہی نظریہ مولانا آزاد کا تھا۔ ان کے خیال میں امت مسلمہ کا زوال مغربی فلسفہ کے آگے سرنگوں ہونے کا نتیجہ ہے۔ ان انقلاب پرور افکار نے برطانیہ کے اوسان خطا کر دیے۔ مولانا آزاد کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت استاذی علامہ سید سلیمان ندویؒ نے معارف کے شمارہ مارچ ۱۹۱۹ء میں تحریر فرمایا کہ:

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں یا تو ابن تیمیہ، ابن قیم کے حالات لکھ رہا ہوں یا امام سرخسی یا امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات لکھ رہا ہوں۔"

مولانا آزاد چار سالوں تک رانچی جیل (بہار) میں نظر بند رہے، ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو پروانۂ رہائی ملا، اور ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو جیل سے رہا ہوئے۔ جنگ عظیم کے بعد وہی کچھ ہوا جسے مولانا کی نگاہ دوررس نے دیکھا تھا۔ شکست خوردہ ترکی اب صلیبی اتحادی قوتوں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہی ترکی جو کبھی سرورِ ہفت اقلیم اور دارائے ہفت سمندر کے نام سے تاریخ میں معروف تھا، صلیبی قوتوں کے شکنجہ میں پھنس گیا۔ صرف اناطولیہ (ANATOLIA) کے بسا دشدہ علاقے اس کے پاس رہ گئے، خلافت کے خاتمہ کی سازش چل پڑی۔ تحفظ خلافت ترکی کے لیے

[illegible]

نظر بند تھے۔ خلافت تحریک کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ خاص کر یروشلم وغیرہ محفوظ رہیں۔ انڈین کانگرس بھی خلافت تحریک میں شریک ہوگئی۔ مولانا آزاد جیل سے نکلتے ہی تحریک خلافت میں فعّال طور پر شریک ہوئے۔ کلکتہ میں ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ مولانا نے یادگار تقریر کی اور برطانیہ کو ترک موالات (عدم تعاون) کا الٹی میٹم دے دیا، میرٹھ میں خلافت کانفرس کا انعقاد ہوا۔ اس میں برطانیہ کے خلاف ترک موالات (NON-COOPERATION) کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔ مولانا آزاد کی تقریر نے سامعین کو حیرت زدہ کر دیا۔ جوان، بوڑھے سب دم بخود رہ گئے۔ اسی کے بعد مولانا کو امام الہند کا خطاب ملا۔ مولانا آزاد نے سارے ملک کا دورہ کیا اور تحریک ترک موالات کے اغراض و مقاصد اور فلسفہ کی اشاعت و تبلیغ کی، مولانا کی خطابت و بلاغت نے تاجِ برطانیہ کے دن ناپ دیے۔ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ شروع ہوا، ولایتی یا انگریزی مال، لباس، زبان، قانون، خطابات کا بائیکاٹ ہوا اور خانہ ساز کھادی کپڑے استعمال میں آنے لگے۔ ترکی کی حمایت میں لوگوں نے ترکی ٹوپیاں پہننی شروع کر دیں۔ ان تحریکات نے انگریز کے خلاف نفرت کی آگ کو شعلہ بداماں بنا دیا۔ تحریکِ خلافت نے جہاں ایک طرف نشأۃ اسلامیہ کو گدگدایا وہاں دوسری طرف آزادیٔ ہند کی تحریک کو بھی تیز تر کر دیا۔ تحریک کی مالی تعاون کا جذبہ اس قدر بڑھا کہ مسلمان عورت و مرد نے مال نچھاور کر دیے، خواتین نے زیورات کے ڈھیر لگا دیے۔

گرفتاری کا دور شروع ہوا اور خلافت کے قائدین گرفتار کیے گئے۔ علی برادران ستمبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے، ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء مولانا ابوالکلام آزاد جیل بھیج دیے گئے اور انڈین پنال کوڈ (INDIAN PENAL CODE) کے دفعہ الف (A) کے تحت مولانا آزاد کے خلاف بغاوت کا فردِ جرم عائد کر کے مقدمہ شروع کر دیا گیا۔ مولانا نے اپنی وکالت کے لیے نہ کسی وکیل سے مدد طلب کی، نہ ہی کسی دوسرے کی استعانت کے محتاج ہوئے۔ مولانا نے اپنی وکالت خود کی اور اپنا دفاع بھی خود ہی کیا۔ یہی بیان آزادیٔ ہند کا منشور بن گیا۔ اسی دفاع کا نام "قولِ فیصل" ہے جو احمد نگر قلعہ کی بازگشت ہے۔ اس بیان کی سحر انگیزی اور جادو بیانی سے وہی واقف ہے جس نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ مولانا نے اعلان کر دیا کہ تحریک خلافت برطانیہ کے مظالم، بربریت اور ظالمانہ حکومت کے خلاف آزادی کی تحریک ہے اور تحریک آزادی کے مجاہدین کے خلاف بغاوت (SEDITIONS) کے مقدمات برہنہ بربریت ہے۔ دسمبر ۱۹۲۱ء سے جنوری ۱۹۲۲ء

تک جاری رہی جب ہندوستان برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہوا۔

مولانا نے اپنے تجربات کو اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم (INDIA WINS FREEDOM) میں قلمبند کر کے تاریخ آزادئ ہند کی جدوجہد کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ ان کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔ خود نہرو جی کا اعتراف ہے کہ مولانا نے آزادی کی راہ میں سالوں کی مسافت کو ہفتوں میں طے کیا ہے۔ کرپس مشن (THE CRIPPS MISSION) لندن سے مصالحت کا پیام لے کر ہندوستان آیا۔ سر اسٹافورڈ کرپس (SIR STAFFORD CRIPPS) نے مختلف پارٹی کے نمائندوں سے ملاقات کی۔ کانگریس کی سب سے پہلی نمائندگی مولانا آزاد نے فرمائی۔ کرپس مشن کی رپورٹ کے مؤلف تاریخ نوآبادیات کے پروفیسر آکسفورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر کپلانڈ (R. COUPLAND) (آکسفورڈ یونی ورسٹی ۱۹۴۲ء ص ۲۷ پر) رقمطراز ہیں:

"Congress was represented at the first interview by Maulana Azad, its Muslim President and there after by Maulana and Pandit Nehru together.... on March 29, 1942, at Birla House. (P. 27),

اس بیان سے واضح ہے کہ نہرو جی سے پہلے مولانا آزاد نے کرپس سے ملاقات کی اور آزادئ ہند کے مراحل پر گفتگو کی۔ مولانا کی سیاسی بصیرت اور انگریزی دانی کے لیے اس قسم کے بے شمار واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ نہرو جی بعد میں مولانا آزاد کی معیت میں کرپس سے جا کر ملے۔ رپورٹ کے ۴ صفحات میں جہاں جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہاں مولانا آزاد کی فراست و عبقریت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آج کے بالشتی صحافی جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے مولانا آزاد پر حرف گیر ہیں اور ان کی صلاحیت و عبقریت پر شبہ کرتے ہیں، ان کی مثال آفتاب پر تھوک پھینکنے والوں کی سی ہے۔ دانشوروں کی ناقدری کرنے والوں نے جو قیمت تاریخ میں پہلے ادا کی ہے وہی قیمت اس قسم کے متعصب صحافی، سیاسی اور دیگر رہنماؤں کو آئندہ بھی ادا کرنی ہوگی۔ یہ تاریخ کا ہمیشہ سے

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جامع مسجد دہلی میں مولانا آزاد کی درد بھری پکار:

تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی بربادی کا جو نقشہ برصغیر میں رونما ہوا اس کی شہادت وہی دے سکتا ہے جس نے ان بربادیوں کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، برصغیر ہند کا کوئی گھر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس انقلاب کی بربادیوں کی یاد صدیوں تاریخ اسلام میں زندہ رہے گی۔ مسلمانوں کے اضطراب اور کشمکش اور خاندانوں کی بربادی، ہجرت و مہاجرت کے مقدس نام پر بھگدڑ اور پاکستان جاکر بے خانماں برباد ہونے کی کہانی آج سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ تقسیم ہند کے ساتھ خاندان کے افراد بٹ گئے، کٹ گئے" عورتوں کا اغواء تاریخی یادگار بن گیا۔ پاکستان میں ہندوستانی مہاجروں کا جو حشر آج چالیس سالوں بعد ہو رہا ہے، یا بنگلہ دیش میں جو کچھ ہوا وہ پوشیدہ نہیں۔ آج مہاجر قومی محاذ کی قیادت میں ہر مہاجر اپنی بقا کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ چار قومی تنازعہ میں پس رہا ہے۔ مولانا آزاد نے فرمایا تھا کہ تم اپنا وطن ہندوستان چھوڑ کر جہاں جا رہے ہو وہاں ہمیشہ غیر مقبول اور نامانوس رہو گے۔ چالیس سالوں کے بعد یہ دور بینی روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ مہاجرین کے خلاف جو نفرت، عداوت اور سیاسی تنازع للبقاء کا نقشہ اس وقت پاکستان میں برپا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔

آج ہر مہاجر مولانا آزادؒ کی درد بھری آہ کو یاد کرتا ہے اور ان کی بین الاقوامیت کا معترف ہے، شاہجہانی مسجد دہلی کے منار سے مولانا کی آہیں ہنوز گونج رہی ہیں۔ اس کی صدائے بازگشت سے آج بھی مہاجرین چشم گریاں اور دل بریاں کے ساتھ بنگلہ دیش کے المیہ کو یاد کر رہے ہیں اور اب پاکستان کے چار قومی چکی کے اندر پسے جانے کے مناظر کو دیکھ رہے ہیں۔

مولاناؒ نے فرمایا:

"عزیزان گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں یہیں خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا، اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے

اعتماد، آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قطع کر لیے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینا چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو تمھیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی ہر شکل دکھا کر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعتراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم، کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

دور افتادہ صدا:

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چُن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی، کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے، یہ تمھارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمھیں کہا تھا کہ ڈر قوموں کی حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سُنی اَن سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار

کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمھارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا رسے مختلف مفہوم رکھتی ہے، یعنی تمھارے نزدیک عام طور پر فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

بساط اُلٹ گئی:

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف اُلٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا:

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی حکومت سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اُٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطّل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعے کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

وقت کی انگڑائی:

اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں واہمہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ بُری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔ ہاں تمھاری بے قراری اس لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بُری شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے، اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا۔

ہجرت یا فرار:

میں نے تمھیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اُٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سُنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر بھی غور کرو تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ۔ اپنے دماغ کو سوچنے کی عادت ڈالو، اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو، اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا، اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

تمھارا جوش و خروش بیجا تھا۔ اسی طرح آج تمھارا یہ خوف و ہراس بھی ہولے ہے مسلمان اور بزدلی۔ یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمھارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عجیب بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمھارے دل تو اُن کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّیؐ کی معرفت فرمایا تھا:

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"۔

(جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔)

ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلار کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

حرف شکایت:

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمھاری تغافل پیشگی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے، جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے، اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اسی طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان ہی صفحات میں زیب عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہیں۔۔۔؟؟

سورج سے کرنیں مانگ لو:

اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسہ سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو۔ کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمھارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اُٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو اُن سے کہا "تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔" یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان:

"لاتھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔"

آج کی صحبت ختم ہو گئی، مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں یہ تو دل کی دوکان ہی سے اعمال صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

سید زبیر احمد

وفیات

گزشتہ شمارہ میں مشیل عفلق کی وفات اور ان کے اسلام لانے کا ذکر ایک خبر کے طور پر کر دیا گیا تھا۔ چونکہ ہمارے بہت سے ناظرین کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ کون شخص تھا، اس کا ایمان لانا کیا اہمیت رکھتا ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ کسی قدر تفصیل سے ان کا تذکرہ کر دیا جائے۔

مشیل عفلق ایک شامی دانشور تھے، فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، مذہباً عیسائی تھے، اور مسلک کے لحاظ سے پختہ مزاج کمیونسٹ، جرمن زبان پر بھی عبور تھا اس لیے داس کیپٹل کا مطالعہ براہ راست بغیر ترجمہ کے کیا تھا[1]، ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اپنے ایک رفیق درس، ہم خیال رفیق صلاح الدین البیطار کے ساتھ مل کر ایک سیاسی تنظیم 'حرکۃ الاحیاء العربی' کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کا اولین مقصد یہ تھا کہ عرب من حیث القوم ایک اکائی ہیں۔ اسلام یا مسیحیت اور یہودیت کو عربوں نے جنم دیا ہے، عربوں کو ان مذاہب نے نہیں جنم دیا[2]۔ اور تمام مذاہب اپنے اپنے وقتوں میں اصلاحی تحریکات تھیں، جو ان زمانوں کے لیے کارگر تھیں جن زمانوں میں وہ سامنے آئیں، اسلام بھی اسی راہ ترقی کی ایک کڑی ہے۔ جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانہ میں مثبت خدمت انجام دے گیا۔ اس نے عربوں کے مذاہب قدیمہ سے اچھی چیزیں منتخب کرلیں، اور اس وقت کی عقلیت کے لحاظ سے وہ موزوں ترین کام تھا، جیسے شیر خوار بچے کے لیے ایک عمر تک "پالنے" کی ضرورت ہوتی ہے، لوریاں اس کو صحت بخش نیند لاتی ہیں، مگر جوان ہونے کے بعد اس کا "پالنا" ایک یادگار کے طور پر رکھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جوان ہونے کے بعد اسی کو اپنی آرام گاہ سمجھے تو بدعقلی ہوگی۔ 'اسلام' بھی ہماری تاریخ کا ایک کارنامہ تھا، اور ہم اس کو فراموش نہیں کرسکتے، اس کو تاریخ

---

[2] بلکہ اس کا عربی میں پہلا ترجمہ انھی کے قلم سے شائع ہوا تھا۔

کے عجائب خانہ میں ممتاز مقام پر رکھیں گے۔ یہ تحریک شام، لبنان کے عیسائیوں اور یہودیوں، جبل الدروز کے نُصیری شیعوں میں مقبول ہوئی اور اس کا حلقۂ نفوذ فوج کی چھاؤنی تک پہنچ گیا۔ کچھ دنوں بعد یہ ایک سیاسی پارٹی بن گئی اور اس کا نام 'حزب البعث العربي' پڑ گیا۔ یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ چنانچہ عرب ممالک میں 'سوریہ' پہلا ملک ہے جہاں "جمہوریت" کی بنیاد پڑی، اور 'الجمهورية العربية السورية'[1] نام رکھا گیا، لیکن یہ پارٹی اس وقت برسر اقتدار نہیں آئی تھی، ہاں یہ ضرور تھا کہ فیصل بن علی حسین الشریف[2] کی معزولی کے بعد سے فوجی حکومتیں قائم ہوتی رہیں اور ایک فوجی انقلاب کے اندر سے دوسرا انقلاب پیدا ہوا اور اس سے تیسرا۔ یہاں تک کہ حکومت پر حزب البعث کے افراد قابض ہو گئے، کچھ عرصہ کے بعد جب عراق میں شاہی حکومت ختم ہوئی تو چند فوجی حکمرانوں کے بعد البعث پارٹی کی فکر رکھنے والے قابض ہو گئے، آپس میں ان دونوں کے اختلاف بھی رہے اور اب تک ہیں، جیسے چین اور روس کے اختلافات ہیں۔

اس پارٹی کے قابض ہونے کے بعد اسلام کا نام ہر جگہ سے مٹانے اور کھرچ کھرچ کر کے دور کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ باِسم العروبة، عرب "قومیت" کے نام سے ...

السّلام علیکم کی جگہ تحية العروبة، جے عرب،

---

[1] مصر سے انضمام کے بعد الجزء الشمالی للجمهورية العربية المتحدة نام پڑ گیا تھا، بعد میں جب اس اتحاد کا خاتمہ ہوا تو اب العربية کا نام نکال دیا گیا۔ یوں ترکوں کے وقت السورية الکبریٰ میں لبنان، فلسطین، اردن، شام سب ایک ہی ملک تھے۔

[2] حجاز سے جب حسین بن علی الحسین کا اخراج ہوا تو ان کے تین بیٹوں کو تین ملکوں کا حکمراں بنایا گیا۔ فیصل بن الحسین شام کے شاہ مقرر ہوئے، جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا:

کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا — تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

عراق میں علی بن حسین جن کے پوتے فیصل ثانی کو اس فوجی انقلاب میں مارا گیا جو قاسم عبدالکریم کی سرکردگی میں

عہدوں اور وزارتوں کا حلف لیتے وقت اللہ کے نام پر قسم کھانے کے بجائے کہا جاتا :

اقسم بشرفی وکرامتی ۔ میں اپنی عزت نفس اور خود داری کی قسم کھاتا ہوں کہ ،

مشیل عفلق کی تحریک کو عروج جمال عبدالناصر کی ہمنوائی سے حاصل ہوا ۔ اور اول الذکر کی کاوش سے شام ومصر کا اتحاد عمل میں آیا تھا ۔ اگرچہ مصر میں اسلام اور اللہ کا نام لینا جرم نہیں تھا ۔ الحمدللہ ، ماشاء اللہ ، إن شاء اللہ وغیرہ کے الفاظ تو عام طور پر غیر مسلم بھی بولا کرتے ہیں ۔

حزب البعث العربی عرب کے اسلامی وجود کے لیے ایک ناسور ہے ، جس کے سکریٹری جنرل ، مشیل عفلق تھے ۔ اس پارٹی کے پردے میں نصیری ، دُرزی ، شیعہ جو ہمیشہ پسماندہ اور ناقابل التفات سمجھے جاتے تھے ، ان کی تعداد بھی کم تھی اور وہ خود عام مسلمانوں سے کٹ کر رہتے تھے ، سب فوج کے راستے سے حکومت کے ایوان تک پہنچ گئے ، اور آج انہی کا قبضہ ہے ۔

مشیل عفلق نے اپنی موت سے کئی سال پہلے پارٹی کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے کر فرانس میں زندگی گزارنا شروع کیا تھا ، وہاں ان کے مطالعہ میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور تاریخ عرب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی رائے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ عربوں کو اسلام سے الگ کرکے ایک مستقل اکائی سمجھنے کا عقیدہ ختم ہوگیا اور وہ کہنے لگے کہ اسلام کو عرب تاریخ سے نکال دیا جائے تو ہم کچھ نہیں رہ جاتے ۔ بالآخر مرنے سے پہلے اسلام لے آئے ، اپنے وصیت نامہ میں صراحت سے اس کا ذکر کیا البتہ اس کو اپنی موت تک پوشیدہ رکھنے کی ہدایت کی تاکہ اس کو سیاسی چال نہ سمجھا جائے ۔

ان کے انتقال کے بعد البعث پارٹی کا جو پہلا اعلامیہ نکلا اس میں ان کی وصیتوں کا ذکر تھا اور آخر میں یہ بیان کیا گیا کہ وہ مسلمان ہو چکے تھے اور کئی سال سے اسلامی عقائد کی کتابیں مطالعہ کر رہے تھے ، شام کے اخبار النصر نے لکھا کہ انتقال کی خبر تو قطعًا تعجب خیز نہ تھی البتہ اسلام لانے کی خبر حیرت انگیز ضرور ہے ۔ مصر کے اخبارات نے جلی سُرخیوں میں ان کے مسلمان ہو کر مرنے کی خبر کو شائع کیا ۔ سزا وجزا ، قبول وعدم قبول تو اللہ کے ہاتھ ہے ، مگر اتنا ضرور کہا جائے گا کہ اس شخص نے زندہ رہ کر اسلام کو عرب کے اسلامی کردار کو جس قدر نقصان پہنچایا اس درجہ وہ نفع بخش ہو سکتا تھا اگر اپنے عروج کے زمانہ میں اسلام لانے کا اعلان کر دیتا ۔ بہرحال اب مرنے والے کا معاملہ اس کے ہاتھ ہے جس کی رحمت عام ہے ۔

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں

اسلامی قوانین کی تدوین نظرثانی کے مرحلے میں:

اسلامی قوانین کی تدوین کا کام نظرثانی کے مرحلے سے گزر رہا ہے، یہ قوانین فقہ اسلامی کی کتابوں میں مدوّن ہیں لیکن دفعات کی شکل میں نہ ہونے کی وجہ سے ان سے استفادہ آسان نہیں ہے، گزشتہ برسوں میں شاہ بانو کیس کے ضمن میں جب مسلم پرسنل لا کے تحفّظ کی تحریک چل رہی تھی، ایک موقعہ پر تحریک کے ذمہ داروں نے وزیراعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کو بتایا کہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے حقوق اور نگہداشت کی ملکی قوانین کے مقابلہ میں اسلامی قانون میں بہتر ضمانت فراہم کی گئی ہے تو انھوں نے حیرت کا اظہار کیا اور خواہش ظاہر کی کہ ان کو دفعات کی شکل میں مدوّن کر دیا جائے تو ان سے استفادہ آسان ہو جائے گا اور انھیں قانونی شکل دی جا سکے گی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری جناب مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی نے اپنی زیر نگرانی یہ کام کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک مختصر عرصہ میں نکاح، طلاق، ہبہ، وصیت، وقف کے مسائل، دفعات کی شکل میں مدوّن کر دیے گئے، کام کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف نکاح کے متعلق قوانین ۲۸۵ دفعات پر مشتمل ہیں۔ دوسرا مرحلہ اس مجموعے کی نقلیں فراہم کر کے ملک کے مستند دینی اداروں اور ماہرین فقہ کی رائیں معلوم کرنے کا تھا یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا ہے، جن حضرات کو اس کام کی اہمیت اور نزاکت کا احساس تھا انھوں نے اس مجموعۂ قوانین کے بارے میں اپنی رائیں بھیج دیں۔ تیسرا مرحلہ ان جمع شدہ آراء کی روشنی میں نظرثانی کا ہے، یہ مجموعہ ابھی اسی مرحلے سے گزر رہا ہے۔ کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ اس مرحلہ

لیے دو نشستیں ہو چکی تھیں، تیسری نشست کا آغاز ۱۲ راگست کو ہوا، اور تقریباً آٹھ روز تک شب و روز یہ کام ہوا۔ خیال ہے کہ نظر ثانی کا بڑا مرحلہ طے ہو چکا ہے، پھر بھی ایک دو نشستوں کی مزید ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا آخری مرحلہ بورڈ کے اجلاس میں پیش کر کے منظوری حاصل کرنے کا ہوگا۔

نظر ثانی کے کام میں جن علما نے شرکت کی ان میں بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ کے علاوہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی چیف قاضی امارت شرعیہ بہار، مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند، مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، مولانا سید نظام الدین صاحب ناظم امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، مولانا محمد ولی صاحب رحمانی استاذ جامعہ رحمانی، مولانا نعمت اللہ صاحب صدر مفتی امارت شرعیہ اور مولوی جنید عالم ندوی مفتی امارت شرعیہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے مفتی مولانا احمد علی سعید بھی نظر ثانی کے کام میں شریک ہیں لیکن اس مرتبہ علالت کے سبب شریک نہیں ہو سکے۔

فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالمگیری) کے بعد یہ بڑا اہم کام ہے جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔

فرانس میں اسلام:

خلیج عرب میں واقع سلطنت عمان کے ہفت روزہ عربی اخبار "العقیدۃ" میں " الاسلام فی فرنسا " (فرانس میں اسلام) کے عنوان سے تین قسطوں پر مشتمل ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے جسے پندرہ روزہ "الرائد" لکھنؤ نے اپنے یکم اگست کے شمارے میں نقل کیا ہے، مضمون میں فرانس میں رہائش پذیر مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک فرانسیسی پروفیسر مسٹر "بوکیہ" کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہی فرانس تک اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی۔ خاص طور سے جنوبی فرانس میں مسلمانوں کی آمد و رفت رہی ہے سولھویں صدی میں جب اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور ان پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جانے لگے تو کثرت سے مسلمانوں نے ترکِ وطن کیا۔ ان میں سے ایک تعداد جنوبی فرانس میں پناہ گزیں ہوئی، البتہ فرانس کے دار السلطنت پیرس اور اس کے شمالی خطے میں مسلمانوں کی آمد و رفت اس وقت ہوئی ہے جب کہ فرانس نے

ہے، پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) کے موقع پر تقریباً چالیس ہزار الجزائری مسلمان فرانس آئے، مسلمانوں کے ساتھ جب فرانیسی عوام کا ربط بڑھا تو فطری طور سے ان کے اندر اسلام کے بارے میں تجسّس پیدا ہوا، بعض نے اسلام کا مطالعہ کرکے یا مسلمانوں کے رہن سہن سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ قبولِ اسلام کے واقعات پیش آتے رہے، تاریخ نے صرف ان لوگوں کا نام محفوظ رکھا ہے جو کسی نہ کسی نوعیت سے شہرت کے حامل تھے۔ عام لوگوں کے اسلام لانے کا نہ پہلے چرچا ہوتا تھا اور نہ اب ہوتا ہے ورنہ واقعہ ہے کہ ہزاروں ہی نہیں لاکھوں فرانیسی حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں۔ الجزائر میں موجود خانقاہوں اور ان کے بوریہ نشین صوفیوں نے تبلیغ اسلام میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک بڑی تعداد نے ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے، اس ضمن میں الجزائر میں واقع "مستی غانم" کی خانقاہ اور اس کے مشائخ کا بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے، فرانیسی نژاد جن ممتاز افراد نے اسلام قبول کیا ان میں ڈاکٹر فیلپ غورنیہ متوفی ۱۹۴۴ء، ایتیان دینہ جنھوں نے ۱۹۱۳ء میں اسلام قبول کیا۔ ادیبہ ایزابیل ایپر ہارڈ متوفی ۱۹۰۴ء، ماہر کیمیا رونیہ کونو، اور رجا جارودی کے نام خاصے مشہور ہیں۔

فرانس کے کثیر الاشاعت اخبار لیو مونڈ نے اپنے یکم مارچ ۱۹۸۹ء کے شمارے میں مختلف ممالک سے ترکِ وطن کرکے فرانس آنے والوں کے اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان میں سے چند مسلم ممالک سے آنے والوں کے اعداد و شمار یہ ہیں:

۱۔ الجزائر سے ۸ لاکھ
۲۔ تیونس سے ایک لاکھ نوے ہزار
۳۔ پاکستان سے ایک لاکھ ۵۰ ہزار
۴۔ مراکش سے چار لاکھ پچاس ہزار
۵۔ ترکی سے ایک لاکھ ۲۵ ہزار

ان کے علاوہ ہندوستان، بنگلہ دیش، ایران، موریتانیا، ساحل العاج، سنغال اور دوسرے ممالک سے ترک وطن کرکے فرانس میں رہائش اختیار کرنے والوں کی تعداد الگ ہے۔ ان کی مجموعی تعداد بھی لاکھوں میں ہوگی۔

العقیدہ نے لکھا ہے کہ اعداد و شمار کے اعتبار سے مسلمان فرانس میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ سب سے بڑی تعداد کیتھولک عیسائیوں کی ہے، اخبار نے ان کی تعداد نہیں لکھی ہے۔ ان کے بعد مسلمان ہیں جن کی تعداد دو ملین (بیس لاکھ) ہے۔ واضح رہے کہ بیس لاکھ تعداد ان مسلمانوں کی ہے جو باضابطہ فرانس کے شہری

رہائش پذیر ہیں ان کی تعداد بھی دس لاکھ سے متجاوز ہے، اس طرح اس وقت فرانس میں تقریباً تیس لاکھ مسلمان اقامت گزیں ہیں۔

تیسرے نمبر پر عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ ہے اس کی تعداد تقریباً ۸ لاکھ ہے۔

چوتھے نمبر پر یہودی ہیں جن کی تعداد ۵ء۷ لاکھ ہے، یہودی تعداد میں کم ضرور ہیں لیکن امریکہ اور برطانیہ کی طرح فرانس میں بھی کافی موثر ہیں۔ تعلیم، تجارت، مواصلات اور سیاست میں وہ پورے طور پر اثر انداز ہیں۔ مسلمان ان کے مقابلے میں کم از کم چار گنا زیادہ ہیں لیکن اثر و رسوخ میں سب سے پیچھے ہیں کیونکہ وہ انتشار اور گروہ بندیوں کا شکار ہیں، صرف رمضان اور عیدین کے موقع پر وحدت اسلامی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ رمضان مبارک کی برکت اور عیدین کی خوشی کی لہر گروہ بندیوں پر وقتی طور سے غالب آجاتی ہے۔

اخبار نے فرانس میں مقیم مسلمانوں کی دینی حالت کا جائزہ لے کر لکھا ہے کہ دس فیصدی مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، دینی فرائض مثلاً نماز کی ادائیگی کے لیے ہال حاصل کر لیے گئے ہیں یا چھوٹی چھوٹی مسجدیں تعمیر کرلی گئی ہیں۔ پورے فرانس میں ایسے ہال اور مسجدوں کی تعداد ساڑھے نو سے ایک ہزار تک ہے، ان میں صرف پانچ مسجدیں ایسی ہیں جہاں بہ یک وقت ایک ہزار افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ چھ مسجدیں ایسی ہیں جن میں تین سو تا چھ سو مسلمان ایک وقت میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو مسجدیں ہیں ان میں پندرہ بیس افراد کے نماز ادا کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ افراد کی زیادتی اور مسجدوں کی کمی کے سبب عیدین کے موقع پر عام شاہراہوں پر بھی صفیں بچھ جاتی ہیں جن کی وجہ سے وقتی طور سے ٹریفک کی دشواری پیش آتی ہے اور غیر مسلموں میں ناگواری کا احساس بڑھتا ہے، چنانچہ مسلمانوں کے واسطے قدامت پرستی اور بنیاد پرستی کی اصطلاح وضع ہونے لگتی ہے۔

فرانس میں رہائش پذیر مسلمانوں نے اپنی مختلف تنظیمیں بھی قائم کی ہیں جو کلچر اور ثقافت کے نام پر رجسٹرڈ ہوتی ہیں اور سرکاری طور پر اجازت یافتہ ہیں۔ 'العقیدۃ' کے مطابق ایسی تنظیموں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے، یہ تنظیمیں عام طور پر ملک کی بنیاد پر ہیں یا مسلک اور مکتب فکر کی بنیاد پر۔ چنانچہ جب ان ممالک کے درمیان چپقلش شروع ہوتی ہے تو اس کے اثرات اداروں اور تنظیموں پر بھی پڑتے ہیں، اور ان کے باہمی روابط کشیدہ ہو جاتے ہیں۔

العقیدہ کے مطابق ایک نمبر پر رابطہ عالم اسلامی ہے اور دوسرے نمبر پر تبلیغی جماعت ہے جو وہاں ایمان وعمل والی جماعت کے نام سے مشہور ہے، دیگر ممتاز اداروں میں پیرس کی جامع مسجد اور اس سے متعلق اسلامک سنٹر ہے، اسی سے وابستہ قبول اسلام کا دفتر ہے۔ سرکاری طور سے اس کی اجازت ہے کہ جو اسلام قبول کرنا چاہے اسے کلمۂ شہادت پڑھا کر مسلمان بنا لیا جائے اور اسے قبول اسلام کا تصدیق نامہ دے دیا جائے۔

فرانس سے فرانسیسی اور دیگر یورپین زبانوں میں متعدد ماہوار اور ہفتہ وار اخبارات و رسائل نکلتے ہیں، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں اسلامی موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں، ایک ریڈیو اسٹیشن سے مسلمانوں کے لیے دینی پروگرام نشر ہوتے ہیں، فرانسیسی ٹیلی ویژن یکشنبہ کو ۹ بجے صبح سے اپنے دوسرے چینل سے دینی پروگرام نشر کرتا ہے جو چار گھنٹے تک جاری رہتا ہے۔

فرانس میں مسلمانوں کا ایک اور طبقہ ہے جو الجزائر نژاد ہے اور فرانس میں "حرکی" کے نام سے موسوم ہے۔ حرکی مسلمان ان لوگوں کے لیے عبرت کا سامان بن کر رہ گئے ہیں جو اپنی قوم کے ساتھ غدّاری کرتے ہیں، جنگ آزادی میں یہ لوگ فرانسیسی سامراج کے پشت پناہ بنے رہے، الجزائر کے مسلم عوام کے خلاف برسرپیکار رہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب الجزائر آزاد ہوا تو اس کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ ان لوگوں نے فرانس میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا کہ وہاں ان کی قدر و منزلت ہو گی، ۱۹۶۲ء میں ان کی تعداد ساٹھ ہزار اور ان کے اہلِ خاندان کے ساتھ ڈھائی لاکھ تھی، ۲۷ برس کے بعد اب ان کی تعداد سات لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ حرکی مسلمان بالکل اچھوت بن کر رہ گئے ہیں، نہ فرانس میں عزت کی زندگی نصیب ہے اور نہ الجزائر واپس جانے کی گنجائش۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" اور "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کی عبرتناک مثال۔

تعلیمی سیمینار:

حج کے مبارک موقع پر دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان اپنے قبلۂ دیدہ و دل مکہ مکرمہ میں حاضری کا شرف حاصل کرتے ہیں، ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے وسائل و ذرائع سے آتے ہیں، ایسے افراد بھی جو اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایسے معزز حضرات بھی جو [illegible]

بھی ہوتے ہیں تجارت پیشہ بھی، ناخواندہ بھی ہوتے ہیں اور تعلیم یافتہ بھی، ماہرینِ تعلیم بھی ہوتے ہیں، اور اچھے انتظام کار بھی۔ غرض اس مبارک موقع پر زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوجاتی ہے۔ ان میں اہلِ دانش اور صاحبانِ فضل وکمال معتد بہ تعداد میں ہوتے ہیں، ایسے افراد کے علم وفضل اور تجربات سے فائدہ نہ اٹھایا جاتا تو ایک طرح سے ان کی ناقدری بھی ہوتی، اور ایک سُنہری موقع کو ضائع کرنا بھی۔ مسرّت واطمینان کی بات ہے کہ رابطہ عالم اسلامی کے ذمہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے اس گراں قدر موقع سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشی ہے۔ چنانچہ ہر سال وہ کسی نہ کسی اہم موضوع پر سیمینار منعقد کرتے ہیں اور علمارِ کرام اور دانشورانِ دین وملت کے افکار وخیالات اور ان کے تجربات سے استفادہ کی کوشش کرتے ہیں۔

سالِ رواں سیمینار کا موضوع "اعداد المعلم المسلم" [مسلمان ذہن ودماغ کے حامل اساتذہ کی تیاری] تھا، یہ سہ روزہ سیمینار یکم تا ۳ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ مطابق ۴، ۵، ۶ جولائی ۱۹۸۹ء کو رابطہ عالم اسلامی کی مرکزی عمارت واقع ام الجود مکہ مکرمہ کے لیکچر ہال میں منعقد ہوا، جس میں مکہ مکرمہ کے گورنر شہزادہ سعود بن عبدالمحسن نے خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ یہی نہیں بلکہ تعلیم وتربیت کے موضوع پر ایک موثر اور پُرمغز تقریر کی، سعودی عرب کے دیگر جن اہم لوگوں نے شرکت کی ان میں شیخ عبدالعزیز بن باز کی شخصیت خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

سیمینار میں موضوع سے متعلق تقریریں بھی ہوئیں اور وقیع مقالے بھی پیش ہوئے، شرکاءِ بزم نے متعدد تجویزیں بھی منظور کیں، ان میں سے چند پر بھی عمل ہوجائے تو سمجھئے کہ سیمینار کامیاب ہوگیا اور اُن پر آنے والے مصارف اکارت نہیں گئے۔ اختصار کی وجہ سے ان میں سے چند تجویزوں کا ترجمہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔

۱۔ اساتذہ کی تعلیم وتربیت کے لیے جو نصاب تیار کیا جائے اسے بلاوجہ بوجھل اور طویل نہ بنایا جائے، کیفیت میں کمی کیے بغیر درجات میں تخفیف سے کام لیا جائے۔

۲۔ معلم کی تعلیم وتربیت کے ضمن میں اختصاص پر نظر رکھی جائے اور غیر ضروری اور تقلیدی مواد کو خارج کردیا جائے۔

اگر کل نہیں تو کم از کم ایک معتد بہ حصہ ضرور یاد ہو اور انھیں تلاوت اور تجوید کے ضروری قواعد سے صرف آگاہی نہ ہو بلکہ مشق بھی ہو۔

۴۔ لکھنے میں صحیح املا اور بولنے میں صحیح تلفظ کے اہتمام پر زور دیا جائے۔

۵۔ ابتدا ہی سے استاد کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ دورانِ تدریس صحیح اور فصیح زبان استعمال کرے۔

۶۔ عمل، نشست و برخواست اور عام زندگی میں اسلامی ثقافت کو فروغ دینے کی سعی کی جائے۔

۷۔ جہاں مسلمان بحیثیت اقلیت رہائش پذیر ہیں وہاں نمونہ کے تربیتی ادارے قائم کیے جائیں تاکہ وہاں کے حالات کے لحاظ سے صاف ستھرے ذہن کے حامل مدرسین کی تربیت ہو سکے۔

۸۔ جن افراد کے اندر جوہر قابل نظر آئے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور انھیں تعلیمی میدان میں آنے کی ترغیب دی جائے۔

۹۔ جن گھرانوں میں تعلیمی میدان سے پہلے سے ربط و تعلق قائم ہو ان گھرانوں کے نوجوانوں کی خاص طور سے حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ تعلیمی قافلہ سے مربوط رہیں، اس سے جدا نہ ہوں۔

۱۰۔ مسلم اقلیتی ممالک میں شارٹ کورس تربیتی پروگرام رکھے جائیں بالخصوص ان علاقوں میں جہاں ٹیچر ٹریننگ اسکول اور کالج کا فقدان ہو۔

۱۱۔ تعلیم و تربیت کے اولین مرحلے کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر ابتدائی مرحلے کے اساتذہ کی تربیت پر بطور خاص توجہ مبذول کی جائے۔

۱۲۔ ایک تجویز میں اسکول، کالج اور مدارس کے ذمہ داروں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ کسی بھی مدرس کو کام سپرد کرتے وقت خیال رکھا جائے کہ اس کی صلاحیت اور طاقت سے زیادہ اس پر بار نہ ڈالا جائے [illegible] اس پر بھی نظر رکھی جائے کہ ایک استاد کے پاس زیر تعلیم طلبہ کی تعداد زیادہ نہ ہو بلکہ اتنی ہی تعداد اس کے سپرد کی جائے جن پر بہ سہولت وہ توجہ دے سکے۔